جنوری [illegible]

رفتند ولے نہ از دلِ ما

یادگارِ جشنِ صدسالہ

منشی دیانرائن نگم

مدیر

ماہنامہ رسالہ "زمانہ"

و

ہفتہ وار اردو "آزاد"

کانپور

مرتبہ

سری نرائن نگم

قیمت :- ۵۰ روپے - اعلیٰ ایڈیشن سو روپے

فہرست مضامین

تصاویر: (۱) منشی دیا نرائن نگم (۲) رفیقۂ حیات منشی دیا نرائن نگم (۳) مسٹر سری نرائن نگم (۴) فرزندان منشی دیا نرائن نگم (۵) اراکین دفتر رسالہ "زمانہ"

منشی دیا نرائن نگم، اپنے معاصرین کی نگاہ میں

منشی دیا نرائن نگم، اپنے مضامین کے آئینہ میں

زمانہ: اپنے مضامین کے آئینہ میں

منشی دیا نرائن نگم، موجودہ اہل قلم کی نگاہ میں

سری نرائن نگم ایڈیٹر و برج نرائن نگم پرنٹر و پبلشر نے لیتھو کے صفحات نامی پریس نخاس لکھنؤ و سرورق سرل پرنٹنگ پریس لکھنؤ میں چھپوا کر نمبر ۱ جگت روڈ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱ سے شائع کیا



Munshi Daya Narain Nigam
March 22, 188[illegible] - November 2, 1942

پیش لفظ

یہ نثر و نظم کا گلدستہ منشی دیا نرائن نگم جنھوں نے انتالیس ۳۹ سال کے طویل عرصہ تک آبیاری کرکے اردو کے بے مثال رسالہ "زمانہ" کو تر و تازہ و شاداب رکھا، کی تاریخ ولادت کے صد سالہ جشن پر آپ کے پیش نظر ہے۔ اس مجموعہ میں نہ فقط اردو کے موجودہ ادیبوں و نقادوں کے مضامین ہیں بلکہ اُن مضامین کا بھی انتخاب ہے جو منشی دیا نرائن نگم کے افکار کا نتیجہ ہیں اور جو وقتاً فوقتاً "زمانہ" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین پہلی مرتبہ یکجائی شکل میں شائع کئے جا رہے ہیں علاوہ اس کے ان صاحب قلم و شعرائے کے بھی نمونے شامل ہیں جنھوں نے اپنے افکار سے "زمانہ" کے صفحات کو زینت بخشی اور جن کی مشترکہ و متفقہ کوششوں نے زمانہ کو اردو کا بہترین رسالہ و ملک کے چوٹی کے ادبی رسالوں میں شمار کرا دیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے کئی طویل مضامین جو ادبی و لٹریری حیثیت سے کسی طرح کسی سے کم نہیں ہیں نظر انداز کرنا پڑے۔ اسی طرح ایک کثیر تعداد لکھنے والوں کے مضامین جو کسی رسالے کے لئے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں شامل نہیں کئے جا سکے۔ چند نمونے جو آپ کے پیش نظر ہیں ان سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں کتنے جواہر پارے چھپے ہوئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اردو کا کوئی بھی شاعر و نثر نگار ایسا نہیں تھا جس کے مضامین و کلام نے "زمانہ" کے صفحات کو زینت نہ بخشی ہو۔

اس جشن کے منانے کا سہرا میرے چھوٹے بھائی برج نرائن جی کے سر ہے۔ یہ خیال اوّل ان کے دل میں پیدا ہوا اور اپنے ارادہ کی تکمیل میں انھوں نے نہ فقط ایک سال سے زیادہ اَن تھک کوشش کی بلکہ اپنا سارا وقت اس کے نذر کر دیا۔ اور اس کا مالی بار بھی برداشت کیا۔

آخر میں میں جناب حشمت سہیل صاحب کا جو نہ فقط اردو کے ادیب اور شاعر ہیں بلکہ میرے عزیز دوست و کرم فرما بھی ہیں، ممنون ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر اس خیال کو جو ایک خواب تھا حقیقت بنا دیا۔

سری نرائن نگم

پیغامات

شریمتی اندرا گاندھی صاحبہ وزیراعظم ہند

(ترجمہ)

مجھے خوشی ہے کہ جشن پیدائش یوم صد سالہ منشی دیا نرائن نگم مارچ ۱۹۸۲ء میں منایا جا رہا ہے۔

منشی جی نے اردو صحافت کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

میں ان تقریبات کی کامیابی کے لئے دعا کرتی ہوں۔

۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء

جناب محمد ہدایت اللہ صاحب نائب صدر ہند

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ منشی دیا نرائن نگم جو اردو ادب کی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھے، کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگار نمبر شائع کر رہے ہیں۔

میں ان کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔

۱۸ر ستمبر ۱۹۸۱ء

شریمتی شیلا کول صاحبہ وزیر تعلیم و سماجی بہبود نئی دہلی

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم صد سالہ تقریبات کمیٹی لکھنؤ ان کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگار نمبر اجرا کر رہی ہے۔

ہمارے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں منشی دیا نرائن نگم بحیثیت ایک عظیم جرنلسٹ سوشل ریفارمر اور معروف معلم کے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ ان کو اردو و فارسی پر عبور تھا اور ان کا طرزِ بیان و تحریر اپنا خصوصی تھا۔ ان کے ماہانہ رسالہ "زمانہ" کی نثر نگاری علمی و ادبی حلقہ میں مستند مانی جاتی تھی۔

منشی دیا نرائن نگم ذہنی کشمکش کے زمانے میں رہے۔ سر تیج بہادر سپرو، سر عبد القادر اور سر محمد اقبال کی صحبت نے ان کے سیاسی رجحانات کو سنجیدگی کی طرف مائل کیا حالانکہ منشی جی میں حب الوطنی کی کمی نہ تھی۔ انھوں نے ہمیشہ ایک متوازن نظریہ قائم رکھا بحیثیت سوشل ریفارمر ان کے خیالات بہت بلند تھے۔ وہ ملی جلی ذات ولی جلی قومی شادی۔ شادیٔ بیوگان۔ تعلیم نسواں۔ یکجائی تعلیم کے حامی اور رسم پردہ کے خلاف تھے۔

منشی دیا نرائن نگم انیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور کی ہستی تھے۔ ان کی علمی و ذہنی عظمت نے ملک کے محبتی جذبہ کے فروغ پر زبردست اثر ڈالا۔ مجھے امید ہے کہ ہم اس جشن کی تنظیم کرنے میں مادرِ ہند کے ایک عظیم سپوت کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کا دھیان منشی جی کی اُن اعلیٰ قدروں کی طرف جن کے لئے منشی دیا نرائن نگم ایسی برگزیدہ ہستیوں نے اپنی زندگی وقف کی، دلائیں گی۔

میں اس جشن کی کامیابی کی تمنا کرتی ہوں۔

۱۲ رستمبر ۱۹۸۱ء

جناب چندریشور پرشاد نرائن سنگھ صاحب

راجیال اتر پردیش

(ترجمہ)

منشی دیا نرائن نگم جیسے معروف ادیب اور مدیر رسالہ "زمانہ" کانپور جیسی عظیم شخصیت کی صد سالہ تقریبات اور اس موقعہ پر ایک یادگار نمبر نکالنے کی تجویز میں اپنے کو شریک کر کے مسرت محسوس کرتا ہوں۔

منشی دیا نرائن نگم کی شخصیت ہمہ گیر تھی وہ نہ صرف ایک مشہور اردو ادیب و نڈر صحافی تھے جن کے قلم میں انتہائی اثر و قوت تھی بلکہ ایک بڑے سوشل ریفارمر اور متعدد قومی تحریکوں بہ اشمولیت قومی یکجہتی و فرقہ وارانہ مساوات کے علم بردار بھی تھے۔ وہ نہ ہارنے والی ہمت رکھتے تھے اور ارادہ کے پکے تھے جنھوں نے اپنی پالیسی یا طرز تحریر بدلنے کے بجائے تنگدستی کو ترجیح دی۔ وہ ہندوستانی اکیڈمی (جو ہندی اور اردو کے طرز تحریر کی ترقی اور ہندی اور اردو انشا پردازوں کی بہبودی کے لیے قائم کی گئی تھی) کے بانیوں میں سے تھے۔

منشی جی کی زندگی اور ان کے کارنامے ادیبوں، صحافیوں اور سماجی فلاح و بہبود کے کارکنوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گے۔

اس قابل تحسین کارنامے کی کامیابی کے لیے میں دست بدعا ہوں

۹ راکتوبر ۱۹۸۱ء

جناب ٹی انجیا صاحب وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم کی صد سالہ تقریب تمام ملک میں منائی جا رہی ہے۔ اور اس موقع پر ایک یادگار نمبر بھی جاری کیا جا رہا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم نے اس صدی کے اوائل میں اردو ادب کے لیے جو بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں ان کے لیے وہ عرصہ دراز تک یاد کیے جائیں گے۔ وہ ایک بڑے ادیب اور اردو صحافت کے علم بردار تھے۔

میں اس ادبی عظیم ہستی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تقریبات کے پروگرام کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

۴ نومبر ۱۹۸۱ء

جناب رام سنگھ صاحب وزیر کارگار و لیبر پولیٹیکل پنشن اترپردیش

(ترجمہ)

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم کے جشن صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ایک یادگار نمبر جاری کیا جا رہا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم ایک بڑے ادیب سوشل ریفارمر اور مشہور صحافی تھے ان کی خدمات اردو ادب و قومی یک جہتی کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔

میں اس یادگار نمبر کی اشاعت کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۱ء

جناب عمار رضوی صاحب وزیر تعمیرات عامہ و قومی یکجہتی اتر پردیش

(ترجمہ از ہندی)

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم کی جنم شتابدی کے موقعہ پر اعلیٰ پیمانہ کا ایک خصوصی یادگار نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔

اردو کے ماہانہ رسالہ زمانہ کے تیجسوی ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم نایاب خوبیوں کے سنگم تھے۔ اردو ادب کے بڑے ودوان اور بیتر کار ہونے کے ساتھ منشی دیا نرائن نگم ایک اعلیٰ پیمانہ کے سماج سدھارک اور آزادی کے ایک مضبوط علمبردار تھے۔ فرقہ وارانہ امن و قومی یکجہتی کے لیے انھوں نے خصوصی خدمات انجام دی ہیں۔

اردو کے مشہور ماہانہ رسالہ "زمانہ" کے ایڈیٹری کے فرائض منشی جی نے ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک انجام دیئے اور اپنے رسالہ کے ذریعہ مختلف مشہور و معروف ہندو اور مسلمان ادبی ہستیوں کو خدمت کا موقعہ دیا۔ ان کے رسالہ میں اکبر الٰہ آبادی، پریم چند، سوامی رام تیرتھ، لالہ لاجپت رائے، مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، اقبال، شبلی، سرور، حالی، بال مکند گپت، اقبال نرائن گرٹو، ہشر، چکبست، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی جیسے انشا پرداز ہستیوں کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ اقبال کا مشہور قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے پہلے "ہمارا دیس" کے عنوان سے رسالہ "زمانہ" کے ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارہ میں چھپا تھا۔

میں منشی جی کی جنم شتابدی منانے کا سواگت کرتا ہوں۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۱ء

جناب چودھری نونہال سنگھ صاحب وزیر تعلیمات و تمدن اتر پردیش

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگار شمارہ اجرا کیا جا رہا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم نے جس لگن و جذبے سے کام کیا ہے یقیناً وہ آئندہ نسلوں کے لئے سوسائٹی میں ایک اعلیٰ معیار قائم کرنے میں مشعلِ ہدایت ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ یادگار شمارہ منشی جی کی اعلیٰ قدروں کو کامیابی سے پھیلائے گا۔

میں اس یادگار شمارہ کی کامیابی کا خواہاں ہوں

۲۴ دسمبر ۱۹۸۱ء

اس سے قبل زمانہ کی سلور جوبلی کے موقعہ پر جو پیغامات موصول ہوئے تھے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

سر ربیندر ناتھ ٹیگور

زمانہ کے جوبلی کے موقعہ پر میں نہایت مسرت کے ساتھ ایڈیٹر "زمانہ" کی خدمت میں مبارکباد کا پیام دے رہا ہوں۔ اس قابلِ قدر ادبی رسالہ کے ذریعہ جو کارِ خیر ہو رہا ہے اس کی کامیابی کے لیے میں تہِ دل سے دست بدعا ہوں۔

لالہ لاجپت رائے: میں ایک مدت تک "زمانہ" کو شوق سے پڑھتا رہا ہوں بلکہ گاہ گاہ اس کے لئے مضامین بھی لکھے ہیں۔ میں نے ہمیشہ "زمانہ" کی تحریروں سے حظ اٹھایا ہے اور اس کے مذاق کو پسند کیا ہے۔ اب بھی ملک کو سنجیدہ ادبیات کی بہت ضرورت ہے جو آپ کے ماہوار رسالہ سے بدرجۂ احسن پوری ہو رہی ہے۔

مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز

مجھے یہ معلوم کر کے صد درجہ خوشی ہوتی ہے کہ ادب اردو کی بہترین خدمت انجام دینے کے بعد بالآخر رسالہ "زمانہ" اپنا جوبلی نمبر شائع کر رہا ہے۔ میں اس کے مالک، مدیر اور تمام کارکنوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ رسالہ "زمانہ" آئندہ بھی اپنی مفید ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

اس سے قبل دسمبر ۱۹۲۵ء میں "زمانہ" کے قومی نمبر کے اجراء پر موصول شدہ پیام سے دو درج ذیل ہیں

شریمتی سروجنی نائیڈو صاحبہ

مجھے امید ہے کہ "زمانہ" ان تمام اخلاقی معیاروں کا گنجینہ ہوگا جو ہندوستان کی ملکی و تمدنی عروج کے لئے ضروری ہیں۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے شعر ذیل خاص طور پر بھیجا تھا

نہ کنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم
بسراغ صبح فردا روش زمانہ دارم

منشی دیانرائن نگم

اپنے معاصرین کی نگاہ میں

زمانہ اور ترقی اردو

سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

رسالہ زمانہ کا جشن جوبلی، ادب اردو کی ترقی کا جشن ہے۔ پچیس سال ہوئے یہ رسالہ کانپور سے شائع ہوا۔ اور آج اُس کے پچیس سال کے کارناموں کی خوشی منائی جا رہی ہے۔ اس عرصے میں کئی رسالے نکلے اور کئی بند ہوئے طرح طرح کے مصائب اہل قلم پر آئے۔ بہت سے صحائف مالی مشکلات سے دب کر رہ گئے۔ مگر آفریں ہے منشی دیانرائن صاحب نگم کی ہمتِ مردانہ پر کہ اُن کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا۔ اور انھوں نے تنہا اپنی کوشش سے ایک صدی کے چوتھے حصے تک نہ صرف اپنے لگائے ہوئے پودے کو زندہ رکھا بلکہ اس کی ایسی جانفشانی سے آبیاری کی کہ اس کے سب خواہوں نے اسے بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھا۔ یہ رسالہ بہت سی اور خوبیوں کے علاوہ یہ امتیاز خاص رکھتا ہے کہ جس انداز سے نکلا تھا اسی انداز پر چل رہا ہے، اور اس کی صورت اور سیرت دونوں اپنی وضع اصلی پر قائم ہیں۔ کئی باتوں میں ترقی ہوئی، بہ حیثیت مجموعی کسی پہلو سے تنزل نہیں ہوا۔ مغربی ممالک میں تو کئی رسالے اور اخبار ایسے ہیں جو ایک صدی سے زیادہ کی قدامت پر ناز کر سکتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں ابھی یہ بات بہت کم اخباروں یا رسالوں کو نصیب ہے کہ عرصہ دراز تک چلیں اور اپنا خاص انداز نباہ سکیں۔ اس لیے زمانہ ہر پہلو سے مبارکباد کا مستحق ہے، اور میں ادب اردو کے خادم کی حیثیت سے زمانہ کی خدمات کا اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اردو نثر کا آغاز صحیح معنوں میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے ہے۔ گویا جب زمانہ نے جنم لیا تو ادب اردو کے حصہ نثر کی عمر پچاس برس کی تھی۔ گو اُس وقت اردو نثر کی اکثر اعلیٰ تصانیف وجود میں آ چکی تھیں اور یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ اردو کی ادبیات کا ذخیرہ ہندوستان کی دیگر مروجہ زبانوں کے مقابلے میں کسی سے کم نہیں مگر اردو کی حالت کچھ متزلزل سی تھی۔ وہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ اور اُن کے ملاپ کی بہترین یادگار تھی، محض اس لیے معتوب ہو رہی تھی کہ اس کے حروف فارسی کے حروف ہیں، یا مسلمان اس سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ لکھے پڑھے ہندو جو مدت سے اس زبان کو شمالی ہند کی مشترکہ مادری زبان سمجھتے تھے اور خوشی سے اس کی نظم و نثر پر طبع

آزمائی کرتے تھے اس سے بیزار ہو رہے تھے۔ ہندی بھاشا اور خاص کر ہندی حروف کے رواج کی تحریک زوروں سے جاری تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اہل قلم جو اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے اور جو اردو کے ذریعے سے اپنے خیالات بہت خوبی سے ظاہر کر سکتے تھے۔ اس زبان اور اس کے ادب سے کام لیتے ہوئے جھجکتے تھے۔ اس زمانہ میں مجھے یہ خیال آیا کہ اگر ملک میں ایسے ادبی رسالے ہوں جن میں ہندو مسلمان دونوں مضامین لکھیں، اور جھگڑے کی چیزوں سے بچ کر اپنی زبان کی مشترکہ ادبیات کی خدمت کریں تو ان سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے رسالہ مخزن لاہور سے جاری کیا۔ اور یاران نکتہ داں کو صلائے عام دی کہ اس کے لیے مضامین لکھیں۔ جن مشہور انشا پردازوں کے نام ہندو اصحاب میں سے مجھے معلوم تھے ان سے خاص طور پر درخواست کی کہ وہ میرا ہاتھ بٹائیں۔ اور میں ان احباب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس اہم ملکی اور قومی مقصد کی تکمیل میں مجھے امید سے بڑھ کر مدد دی۔ مگر جو چند گوہر نایاب اس بے غرضانہ سعی میں مجھے حاصل ہوئے ان میں "زمانہ" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اور میں اگر یہ کہوں کہ وہ اس سعی کا پہلا ثمر تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اب اس کی پختگی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بجا طور پر دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف پہلا ثمر تھا بلکہ بہترین ثمر ثابت ہوا۔ مخزن کا ایک ورق جس پر چند نوجوان اور ہونہار طلبہ کی تصویریں یکجا چھپی تھیں جو اس وقت بی۔ اے کی جماعت میں اپنے اپنے کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت بھی میری چشم تخیل کے سامنے ہے۔ اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان طلبہ میں ادب اردو کا وہ سچا خادم اور ملک کا سچا ہمدرد بھی تھا جس کا نام رسالہ زمانہ کے ورق اول پر پچیس سال سے لکھا جا رہا ہے۔

دیا نرائن صاحب نگم نے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت یا وکالت یا کسی نفع بخش تجارت کی طرف رخ نہیں کیا، بلکہ صحافت اور اردو صحافت کی تکلیف دہ زندگی کو اپنے لیے پسند کیا اور آج پچیس سال کی محنت کے بعد وہ مالی اعتبار سے اس سے زیادہ طاقت نہیں رکھتے کہ نہایت سادہ طرز کی درمیانہ زندگی بسر کر سکیں۔ باوجود اس کے کہ اس اثنا میں انھوں نے روزانہ اخبار نکالا اور کتابیں بھی شائع کیں مگر انھوں نے وہ کام کیا جو کئی بڑے بڑے مدعیان حب وطن نہیں کر سکے۔ آج کل ایثار اور قربانی کے لفظ ہر ایک کی زبان پر ہیں اور بہت لوگ بہ بانگ بلند ایثار کے دعوے کرتے ہیں مگر چند روز کا ایثار چند روز کی قربانی اس کے ساتھ واہ واہ اور ہائے ہو ملک کو راہ ترقی میں بہت دور نہیں پہونچا سکتی اگر ملک بڑھے گا اور ترقی کرے گا تو ایسے دھن کے پکے شخصوں کی بدولت، جو ایک شغل یا فن کو مستقل ... کر کے اس کو اس طرح انجام دیں گے جیسے دیا نرائن صاحب نگم نے اردو

کی خدمت کو نباہا ہے

نثار دارانِ محبت تو سینکڑوں ہیں مگر جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

وہ فنا فی الادب کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آؤ ذرا دیکھیں کہ زمانہ کی اس محنت سے کیا کیا نتیجے نکلے۔ کسی مہینے کا پرچہ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مضمون نگاروں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ یوں تو جا بجا ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا جاتا ہے مگر زبانی باتوں کے علاوہ عملی کوشش اس اتحاد کے لیے کہاں ہو رہی ہے۔ ادبیات کا چبوترہ ہی وہ چبوترہ ہے جہاں ہندو مسلمان خلوص سے اور بلا تصنع یکجا کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور نگم صاحب کی کوششوں سے اوراق زمانہ پچیس سال سے کم از کم سینکڑوں اہلِ قلم کے اس ملاپ کی شہادت دے رہے ہیں۔ اس تفریق اور ضرب اور تقسیم کے زمانے میں جمع کا حساب صرف ادبی معاملوں ہی میں ملتا ہے، اور اس لیے یہ بہت قابلِ قدر ہے۔ اس رسالہ کے خریداروں میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ گو میرے نزدیک اغلب ہے کہ ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہوگی۔ خیر زیادہ ہوں یا برابر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پچیس سال سے اس رسالے کی بدولت اور بعض اور رسالوں کی بدولت جو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے چلتے رہے ہزاروں بلکہ لاکھوں ہندوؤں نے اردو مضامین نظم و نثر کا لطف اٹھایا اور اُن کی وہ مغائرت جو نہ سوچنے اور نہ سمجھنے کے سبب سے انھیں اردو جیسی لطیف زبان کی دلچسپیوں بلکہ اپنے ملک کے بہترین ورثہ سے محروم کر رہی تھی ہمدردی سے بدل گئی۔ یہ ایک ایسا بڑا کام ہے جس پر زمانہ جس قدر ناز کرے کم ہے اور اس سے نہ صرف زبان اردو ادب کی خدمت ہوئی بلکہ ملک کی عام بہتری کے لیے بھی یہ ایک معقول اور عملی خدمت ہے۔

اس رسالے کی کوششوں کا جو خالص ادبی حصہ ہے اس کا احسان بھی زبان اردو پر مستقل طور پر رہے گا۔ جن ادیبوں سے ہم رسالہ زمانہ کی بدولت روشناس ہوئے ان کی تعداد بہت ہے۔ مگر ایک نامور ادیب جن کا ذکر خاص طور پر کرنا واجب ہے پنڈت برج نرائن چکبست آنجہانی ہیں۔ افسوس کہ وہ ہمیں بے وقت داغِ مفارقت دے گئے۔ مگر ان کے گراں بہا تنقیدی مضامین، ان کی دلکش نظمیں، ان کی شگفتہ تحریر نثر ہمارے پاس ہیں اور مدتوں ادب اردو کا مایۂ ناز رہیں گی۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے اور جس رسالے سے انھیں ایسی گہری دلچسپی تھی، اس کی جوبلی دیکھتے۔

زمانہ کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ زمانہ میں سیاسیات کا پہلو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ اور اس کے مضمون نگار سیاسی معاملات پر بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے جب تک رسالہ مخزن میرے

ہاتھ میں تھا کئی دفعہ نگم صاحب سے میری خط وکتابت اس سیاسی حصے کے متعلق ہوتی رہی۔ نگم صاحب چاہتے تھے کہ مخزن میں بھی کچھ حصہ سیاسیات کے لیے رکھا جائے، اور میں کہتا تھا کہ زمانہ کو بھی سیاسیات سے الگ رکھیں تو بہتر ہے۔ میرا خیال یہ تھا کہ کوئی چیز ایسی نہ ہو جو ادبی اتحاد میں خلل انداز ہو۔ ان کا منشا یہ تھا کہ ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ سیاسی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ میں اب تک اپنی اس رسم احتیاط کا قائل ہوں مگر اس کے ساتھ "زمانہ" کو اس داد کا مستحق سمجھتا ہوں کہ اس کی تحریریں عموماً سنجیدہ اور متین رہی ہیں اور ان کا لہجہ ایسا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی ناگوار نہ ہو جو لکھنے والے کے ہم خیال نہ ہوں اور یہی رنگ ایک غیر جانب دار اور ادبی رسالے کے لیے موزوں ہے۔ گویا "زمانہ" نے سیاسیات میں سبق دینے کی کوشش کی ہے اور جانبدارانہ جنگ سے علیحدہ رہا ہے۔

زمانہ کی گزشتہ جلدوں کے مجموعہ میں اردو کے دور جدید کی تازہ ترین ترقی کے نمونے نظم و نثر میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ اگر ان کو اکٹھا کیا جائے تو ادب اردو کا ایک لاجواب گلدستہ تیار ہو جائے، ورمیں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ اڈیٹر صاحب "زمانہ" ایک انتخاب زمانہ شائع کریں تاکہ اردو نظم و نثر کے وہ لازوال ٹکڑے جو وقتاً فوقتاً زیب اوراق ہوتے رہے ہیں۔ محفوظ ہو جائیں اور اس جشن جوبلی کی موزوں یادگار ہوں۔

* * *

مولانا حسرت موہانی

اقتباس از یادگار نمبر ۱۹۴۳ء

پیام محبت

منشی دیا نرائن نگم سیاسی۔ سماجی و ادبی غرضکہ ہر حیثیت سے کم وبیش فقیر کے ہم خیال۔ تھے اور ہم خیالی کی ابتدا آج سے چالیس سال قبل ہو چکی تھی۔ وہ اس طرح کہ حسن اتفاق سے ہم دونوں کی سیاسی و ادبی زندگی کا آغاز ایک ہی زمانے میں یعنی ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء سے ہوا راقم نے علی گڑھ کالج سے اور منشی جی نے کانپور سے بی۔ اے کی سند قریب قریب ایک ہی زمانہ میں حاصل کی اور گریجویٹ ہونے کے بعد نیشنل کانگریس کی ہمنوائی اختیار کی اگرچہ بعد میں فقیر کا سیاسی رجحان اعتدال پسند جماعت سے گذر کر کمانیہ تلک اور اس کے بعد سوشلسٹ بلکہ کمیونسٹ جماعت کی جانب ہو گیا اور منشی جی بدستور اعتدال پسند رہے اور مشترک معاملات میں ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون بنکر سرگرم عمل رہے حقیر کے قید وبند کے زمانہ میں بیگم حسرت کی زبانی مجھ کو رہائی کے بعد معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ منشی جی نے میری غیبت میں ان سا تھ برادرانہ خلوص و ہمدردی کا برتاؤ قائم رکھا۔

اردو ہندی اور رسالہ زمانہ

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

اردو اور ہندی زبانیں دونوں ایک ہی ہیں ان میں وہی لوگ فرق سمجھتے ہیں جو ان دونوں کی باہمی مناسبت سے واقف نہیں ہیں یا ان دونوں کے میل جول پر غور نہیں کرتے۔

اردو ہندی کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لوگ اس پر غور کر چکے ہیں کہ اردو اور ہندی بلحاظ بول چال کے دونو ایک ہی ہیں ان میں جدائی بہت ہی تھوڑی ہے البتہ رسم خط کا فرق ایک خاص فرق ہے مگر اس کے لیے ہندو مسلمان کا آپس میں بگاڑ ہونا بہت نامناسب ہے۔ مسلمانوں کو خیال کرنا چاہیئے کہ ہندی رسم خط ہندوستان کا ہے جو ہمارے ہندو پڑوسیوں اور ملکی بھائیوں کا رسم الخط ہے اس واسطے ہمیں بھی اس رسم الخط کی ترقی اور حفاظت میں حصہ لینا چاہیئے۔ ہندو بھائیوں کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اردو زبان سنسکرت اور برج بھاشا سے نکلی ہے لہٰذا اردو کی ترقی و حفاظت بھی ایک لحاظ سے ہندی برج بھاشا ہی کی ترقی و حفاظت ہے۔ رہا اردو رسم الخط سو یہ بھی ہندوں کو اجنبی اور غیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اردو کا رسم الخط اگرچہ عربی و فارسی سے نکلا ہے تاہم ایشیائی رسم الخط ہونے کے اعتبار سے ہندوستان کے ہندوں کا حریف نہیں ہو سکتا۔

کانپور کا رسالہ زمانہ ان ہندو رسالوں میں ہے جنھوں نے سالہا سال کی عملی محنت سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اردو زبان محض مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندو قوم بھی اس کو اپنے ملک کی زبان کی طرح عزیز رکھتی ہے۔

مجھے ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایسا کوئی بھی رسالہ معلوم نہیں ہے جس کے ہر نمبر میں مشترکہ طور پر ہندو مسلمان مضمون نگاروں نے سالہا سال لگاتار مضمون لکھے ہوں اور رسالہ زمانہ کی یہ خصوصیت اردو زبان کی تاریخ میں سب سے اونچے درجہ پر لکھنی چاہیئے۔

جب نان کوآپریشن کے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دل اور ایک زبان ہو کر کام کر رہے تھے اس سے سالہا سال پیشتر کانپور کا رسالہ زمانہ ہندو مسلمانوں کا عملی اتحاد اردو لٹریچر کی اشاعت سے ثابت کر رہا تھا۔ اور جب ترک موالات کی تحریک کمزور ہوئی اور ہندو مسلمانوں کا ایکا ٹوٹا

اور ہر قوم دوسری قوم سے دل برداشتہ ہو گئی۔ اور اعلیٰ طبقوں سے لے کر ادنیٰ درجوں تک کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے حریف نظر آنے لگے اُس وقت یہی کان پور کا رسالہ زمانہ ہندو مسلم اتحاد کا لٹریری جھنڈا ہاتھ میں لیے میدان میں کھڑا رہا۔ اور مسٹر پریم چند جیسے بے تعصب ہندو اپنی قوم کو لٹریری تعصبات سے بچانے کے لیے قلم کی تلوار کھینچ کر میدان عمل میں آ گئے۔

اسی لیے میں یقین کرتا ہوں کہ کان پور کے رسالہ "زمانہ" کا یہ یادگاری نمبر ہر ہندو مسلمان کی ذاتی تقریب مسرت کی یادگار سمجھا جائے گا کیونکہ زمانہ نے بڑی سے بڑی آزمائش کے ایام میں اپنی لٹریری بے تعصبی کو فضا کے زہریلے اثرات سے بچانے میں کامیابی حاصل کی اور ثابت کر دیا کہ اردو زبان نہ ہندوؤں کی زبان ہے نہ مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ ہندوستانی اقوام کی مشترکہ زبان ہے اور اس کی ترقی و حفاظت میں دونوں قومیں شریک ہیں اور دونوں کو شریک ہونا چاہیئے۔ اور رسالہ زمانہ کی جوبلی، ہندو مسلمانوں کے مشترکہ لٹریچر کی جوبلی ہے اور ہم سب جب زمانہ کو مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوں تو درحقیقت اپنے آپ کو مبارکباد دینے والے ہوں گے۔

حضرت ضیا احمد برنی

از یادگار نمبر ۱۹۴۳ء

پیام محبت

منشی دیا نرائن نگم نہ صرف کانپور کی سماجی و شہری زندگی میں نمایاں حصہ لیا کرتے تھے بلکہ خصوصیت کے ساتھ ہر اس تحریک میں پیش پیش رہتے تھے جس کا مقصد ہندو مسلم اتحاد ہوتا تھا۔ جو دوسرے لیڈر تقریروں کے ذریعے کرتے تھے وہی کام منشی جی نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے اصلاحی مضامین کے ذریعہ انجام دیا کرتے تھے۔

منشی دیا نرائن نگم کو اردو زبان سے والہانہ عشق تھا اردو کی جو شاندار خدمات انہوں نے چالیس سال کے عرصہ میں انجام دیں وہ تاریخ اردو میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب

نگم صاحب کا تعلق ایک بھائی اور دوست کا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہماری عمروں میں بڑا فرق تھا۔ یعنی جب انہوں نے "زمانہ" کو نکالا وہ عہد میرے لئے دس بارہ سال قبل مسیح کے برابر ہے لیکن رسالہ کی خدمت کے سلسلے میں وہ اس فرق کا خیال نہ کرتے تھے اور دوست کی طرح ملتے تھے۔ میں زبانی گفتگو اور خط دونوں میں بزرگی کا لحاظ رکھتا تھا وہ اپنی گفتگو سے صحبت کو بالکل بے تکلف بنا دیتے تھے یہ نگم صاحب کی شخصیت کا ایک ایسا راز تھا جسے یقیناً میرے علاوہ ان کے اور جانے کتنے دوستوں اور جاننے والوں نے سمجھا ہوگا۔

منشی دیا نرائن ایک انسان اور دوست کی حیثیت سے

حق پرست

زمانہ فروری مارچ ۱۹۴۲ء

بھائی سری نارائن جی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو گیا ہوں کہ اس یادگار نمبر کے لیے کچھ لکھوں ورنہ میری کیفیت اُس شخص کی سی ہے جس کے آنسو ابھی تھمے نہ ہوں اور اُس سے مرقع کھینچنے کے لیے کہا جائے آنسوؤں کے دھندلکے میں کوئی کیسے مرقع کھینچے۔ میں نے تین چار بار کوشش کی، ناکام رہا، کئی کئی صفحے لکھے اور چاک کر دیئے، آج کیا میں کامیاب ہو جاؤں گا؟ یہ شررِ دھا نجلی ہے جو مجھ کو چڑھانی ہے۔

محترم نگم مرحوم کے دوست احباب کے وسیع حلقے میں نسبتاً حال ہی میں محض ایک اتفاق سے داخل ہو گیا تھا۔ غالباً ۳۶ء کی بات ہے کہ میں کانپور ایک مقتدر عہدہ دارِ تعلیمات سے اپنے کچھ تعلیمی منصوبوں سے متعلق گفتگو کرنے گیا تھا، مجھ کو اپنے ان منصوبوں میں کامیابی کی کم توقع تھی، خیال صرف یہ تھا کہ اور کچھ نہیں تو تبادلۂ خیالات ہی ہو جائے گا اور ایک نئی ملاقات حاصل ہو گی۔ ایک تعارفی خط بھی ساتھ لے لیا تھا، مگر ان بزرگوار سے مل کر جی مکدر ہو گیا۔ اخلاق نہ آداب، روکھے منہ ملے، پھیکی باتیں کیں، رخصت اس طرح کیا گویا بلا ٹالی۔

گرمی کے دن دوپہر کا وقت کانپور سے واپسی کے لیے پورا دن گاڑی کے انتظار میں گزارنا تھا، اجنبی جگہ تھی، کوئی شناسا نہ تھا جہاں بات چیت میں وقت کٹ جاتا، خیال آیا سالہا سال قبل عنفوانِ شباب میں مضمون نگاری کی کچھ دھن سمائی تھی اور "زمانہ" کے لیے کچھ لکھا، اڈیٹر صاحب نے میرے مضامین کو خوب بنا سنوار کر شائع کیا تھا اور میری حوصلہ افزائی یہ لکھ کر کی تھی کہ "آپ خوب لکھتے ہیں، مشق جاری رکھئے" مگر روزگار کی الجھن اور زندگی کی جدوجہد نے اس سلسلہ کو قائم نہ رہنے دیا، چلو آج اُن محترم ہی کو تلاش کریں، اس طرح محض دفع الوقت کے لیے تلاش کرتا کرتا منشی جی مرحوم کے دولت خانہ پر پہونچا، کارڈ بھیجا، بلوانے کی بجائے خود باہر تشریف لائے اور اس گرم جوشی و خلوص سے مصافحہ کیا کہ کچھ حصہ بیشتر اس دوسری جگہ کی سرد مہری اور بدخلقی سے دل جو مرجھایا ہوا سا تھا کھل گیا۔ ہاتھ میں ہاتھ تھامے اندر لے گئے شکایت

کہ کراچی دوڑے آپ نے قدم رنجہ فرمایا۔ پہلے سے اطلاع بھی نہ دی کہ اسٹیشن پر کوئی پہنچ جاتا کہ اس گرمی میں مکان کی تلاش کی زحمت آپ کو گوارا نہ کرنی پڑتی۔ میں نے پوچھا آپ نے مجھ کو پہچانا بھی؟ فرمایا یہ کیا کچھ کم ہے کہ اتنے دُور دراز فاصلے سے آپ میرے یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں نے جب سالہاسال قبل کی خط وکتابت اور مضمون نگاری کی یاد دلائی تو فرمایا "تو اور بھی گلہ کی گنجائش پیدا کردی کہ اتنے طول طویل عرصہ تک آپ نے یاد نہ فرمایا۔" پھر مختلف عنوانات پر گفتگو رہی اور ایسی دلچسپ اور سرگرم کہ وقت کا احساس ہی نہ ہو پایا۔ اس روز تو کیا دوسرے روز بھی جانے نہ دیا۔ اس پہلی ملاقات ہی میں کچھ ایسا گرویدہ کرلیا کہ تکلف کی ساری دیواریں ڈھ پڑ گئیں۔ اس دن کے بعد پھر میری کوئی رخصت ایسی نہ گئی جس میں کسی نہ کسی طرح ان کی خدمت میں کراچی نہ پہونچا ہوں۔ مرحوم سے میرے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔

مرحوم سے میری یہ ملاقات میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اگر میں اپنی زندگی کے واقعات قلمبند کروں تو میری مایوسیوں، محرومیوں اور صدموں کے پس منظر پر یہ واقعہ کیا معلوم ہوگا۔ گویا ایک ایسے گہرے زخم پر مرہم تھا جو عرصہ تک عدم نگہداشت اور بے پروائی کی وجہ سے بگڑتا رہا ہے۔ آج قسمت نے بے رحمی سے اندمال کی یہ صورت بھی فنا کردی۔

میں سمجھتا ہوں عام طور پر انسان دوستی اور محبت کے لیے ایسی شخصیت کا متلاشی رہتا ہے جس میں مردانہ اخلاق کے جوہر ہوں، جس میں راستی ہو، ہمدردی ہو، صاف باطنی ہو، وسیع النظری ہو اور مصیبت کے وقت بھروسہ بھی کیا جاسکے۔ کم از کم مجھ جیسے زخم خوردہ اور خیالی دنیا میں بسنے والے کو تو ضرور ان چیزوں کی تلاش رہتی ہے۔ منشی جی مرحوم میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں۔ کچھ ایسا ذہن رسا اور سب پر ہمہ گیر طبیعت پائی تھی کہ وہ مخاطب کی دقتوں اور الجھنوں کی تہ تک فوراً پہونچ جاتے، اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بحیثیت مصلح کار وہ لاثانی تھے۔ تبادلۂ خیالات بلکہ بحث و مباحثہ کے لیے بھی نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو مخاطب کی جگہ تصور کر کے اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اگر اس میں نقص ہوتا تو بڑی خوبی سے سمجھا سکتے تھے، اور اگر اس کے استدلال میں واقعی اہمیت ہوتی تو وہ اس کو بخوبی محسوس کر سکتے تھے اس قسم کی گفتگو میں کم از کم مجھ کو کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ان کی حیثیت فریقانہ ہو۔ وہ ہر مسئلہ میں مخاطب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے، اور اس طرح گتھیوں کو سلجھانے کی صورت پیدا کرتے تھے ظاہر ہے کہ خواہ کیسا ہی مضمون ہو ان سے گفتگو میں تلخی پیدا ہونے کا امکان نہ تھا اور اس پر طرہ یہ کہ طبیعت زندہ دلی سے معمور تھی۔ ہنسی دل لگی اور لطف و مذاق کا پہلو ہمیشہ موجود رہتا جو سنجیدہ سے سنجیدہ اور بوجھل سے بوجھل گفتگو کو ہلکا اور روشن کر دیتا تھا کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک

بہت خوبصورت منظر نہیں تھا، مگر جب نظر آرہا تھا اس پر کسی نے ایسی روشنی ڈالی کہ وہ اپنی تمام حسن و خوبیوں سے جگمگا اٹھا۔

محبت و مروت کے وہ پتلے ضرور تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی شخصیت اور آزادیٔ رائے کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ جہاں کسی معاملے میں اختلاف ہوتا تو صاف صاف کہہ دیتے۔ کسی کی خاطر اپنی رائے [illegible] خیال یہ ہوتا کہ اس اختلاف یا آزادیٔ رائے سے تلخی پیدا نہ ہو۔ رواداری اور [illegible] ان کا خاص شعار تھا۔

یہی نہیں بلکہ [illegible] سے متعلق میرے خیالات سے ابتدا میں انھیں اختلاف تھا، لیکن انھوں نے میرے [illegible] دوستانہ [illegible] گو [illegible] خطا میں مجھ پر اپنی رائے ظاہر کر دی۔ لیکن جب میں نے عرض کیا [illegible] میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح نہیں کر سکا، آپ کو میرے خیالات کے [illegible] میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تو وہ صبر سے میری باتوں کو سننے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اور بعد کے مضامین کی دل کھول کر داد دی اور جا بجا میرے بیانات کی تائید میں نوٹ لکھ دیئے۔ اس کے باوجود [illegible] ہم خیال ہو گئے ہوں، ایک ملاقات میں انھوں نے فرمایا کہ کبھی آپ تو [illegible] رکھتے ہیں۔ آپ سے کوئی کیا اختلاف کرے لیکن میں اس وقت تک آپ کا ہم نوا نہ ہو سکا۔ ممکن ہے اس کی تہہ میں زندگی بھر کا شغف اور سرپرستی کے اثرات ہوں۔ لیکن بہر صورت حال یہ ہے۔ ایک صاحب نے اردو اور ہندی سے متعلق ہندی کی تائید میں انھیں کچھ سخت تحریر لکھی تھی، اس کا بھی انھوں نے کشادہ پیشانی ہی سے جواب دیا کہ میں نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی ہے، قدرتاً مجھ کو اس سے پریم ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھ کو ہندی سے اختلاف یا نفرت ہو۔

عام طور پر لوگ کم جانتے ہیں کہ ان کا اثر بڑے بڑے مقتدر انگریز عہدہ داروں پر بھی تھا، جو ہمیشہ انھیں وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ گورنمنٹ کی پالیسی پر برابر آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے تھے۔ غالباً بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ انھیں رائے صاحب کا خطاب حاصل تھا۔ لیکن اس کو انھوں نے کبھی اپنا طرۂ امتیاز نہ سمجھا نہ کبھی اپنے نام کے ساتھ استعمال کیا۔ ان کی پبلک سرگرمیاں ہمہ گیر تھیں۔ میونسپلٹی سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر جگہ کمیٹیوں میں ان کی مانگ تھی۔ اور وہ کشادہ پیشانی سے ہر ایک میں حصہ لیتے تھے۔ روزانہ ڈاک کا ایک انبار رہتا تھا جس کا وہ دوست احباب سے بات چیت کرتے ایک طرح بیٹھے بیٹھے تصفیہ کر ڈالتے۔ اس پر دو دو رسالوں کی ادارت، ترجموں کی تصحیح اور کاپی کی صحت بھی خود کرتے۔

ان ہمہ مذاق اور مصروفیتوں کے باوجود وہ ہر وقت ہر شخص کے لیے میسر تھے۔ [illegible] سے

ادنیٰ آدمی کی اُن تک رسائی تھی، محلہ کا تانگہ والا ہو یا کنجڑہ، دوکاندار ہو یا مزدور، جب تک اُن کے سامنے اپنا دکھڑا نہ رو لیے چین نصیب نہ ہوتا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچے، جوانوں کے ساتھ رنگین مزاج رعنا، غریبوں کے ساتھ غریب، امیروں کے ساتھ خوددار تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ بڈھوں کی صحبت میں کبھی کبھی ان پر بڑھاپا نہ جھلکا، حالانکہ عمر اب غالبًا ساٹھ سے اوپر ہو چکی تھی۔

بیوی کے انتقال نے مگر غضب ڈھایا، اس انتقال کے بعد کی دیوالی پر میں مرحوم کے ساتھ ہی تھا۔ بڑی رات تک ہم دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے مرحومہ کی تصویریں مجھ کو دکھلائیں اور نہ جانے کب کب کے تذکرے کیے۔ غم و رنج سے دونوں کے دل لبریز تھے، میری بہت عزیز ہمشیرہ کا انھیں دنوں ناگپور میں انتقال ہوا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد میری رفیق زندگی نے بھی مجھ کو دائمی مفارقت دی، میں نے سوچا تھا کہ وظیفہ لے لوں اور زندگی کے کاروبار کا رُخ بدل دوں، منشی جی سے اس بارے میں بڑی تفصیلی خط و کتابت رہی ہے۔ انھیں کے مشورہ سے میں ابھی طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈالے ہوا ہوں کہ پہلے بچوں کے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

لیکن اب، میں پھر تنہا ہوں۔ کوئی نہیں جس سے دل کی داستان کہہ سکوں۔

✣ ✣ ✣

پیام محبت

حضرت روش صدیقی

اقتباس از یادگار نمبر ۱۹۴۷ء

اردو زبان ہندوستانی تمدن کی ایک مشترکہ دولت ہے "زمانہ" اس دولتِ بیدار کی حفاظت و توسیع میں ہمیشہ سرگرم رہا۔ شیدایانِ اردو منشی دیا نرائن نگم کی اُن قابلِ احترام اور لائقِ تحسین خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو انھوں نے اردو کی اشاعت و حفاظت کے سلسلے میں انجام دیں کچھ عرصہ سے ہمارے ملک میں ہنگامہ پرستی کی ایک ایسی لہر طوفانی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی ہے جس نے اردو ہندی کے جھگڑے کو ایک بھیانک شکل دیکر کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اس طوفانی لہر نے محبت و آشتی، صلح پسندی و رواداری کے ساحل کو جگہ جگہ سے شکستہ کر دیا ہے۔ بہت سے بہی خواہانِ وطن اس لہر کے زور و شور میں بہ نکلے، یگانوں نے شیوہ بیگانگی کا برملا اظہار کیا مگر اس طوفان و تلاطم میں بھی بہت سے محبانِ وطن نہ صرف خود وقار و متانت کے ساتھ اس ہنگامہ خیزی و تفرقہ پرستی سے بیزار رہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ان کی شخصیت ایک عمدہ مثال قائم کرتی رہی۔ محترم منشی صاحب بھی اسی کاروانِ محبت و آشتی میں نمایاں طور پر شامل تھے۔

نگاہِ خلوص بیں

زمانہ، فروری، مارچ ۱۹۴۳ء

جوش ملیح آبادی

نہ پوچھ ذوقِ سفر کو میرے، کہ اکثر اس عالمِ آب و گل میں   کبھی بیابانِ غم میں پہونچا، کبھی شبستانِ جم کو دیکھا
کبھی برہمن کا روپ بھر کر، کبھی حق آگاہ شیخ بن کر   ضیائے شمعِ حرم کو جانچا، فروغِ بیت الصنم کو دیکھا
کبھی تفکر کی روشنی میں، فلک کو کھولا، زمیں کو پلٹا   کبھی صحافت کے آئینے میں عرب کو پرکھا عجم کو دیکھا
کبھی لیا درسِ زندگانی، کبھی سنی موت کی کہانی   کبھی کتابِ وجود کھولی، کبھی نصابِ عدم کو دیکھا
کبھی حوادث کے عقد ہائے فساد انگیز پر نظر کی   کبھی زمانے کی کاکلوں کے جنون خیز پیچ و خم کو دیکھا
کبھی دماغِ گرہ کشا نے اساسِ علم و عمل کو تولا   کبھی نگاہِ کرشمہ بیں نے بطونِ دیر و حرم کو دیکھا
کبھی جنوں خیز جھٹپٹے میں ترنمِ آہ پرفغاں کی   کبھی طلوعِ سحر کی رو میں تبسمِ چشمِ نم کو دیکھا
کبھی طرب میں نگہ اٹھا کر، کبھی تفکر میں سر جھکا کر   فلک کی رفعت نظر میں تولی، زمیں کے جاہ و حشم کو دیکھا
کبھی تمدن کے فرشِ گل پہ ٹھہر کے وحشت کی لگاوٹ   کبھی معیشت کے راستے سے پلٹ کے تازہ و نعم کو دیکھا
کبھی یمِ بے کراں کے اندر ملا فقط اک حقیر قطرہ   کبھی ہر اک قطرۂ تنک میں خروشِ صد موجِ یم کو دیکھا
کبھی کلاہِ شہنشہی میں نظر پڑا کاسۂ گدائی   کبھی سرِ کاسۂ گدائی، شکوہِ طبل و علم کو دیکھا
کبھی رگِ تارِ ارتقا کی تلاشِ پیہم کے سلسلے میں   سراغِ حبل و جنوں کو پایا، بنائے سیف و قلم کو دیکھا
کبھی عداوت کے عاملوں کی ہر اک ادا پر نگاہ ڈالی   کبھی محبت کے رہ روؤں کے ہر ایک نقشِ قدم کو دیکھا
خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے، کہ اس پراگندہ زندگی میں   خیالِ ہر خیر و شر میں ڈوبا، مآلِ ہر بیش و کم کو دیکھا

مگر مجھے یہ بڑی خوشی ہے کہ اس تماشائے نو بہ نو میں
مری نگاہِ خلوص بیں نے دیا نرائن نگم کو دیکھا

پیام محبت

چند پیام و چند اقتباسات یادگار نمبر زمانہ فروری مارچ ۱۹۴۳ء درج ذیل ہیں:۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو (پی سی)

آج تک شاید ہی زمانہ کا کوئی نمبر ہو گا جو میں نے ذوق و شوق سے نہ پڑھا ہو۔ منشی دیا نرائن نگم فدائے اردو تھے اور ان اصحاب کو جو اردو کی ترقی و عروج کے خواہاں ہیں اس کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں کہ منشی صاحب نے اردو کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ پرچہ کا معیار ہمیشہ بلند رہا ہے

وہ اچھے دوست، شیریں گفتار، اور سنجیدہ مفکر تھے۔ میں ان کے اعلیٰ دماغی اوصاف کا ہی نہیں بلکہ ان کے خوش اخلاق کا بھی گرویدہ تھا۔

حضرت جگر مرادآبادی

منشی دیا نرائن نگم میرے بہت ہی دیرینہ اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ نہایت درجہ روشن خیال، بلند نظر اور وسیع القلب انسان تھے۔ وہ نہ صرف ادیب کامل تھے بلکہ ادب و شعر کے دیوانہ بھی جہاں کہیں انھیں ادبی حسن نظر آجاتا تھا وہ تمام تر محو تاثرات ہو جاتے تھے۔ ان کا خلوص اور ان کی محبت محدود نہ تھی۔ اختلاف عقائد کے باوجود احباب کے لئے وہ ایک عاشق بیتاب تھے۔ وطن اور اہل وطن کا درد رکھتے تھے اور روح کی گہرائیوں میں شدید گداز۔ اردو ادب کی خدمت انھوں نے جس خلوص و ایثار سے کی وہ انھیں کا حصہ تھا۔

پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی

پہلی ملاقات میں منشی دیا نرائن نگم کے حسن اخلاق و زندہ دلی نے مجھے مسحور کر دیا۔ اس وقت سے آخر دم تک وہ مجھ سے نہایت شفقت و مہربانی سے پیش آتے رہے۔ بیسویں صدی کے اردو لٹریچر کی کوئی تاریخ اس بیش بہا علمی و ادبی خزانہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی جو زمانہ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ حیدرآباد

زبان اردو کا کوئی شیدائی ان بیش بہا خدمات کو جو منشی دیا نرائن نگم نے اپنی زندگی میں انجام دیں فراموش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر م۔ حفیظ سید پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ،

زمانہ کی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں بڑی حد تک چالیس برسوں کے درمیانی عرصہ میں واقع ہونے والے تمام ادبی، علمی اور لسانی تغیرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ نے ہر حیات پرور رجحان اور زندگی بخش ادبی اور علمی تحریک کو لبیک کہا اور اس کی نشو و نما میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔
منشی جی کا اعلیٰ دماغ جو ایک فطری صحافتی قابلیت کا حامل تھا اس حقیقت کو صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ صحافت قومی اور ملی زندگی کا صحیح ترجمان اور اس کا آئینہ ہے اس لئے اسے ہر قسم کی رجعت پسندی تنگ نظری جمود و عصبیت سے نجات دلا کر اسے قومی اور ملی حیات کو تر و تازہ کرنے اور ترقی پسند سماجی طاقتوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرنی چاہیئے۔

جناب جعفر علی خاں صاحب اثر

مجھے یہ بھی علم ہے کہ اردو کی خدمت میں منشی دیا نرائن نگم کی سرگرمی بعض لوگوں کو سخت گراں گزری تھی۔ منشی جی سے وعدے کئے گئے اور لالچ دیا گیا کہ اگر زمانہ کی جگہ ہندی کا رسالہ نکالا جائے تو نقصان کی نہ صرف تلافی ہو بلکہ فائدہ متصور ہے مگر ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ میر نے غالباً ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے ؎　برسے اگر تلوار سروں پر منھ موڑیں زنہار نہیں،
سیدھے جانے والے اُدھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

جناب خواجہ محمد شفیع صاحب اردو مجلس دہلی

زمانہ میں ایسی ہستیاں نادر الوجود ہیں، ہمہ تن خُلق، خدمت، مجسم علم و ادب۔ یہ زمانہ کی خوش بختی تھی کہ ایسے صاحب قلم نصیب ہو گئے۔
بہترین انشا پرداز، نہایت بلند پایہ ادیب، انتہائی نکتہ سنج و نکتہ رس، اور پھر مشرقی تہذیب کا مکمل نمونہ دیکھکر بیساختہ منھ سے نکلتا تھا ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

جناب شیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی

ہر طرح سے مکمل مہر خدمت ادب تھی قائل نہیں جواں کا ہے کون ادیب ایسا
بزم ادب میں اب تک مجھ کو نظر نہ آیا دل کا امیر ایسا، پھر بھی غریب ایسا

جناب طالب چکوالی صاحب

گمنامی کی تاریکی سے کتنوں ہی کو تونے نکالا ہے ہر کیف سکونِ فطرت کو سانچے میں ادب کے ڈھالا ہے
محبوب "زمانہ" تھا تیرا، اس کی خاطر کیا کچھ نہ کیا رنگین، روشن، امید سے پُر، مستقبل کا بلیدان کیا

جناب فیاض الدین احمد خاں صاحب فیاض

ادب کا خادمِ خاموش وہ بانیٔ "زمانہ" کا دلوں پر نقش جس کا اب بھی احساں ہوتا جاتا ہے
ادیب شُستہ ذوق و با محبت بے ریا تھا وہ قلم جس کا بیاں لکھنے میں گریاں ہوتا جاتا ہے

جناب باواکرشن گوپال مغموم صاحب

وہ سلاست وہ روانی کا مرقع اس کی نثر کلکِ گوہر بار کے وہ دلنشیں نقش و نگار
اس کی وہ طرزِ نگارش دل پسند و دل نشیں اس کا اسلوب بیاں شستہ، متین و باوقار

جناب سید محمد عباس صاحب

رواں ز حسنِ ادب شد بہ بارگاہ کرشن ادیب و عاقل و خوش فکر و صاحبِ ادراک
بکار درد دلِ دیگراں مسیحا بود مگر ز درد دلِ خویش زود گشت ہلاک

جناب فاروق محشر بدایونی صاحب

اس کو اللہ نے بخشی تھی وسیع النظری منہ سے ہر بات نکلتی تھی محبت سے بھری
اس کے اندازِ تکلم میں تھی وہ جادو اثری اس کے جذبات کی دنیا تھی تعصب سے بری
پاک دل، پاک زباں، پاک خیالات تھا وہ
زود رس، زود خرد، زود کمالات تھا وہ

منشی دیا نرائن نگم

اپنے مضامین کے آئینہ میں

عرضِ حال

اقتباسات از زمانہ، جنوری و جولائی ۱۹۰۳ء تا اپریل ۱۹۴۷ء

جنوری سنہ ۱۹۰۳ء

زمانہ کی ایڈیٹری میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ناظرین پر سرورق کے ملاحظہ سے ظاہر ہو گئی ہوگی۔ یہ تبدیلی بڑے پس و پیش کے بعد منظور کی گئی ہے۔ اپنی کم مائیگی اور بے علمی کا یقین مانع تھا کہ ایسا اہم کام اپنے ذمہ لیا جائے مگر شوقِ اکتساب اور جوشِ خدمتِ ملکی اور خیالِ اصلاح رسالہ ہذا نے بالآخر فتح پائی اور نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ کی ترتیب کم سے کم کچھ دنوں کے لیے اپنے سر لی گئی۔

بعد صلاح و مشورے کے یہ طے پایا کہ زمانہ محض شاعری و انشا پردازی کے ہاتھ گرو نہ کیا جائے۔ زمانہ میں وسیع ترقیٔ زبان کا خیال لیے ہوئے اصلاحِ خیالات، وسعتِ نظر، توسیعِ معلومات، ترقیٔ اتحاد وغیرہ کا زیادہ خصوصیت سے التزام کیا جائے۔

جولائی سنہ ۱۹۰۳ء

اس عرصہ میں رسالہ نے جو حیثیت پیدا کر لی ہے وہ بہر صورت [illegible] لائق ہے۔ ہم نے اس رسالہ کی روش اردو کے تمام موجودہ پرچوں سے جدا رکھنی چاہی تھی۔ شکر ہے کہ ہم اپنے اس ارادے کو نبھا سکے۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جس طرح ہم نے ہندو و مسلمان یا اور دیگر قوموں میں کبھی فرق نہیں سمجھا اسی طرح ان سب قوموں کے معززین اور عمائد منتخب اور مقتدر اصحاب نے یکساں فراخ حوصلگی اور بلند نظری کے ساتھ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہم یہاں پر ان عنایت آمیز الفاظ کو جو ہمارے لیے بہترین انعام کے بجائے ہیں نقل کرنا اصولاً نہیں پسند کرتے۔

ہم ملک کے روبرو ایک جامع رسالہ پیش کیا چاہتے ہیں جو محض ہماری علمی ضرورتوں کو پورا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ عملی باتوں کا بھی لحاظ رکھے جو رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ قدم بقدم چلے اور اہلِ ملک کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرے اور انھیں ایک نیک اور دور اندیش ناصح اور صلاح کار کی طرح ہر معاملہ میں مشورہ دے۔ خطروں سے متنبہ کرے اور دنیا کے فریبوں سے بچائے۔ واقعاتِ عالم اور ان کے مصنوعی پہلو سے آگاہ کرے۔ باہمی میل جول اور قومی اخوت اتحاد کے اصولوں کو محبت اور صداقت کے ساتھ ذہن نشین کرے اور حالات اور واقعاتِ زمانہ کو ناصح مشفق کے دل مورخ دور اندیش کی آنکھ اور فلسفی نکتہ رس کے دماغ سے دیکھ کر اور غور کر کے ان کے بہترین معنی

اور اندرونی مطالب کی تلقین کرے اور روزمرہ خانہ جنگیوں کے شور و غل میں حل طلب معاملات اور مسائل پر کسی ایک فریق یا جماعت کا طرفدار بن کر نہیں بلکہ تمام ملک اور سب قوموں کا پنچ اور منصف ہو کر اہل ملک کو اتفاق اور اتحاد کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرے اور اپنے پاک فرائض ادا کرنے میں ضمیر اور اپنے خدا کی خوشنودی کے سوا اور کسی گروہ یا فرقہ کی ناراضی کا خوف نہ کرے ساتھ اس کے حتی الوسع رنج پہونچانے غلط فہمی پیدا کرنے اور دوسروں کی تضحیک یا تحقیر سے ہمیشہ قطعاً پرہیز کرے کیونکہ گو ہم اصول کے معاملہ میں دوغلی اور ہر فریق کو خواہ مخواہ خوش رکھنے اور اس طرح سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی کوشش کے سخت خلاف ہیں تاہم ہم سب پر سب کے خیالات اور اعتقادات کا پاس اور احترام واجب سمجھتے ہیں اور ملک کے پرچوں کو اس ذمہ داری اور فرض لازمی سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ ہم ذاتیات پر بحث کرنے اور ایک دوسرے پر ردّ و قدح کو جس میں کہ ملک کے پریس کا ایک حصہ اس ناعاقبت اندیشی کے ساتھ معروف ہے۔ انسان اور خدا دونوں کے روبرو ایک گناہ عظیم سمجھتے ہیں اور ان سے بچے رہنے کی کوشش کو ہم سب پر یکساں واجب اور لازم سمجھتے ہیں۔

اپریل ۱۹۳۷ء

اخبار نویسی کا پیشہ ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ ہے۔ جو لوگ روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں انھیں اس طرف متوجہ نہ ہونا چاہیے۔ البتہ ملکی خدمت کی اس معزز پیشے میں کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا میدان نہایت وسیع ہے، اور ہمت استقلال اور دیانت سے کام کرنے والوں کو ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی وقعت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ جب ہی ممکن ہوگا جب ہم آرام طلبی کی زندگی کو خیر باد کہہ کر خودداری، ایثار اور مستقل مزاجی سے راہ راست پر چلتے رہیں۔ جو صاحب اس پیشے کی طرف یہ سمجھ کر رجوع ہوں کہ تھوڑی سی محنت میں انھیں ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے گی، تھوڑی سی کوشش میں وہ آسانی سے قومی لیڈر بن جائیں گے انھیں جلد یا دیر میں مایوسی سے سامنا ہوگا۔

دوسروں سے مالی امداد کی امید بھی فضول ہے۔ کسی زمانہ میں بعض اخبارات دیسی ریاستوں سے حصول زر کی امید رکھتے تھے۔ اب بعض اصحاب کو سیاسی اقتدار کے دلدادہ لیڈروں اور دیگر رہنماؤں سے نفع اٹھانے کی فکر رہتی ہے۔ حال میں صوبہ کے ایک مقتدر رہنما نے مجھ سے شکایت کی کہ ان سے کئی اردو اخبار نویس پریس وغیرہ کے بہانے سے مالی امداد کے طالب ہوئے۔ ان باتوں سے اپنی عزت کھونے کے سوائے اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ الٹا جماعت کے عز و وقار میں فرق آتا ہے۔ اس لیے جو صاحب اخبار نویسی کے پیشہ کو اختیار کریں وہ یہ سمجھ کر اس میں داخل ہوں کہ ابھی کم از کم ایک پشت تک اور اس پیشہ میں بمشکل بسر اوقات ہو سکے گی۔ ہاں قومی خدمت کے دلدادہ اخبار نویسوں کی خدمت مقبول عام ہوگی اور انھیں اطمینان قلب اور روحانی مسرت بھی حاصل ہوگی۔

مُطالعۂ رامائن

زمانہ اکتوبر و نومبر ۱۹۱۶ء

زمانہ کے ایک گذشتہ نمبر میں رامائن کے اخلاقی پہلو پر بحث کرتے ہوئے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اس کی روحانی دلکشی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں "انسانی تقدس اور دلی پاکیزگی"۔ "ظاہری خوبی اور باطنی نیکی کی" انتہائی حدیں کھینچ دی گئی ہیں۔ اصل قصہ ایک بے نظیر قصہ ہے جس میں فرائض دنیوی کے بہترین معیار کے مکمل نمونے پیش کیے گئے ہیں رامائن کا معیار سرشت انسانی کی تکمیل اور ترقی کی انتہائی منزل ہے۔ اس پر لطف یہ کہ سارے قصے میں انسانی حیطۂ امکان کا اقتدار نظر انداز نہیں ہوا۔ پھر بھی تمام قصے میں گناہ کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ افراد قصہ میں چاہے جس کے قول و فعل کو جانچیے۔ کہیں گناہ کا شائبہ تک نظر نہ آئے گا۔ شروع سے آخر تک آپ کو صرف بہترین قسم کے انسانوں سے سابقہ رہے گا۔ مختلف طبقے کے آدمی ملیں گے مگر جہاں تک اصل قصہ کا تعلق ہے سب اپنے اپنے درجے اور حیثیت میں گناہ سے پاک اور معصیت سے بری۔ بظاہر خراب سے خراب شخص بھی اپنے اصول اور دھرم پر ثابت قدم اور ایک مسلمہ ضابطۂ اخلاق کا پابند ہے جس کی بدولت کسی پر نکتہ چینی کی گنجائش نہیں رہتی۔ راجہ دسرتھ اور رانی کیکئی پر زُود رنج القلب حضرات بہت کچھ معترض ہوتے ہیں کہ سری رام چندر جی کی ناحق جلاوطنی انھیں کی کمزوری اور فتنہ پردازی سے ہوئی۔ مگر یہ الزامات مضمون مذکور میں کافی غور اور بحث کے بعد بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکے ہیں۔ اب ہم اس مضمون میں چند دیگر افراد قصہ کے طریق عمل پر غور کر کے دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اس معیار کے مطابق اترتے ہیں یا نہیں اور کسی طرح قابل ملامت ہو سکتے ہیں یا کل یا تو نہیں بالکل بری الذمہ ہیں۔

جلاوطنی کے متعلق کیکئی جی کے بعد بادی النظر میں سب سے پہلا قصور ان کی پیش خدمت منتھرا کا معلوم ہوتا ہے۔ جس نے کہ اس تمام فتنہ و فساد کی آگ لگائی تھی۔ اسی نے شہر میں جشن تخت نشینی کی عظیم الشان تیاریاں دیکھ کر رانی کے کان بھرے تھے۔ اسی نے رشک و حسد کے جذبات ابھارے تھے۔ اسی نے کیکئی کو اس مخالفت پر آمادہ کر کے ان کے

مقصد برآری کی تدبیر بتلائی تھی۔ اور راجہ کے پُرانے عہد کی یاد دلائی تھی۔ غرض تمام طوفان اسی کا اٹھایا ہوا تھا۔ مگر یاد رکھیے کہ منتھرا رانی کی خاص نوکر تھی نہ کہ راجہ دسرتھ کی۔ بڑی بڑی محلات کے اندرونی انتظام کا جن لوگوں کو پورا حال معلوم ہے وہ جانتے ہیں کہ رانیاں اپنے خانگی انتظامات میں بالکل آزاد اور خود مختار ہوتی ہیں اور اسی سبب کثرت ازدواج پر بھی ان کی شان اور توقیر میں فرق نہیں آنے پاتا۔ غرض اپنے آقا کی خیر خواہی منتھرا کا فرض مقدم تھا۔ اور اسے اس نے اپنی عقل اور امکان کے بموجب انجام دینے کی کوشش کی۔ رانی کیکئی کو ترغیب دیتے وقت اس کو اپنے ذاتی نفع کا خیال یا کسی انعام واکرام کا لالچ نہ تھا۔ اس قسم کا خیال اس تحریک اور کوشش کی تہ میں کبھی اور کسی وقت چھپا نہیں رہا۔ منتھرا کی صرف ایک ہی غرض اور غایت تھی۔ یعنی اس کی مالکہ کو عروج اور اس کے بیٹے کو راج نصیب ہو۔ اس کی چھوٹی عقل کہتی تھی کہ دوسری رانیوں کے راج کنور گدی پائیں گے تو بھرت جی کو ان کا تابع اور مطیع ہو کر رہنا ہوگا پھر اس کی رانی کی بھی وہ وقعت کیسے باقی رہے گی جس پر آج انھیں اس قدر ناز ہے۔ اسنے جو کچھ کیا اپنی عقل کے بموجب حق نمک ادا کیا۔ ایک بات اور قابل لحاظ ہے کہ منتھرا کو رام چندر جی کی جان جوکھم مدنظر نہ تھی۔ انھیں آزار پہونچانے کا اسے چنداں خیال نہ تھا۔ بلکہ صرف بھرت جی کی تخت نشینی کی فکر میں تھی۔ اس کے متعلق تمام کارروائیوں میں اس کی نیت پاک رہی اسی سے منتھرا پر ہم ذرا دیر کے لیے بھی کوئی الزام قائم نہیں کر سکتے ہیں۔

اب راون کو لیجیے جس سے بن باس میں رام چندر جی کو ایسی سخت جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کرنا پڑی۔ بظاہر اسباب یہ سب سے بڑا جابر اور گنہگار معلوم ہوتا ہے کیونکہ سیتا جی کے قید کرنے کا عذاب اس کی گردن پر ہے۔ مگر اس میں بھی کیا اس نے جادۂ حق سے باہر قدم رکھا؟ اس کی حقیقی بہن زار و قطار روتی ہوئی اس کے سامنے آتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ایک راجکمار نے جن سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی اس کی ناک کاٹ لی جس سے اب وہ ہمیشہ کے لیے دنیا میں منھ دکھلانے کے قابل نہیں رہی۔ اب فرمائیے کہ بادشاہ درکنار ایک معمولی آدمی بھی ایسی بات پر خاموش رہ سکتا ہے؟ راون نے جائز غصے کی حالت میں انتقام لینے کی قسم کھائی۔ ظاہر ہے کہ اس ارادے کے وقت وہ دنیا کے بہترین جذبات سے متاثر تھا۔ ایک اعلیٰ درجہ کا غصہ اس کے دل و دماغ پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ سیتا جی کو اٹھایا اور اپنے طلائی محل میں نظر بند کر دیا۔ مگر ان کے ساتھ دو بدو کبھی کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا۔ تمام زمانہ قید اور قید کے تمام مصائب پر سیتا جی کو یہ ایک بڑے اطمینان کی صورت تھی کہ اُن سے

ساتھ گستاخانہ جبر و ظلم نہوگا۔ ورنہ ان کی زندگی ناممکن ہوجاتی اور انھیں اپنی آبرو بچانے کے لیے خودکشی کے سوا اور کوئی تدبیر باقی نہ رہتی۔ مگر اس کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور یہ راون کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ جس کا ہمیشہ جب تک کہ وسے زمین پر رام و راون کی لڑائی کا تذکرہ باقی رہنے گا نیکی کے ساتھ ذکر ہوتا رہے گا۔ سچ پوچھئے تو راون عجیب مجموعۂ صفات تھا۔ کیسے اصولوں کی اور سچی لڑائی لڑتا تھا کہ دلوں میں کدورت نام کو نہ تھی ایک دفعہ رام چندر جی کو ایک مذہبی رسم ادا کرنے کی ضرورت پڑی جس کی اعانت کے لیے راون ہی سب سے موزوں شخص تھا۔ اس کی بلند نظری، وسیع مشرب خیالی دیکھیے کہ باوجود جنگ رام چندر جی کی نوید پر فوراً آن موجود ہوا۔ اور کل رسوم بطریق مناسب ادا کرکے لوٹ آیا۔ ایک یہ وقت ہے کہ آپس میں بھائی بھائی عناد باہمی اور مخالفت دلی کا نمونہ بنے ہوئے ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے محو کرنے پر تلے ہوئے ہیں آہ زمانے نے کیا پلٹا کھایا ہے۔

راون کی ہمت اور شجاعت کی بھی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ کیسی بہادری سے لڑتا ہے اور کس استقلال سے اپنے ارادے اور حوصلے پر آخر دم تک قائم رہتا ہے۔ خاندان کے سب سے بیر میدان جنگ میں کام آچکے ہیں۔ فوج کے بڑے بڑے سورما سردار اور نبرد آزما سپہ سالار نذر تیغ ہو چکے ہیں۔ عزیز و اقارب یار و مددگار اب کوئی تسلی دینے کو موجود نہیں ہے۔ تمام عالم سیاہ و تاریک نظر آتا ہے۔ میدان جنگ لاشوں سے پٹا ہوا ہے اور ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ مگر وہ بات کا دھنی جوانمرد اور اولوالعزم بہادر ہمت نہیں ہارتا کیونکہ اس نے اس کار عظیم کو اپنے بل اور قوت پر اٹھایا ہے نہ کہ دوسروں کے بھروسے پر۔ دانی سمجھاتی ہے "کہ جنگ سے باز آؤ۔ اس میں بجز نقصان اور تباہی کے کیا ہاتھ لگا سیتاجی کو واپس کرکے صلح کا پیغام بھیجو۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اپنا دم ہے تو اس کے ساتھ سب کچھ پھر مہیا ہو جائے گا۔ ایک ناروا بات پر ضد کا نتیجہ اچھا نہیں۔ اور جان بوجھ کر موت کے منھ میں ہاتھ دینے سے کیا فائدہ۔ اور نہ سہی تو بقائے نسل ہی کے خیال سے صلح کرلو۔ آخری فقرہ ایسا نہ تھا کہ کسی اور وقت میں راون یا اس کے عہد کے کسی شخص پر اثر کیے بغیر رہتا۔ مگر وہ کہتا ہے کہ اب صرف سیتاجی کا معاملہ نہیں رہا۔ اب جنگ نے دوسری اور زیادہ اہم صورت اختیار کرلی ہے۔ تھوڑے دنوں پہلے جو ایک خانگی جھگڑا تھا وہی اب ایک ملکی مناقشہ ہو گیا ہے۔ اس وقت ملک کی آزادی معرض خطر میں ہے۔ شکست کے معنی اب ملک پر غیروں کے اقتدار کے ہوجائیں گے۔ اور یہ راون کے جیتے جی کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی ایک آخری کوشش باقی ہے ملکی آزادی پر وہ اپنی جان قربان کردے گا۔ اپنی بات اور ملکی عزت وہ اپنی زندگی تک قائم اور برقرار رکھے گا

بھائی بیٹوں کا سر کٹوا کر موت کے ڈر سے صلح کر لینا نامردی ہے۔ دوسروں پر آفت نازل کر کے اپنی جان بچانے کی فکر کرنا سخت بے غیرتی ہے۔ ملکی حمیت سے اسے اپنی جان عزیز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے وہ کوئی خلاف شان صلح کر سکتا ہے۔ غرض بیوی کی منت وسماجت بیکار جاتی ہے۔ اور وہ کمال خندہ پیشانی اور مستعدی سے مردانہ وار اپنی آخری جنگ کے لیے تیار ہوتا ہے۔ عام خیالات کے بموجب طرح طرح کی بدشگونیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ کچی کچی فوج میں سب کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی بات اور اپنے ملک کے لیے سر بکف ہے۔ اور ایک لحظہ کے لیے بھی پس وپیش کو راہ نہیں دیتا ہے۔ اور کسی طور پر ہراس و مایوسی کا شکار نہیں ہوتا ہے اور آخر کار اپنے خاندانی ننگ وناموس اپنی ذاتی شان وشوکت اور ملکی عزت و حمیت کے خاطر داد شجاعت دے کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ آج کے دن رام لیلا ؤں میں "راون کی جے" پکارنے والے اس کے اعلیٰ جوہروں کو اکثر بھول جاتے ہیں اور اپنی ناواقفیت اور نادانی میں اسے ہمہ تن عیب اور گناہ مجسم سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر چشم بصیرت سے دیکھنے والے اس کی شرافت اور شجاعت حب الوطنی اور بلند حوصلگی کے قائل ہو کر اس بڑی غلطی کے لیے جس کا اسے ایسا بھاری خمیازہ اٹھانا پڑا دل سے افسوس کرتے ہیں۔ ایک عصمت کی دیوی کی توہین کا دل میں خیال لانا بھی ایک ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ جس کی تلافی دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں۔ جس کی پاداش میں دنیا کی بڑی سی بڑی طاقتیں بھی نیست ونابود ہو کر رہیں گی۔ راون دراصل اس معاملے میں حق بجانب نہ تھا۔ گو ہم اسے صاف طور پر کسی جرم کا ملزم نہیں قرار دے سکتے۔ غرض یہی وجہ ہے کہ اسے بالآخر شکست فاش کا منھ دیکھنا پڑا۔ لچھمن جی کی ایک جائز سزا کی مخالفت میں وہ رامچندر جی سے ناحق جنگ اور سیتا جی کی ناروا دل آزاری کر بیٹھا۔ جو کسی طرح جائز نہ تھی۔ علم وفضل میں راون اپنے وقت کا یگانہ روزگار تھا۔ اس پر بھی لازمہ بشریت سے غلطی کھا ہی گیا۔ تاہم جہاں تک رامائن کے قصے کا تعلق ہے اس کا دامن ایک سفید چادر کی طرح داغ معصیت سے بالکل پاک وصاف اور بے لوث ہی رہا۔ اثنا جنگ میں اس سے ایک واقعہ بھی خلاف آئین جنگ یا دستور شرافت سرزد نہیں ہوا۔ ہنومان جی کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ بیجا نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ ایک خفیہ جاسوس کی حیثیت سے لنکا میں گرفتار کیے گئے تھے اور اسے ان کی سزا کا پورا حق حاصل تھا۔

ممکن ہے کہ اس تمام فتنہ وفساد کے اصل سبب کے متعلق کسی کو کوئی شک ہو اور لکشمن جی کا سوپ نکھا کی ناک کاٹنا نی زمانہ ایک سخت اور بیجا بات سمجھی جائے مگر یاد رہے کہ اس کے لیے انھیں بے ضرورت اور بے موقع بہت زیادہ اشتعال کا موقع

دیا گیا تھا۔ سوپ نکھا حسنِ نفسانی سے مغلوب ہو کر آپ سے بہ کمال بے غیرتی پیش آئی تھی۔ اور مکرر سمجھانے اور دھمکانے پر بھی اپنے بیہودہ خیالات اور لغو حرکات سے باز نہ آئی تھی۔ لچھمن جی عمل نیکی اور روحانی پاکیزگی کی زندہ مثال تھے۔ ایک بدمعاش عورت کی بے حیائی کی تاب نہ لا سکے اور ایک تنبیہ کو اس کے اعمالِ بد کی سزا دیے بغیر نہ رہے۔ آخر آپ شاہزادے تھے۔ اخلاقی مجرموں کی بیخ کنی آپ کا موروثی فرض اور اس وقت کے رسم و رواج کے مطابق آپ کا مقدم کام تھا۔ اور آپ بذاتِ خود جلاوطن بھی نہیں کیے گئے تھے بلکہ محض بہ تقاضائے محبت رام چندر جی کے ساتھ ہوئے تھے۔ پھر آپ حقوق سے فائدہ اٹھانے سے گریز کیوں ملتجی پیش کرتے۔

∴ ∴ ∴

سوشل ریفارم اور اصلاحِ تمدن کی تحریک کو ہندوستان میں جاری ہوئے تقریباً دو پشتیں ہو چکیں۔ یوں تو ہندوؤں میں تقریباً ہر قرن اور ہر زمانے میں بڑے بڑے ریفارمر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن برطانوی سلطنت کے قائم ہونے اور انگریزی تعلیم جاری ہونے کے بعد ملک کے سیاسی و تمدنی حالات و ضروریات میں جو کمی کسی کی بدولت رونما ہوئی اور اس کی بدولت جو مسائل اہلِ ملک کیلئے پیدا ہو گئے ان کے حل کرنے کے لیے راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند، جسٹس راناڈے وغیرہ نے اپنے اپنے وقت میں جو کوششیں کیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس انقلابِ حکومت کے ساتھ مشرقی و مغربی تہذیبوں میں جو تصادم ہوا اس کی ٹکر سے اتنی مدت کے بعد ابھی تک ہم کو سکون و قرار نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ یہاں پر یہ یاد دلانا بیجا نہ ہوگا کہ کسی قوم کو جب تک اس کی قوتِ عمل میں کافی انحطاط اور کمی اور اس کے عام اخلاق و معاشرت میں افسوسناک تنزل نہیں ہوتا محکوم بننے یا پست حالت میں رہنے کی لعنت نصیب نہیں ہوتی۔ اور ہندو تو اپنے عروج کے زمانے میں بھی دنیوی ترقی کے بنیادی اصولوں سے بہت کافی غفلت برت چکے ہیں مگر یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ حالات تبدیل ہونے پر وہ اپنی ہستی قائم رکھنے کی ضروری فکر ہمیشہ کرتے رہے ہیں لیکن اتحادِ باہمی یا قومی تنظیم یا سیاسی دانشمندی کے اصولوں پر کاربند ہونے پر انھوں نے ہمیشہ لاپرواہی برتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ متواتر بیرونی حملوں اور غیر ملکی تہذیب و تمدن کی مسلسل یورشوں کے باوجود اس عظیم الشان ملک میں ابھی تک ہندوؤں کی تعداد غالب ہے، اور بقول شاعر ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

دیانرائن نگم

دسمبر ۱۹۳۳ء

مسلم خیالات میں ایک اہم تبدیلی

زمانہ مارچ ۱۹۱۳ء

اسلامی سلطنتوں پر آج کل مصیبت کی جو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اُن کا اثر نزدیک دور تمام عالم کے مسلمانوں میں نمایاں ہے۔ مذہب اسلام قید زمان و مکان سے ہمیشہ آزاد رہا ہے مسلمانوں کی اخوت اُن کے جمہور پسند مذہب کا ایک جزو اور ضروری جزو ہے۔ اسلام میں حب الوطنی کا درجہ مذہب پرستی سے ہمیشہ دوسرے درجے پر رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندی مسلمانوں نے بھی صدیوں تک رہنے سہنے کے باوجود ہندوستان کو اُس معنے میں اپنا وطن اور اپنا دیس نہیں سمجھا جس میں ہندو ہمیشہ سمجھتے آئے ہیں۔

تعلقات وطن پرستی پر ہمیشہ انھوں نے اپنے عالمگیر مذہب کے حقوق کو ترجیح دی ہے یہ تو پیروان اسلام کی ایک عام دماغی حالت ہے۔ اب اس کے بعد ہمیں برس ادھر مسلمانان ہند کے تعلیم و تربیت پر نگاہ ڈالو تو ہندوؤں کی پولٹیکل تحریکوں سے ان کے علیحدگی کے اسباب صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

انگریزی تعلیم میں وہ ہندو بھائیوں سے پیچھے اور بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ شاہی وقت کا خمار اُن کے طبیعتوں پر باقی تھا۔ سلطنت اودھ وغیرہ کی عیش پرستیوں نے قومی معاشرت کو بگاڑ دیا تھا۔ اور لوگ طبعاً کار زار ہستی کی جد و جہد سے گھبرانے اور آسانی کی زندگی کو محنت و مشقت پر ترجیح دینے لگے تھے۔ نئے حکمرانوں نے ترقی و کامیابی کے جو موقع دیئے ان سے انھوں نے کچھ تو اپنی سستی اور تن آسانی سے اور کچھ تعصب و تنگ خیالی اور کوتہ اندیشی سے فائدہ اٹھانے میں دیر اور بہت دیر کی۔ غدر کے بعد عرصہ تک وہ خصوصیت سے بدگمانی کے شکار رہے۔ مگر مسلمان کیا جیتے جاگتے انسانوں کی کوئی جماعت ہمیشہ تک عضو معطل ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے وہ ترقی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں سے کتنے پیچھے رہے جاتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس قدر پیچھے رہ جانے پر اب حکام وقت کی رضاجوئی کا خیال ہر وقت پیش نظر رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے دوسری طرف حکام بھی نکتہ خیالی سے مسلمانوں کے تالیف قلوب کی فکر میں تھے۔ ملکی حالت کا پورا اندازہ انھیں مل چکا تھا۔ جہانبانی اور حکمرانی کے اصولوں میں وہ پہلے ہی سے

ماہر کامل تھے چند ہی برس میں وہ ہمارے تمام کمزوریوں کے اصلی راز یعنی نفاق باہمی سے واقف ہو گئے۔ غرض اگر مسلمانوں کو ایک سچے لیڈر اور فدائے قوم کی ضرورت تھی تاکہ ان کی حالت کے اصلاح میں ان کو مدد دے تو گورنمنٹ کو بھی ایک خیر خواہ اور مصلحت اندیش مدبر درکار تھا۔ جو مقتضائے وقت کا خود ہی اندازہ کرے جو قوم کی حالت اور گورنمنٹ کی ضرورت کو محسوس کر کے دونوں کے منشا کو پورا کرے۔ جب کوئی اہم کام درپیش ہوا ہے پردۂ غیب سے کوئی نہ کوئی مرد نکل ہی آیا ہے اور اس وقت بھی مسلمانوں میں سر سید احمد خاں جیسا پاک نفس بیدار مغز لیڈر پیدا ہو گیا جس نے مسلمانوں کو نہ صرف اعلیٰ انگریزی تعلیم کے جانب رجوع کیا بلکہ حکام ملک کا بھی انھیں منظور نظر بنا دیا۔ اس وقت سر سید کے تمام خدمات کا مشرح ذکر اور ان کے نتائج کا اندراج بوجہ اس مضمون کے دائرہ سے باہر ہے کیونکہ ہم اُن حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو ہمارے زمانے میں سر سید کی پالیسی بنی تھی اور جن کے بدولت وہ قوم میں ایسی مقبول اور اپنے حصول مدعا میں اس قدر کامیاب ہو گئی۔ اکثر اہل ملک سر سید کو تنگ خیال تصور کرتے ہیں اس لیے کہ اس نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ اکثر لوگ ان کی دور اندیشی اور بالغ نظری پر بھی شک کرتے ہیں اس لیے کہ اُس نے کانگریس کے اعلیٰ مقاصد سے اختلاف کیا اکثر برادران قوم اسے خوشامد پسند اور زمانہ ساز قرار دیتے ہیں کیونکہ اپنی قوم کے لیے اس نے گورنمنٹ کی تائید اور حکام کی تقلید ہی ضروری خیال کی۔ مگر یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ہندوؤں سے اس کے ذاتی تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی وہ بیجا تعصب کے لیے مشہور نہ تھا۔ اپنے کالج کو صوراً اس نے ہندوؤں پر بند نہیں کیا۔ ہندوؤں سے امداد لینے میں بھی اس کو کوئی پس و پیش نہیں ہوا اور ہندو دوستوں کی اس نے کالج میں عزت کی۔ ملازمین میں بھی ہندو مسلمان میں اس نے کوئی فرق نہیں برتا۔ سر سید کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی میں بھی شک بیجا ہوگا۔ کانگریس کے وجود کے قبل وہ خود کانگریس کی بڑے بڑے اصولوں کی پر زور تائید کر چکا تھا۔ وہ بابو سریندر ناتھ بنرجی کے ابتدائی ملکی کوششوں میں شریک ہو چکا تھا بعض ملکی مسائل پر خود اس کی تقریریں پڑھو تو یہ خیال بالکل دور ہو جاتا ہے کہ سر سید ملکی ضروریات سے واقف نہ تھا۔ خوشامد کا الزام بھی ایسا ہی بیجا ہے کیونکہ تمام عمر اس نے کسی ذاتی معاملہ کے متعلق کسی حاکم کی خوشامد نہیں کی۔

ایک دفعہ اس نے لفٹنٹ گورنر صوبہ جات متحدہ سے ملنا اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ انھوں نے صوبہ کے تعلیمی حالات کے متعلق اس کے ایک ایسے واقعاتی بیان کی تردید کر دی جس کا وہ چشم دید شاہد تھا اور جس کا اس نے اپنے دورہ انگلستان کے زمانہ میں اعادہ کیا تھا۔ انگلستان

سے واپسی پر جب سرسید لفٹنٹ گورنر سے ایک عرصہ تک نہ ملے تو ان کے پرائیوٹ سکریٹری نے حضور صوبہ کی طرف سے ایک خط لکھ کر اس کا سبب دریافت کرکے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا۔ مگر سرسید نے اس کا جواب یہ دیا کہ حضور نے میرے بیان کو غلط اور دروغ سمجھا اس لیے میرا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا بالکل فضول اور عبث ہے جو شخص ایسے الفاظ کہنے کی ہمت رکھ سکے خوشامد اس کے خمیر میں نہیں ہو سکتی۔ سرسید کے تمام کارناموں کو غائر نظر سے دیکھو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خوشامد اس کے مزاج میں نہ تھی مذہبی مسائل میں اس کے خیالات بالکل ریڈیکل تھے۔ قرآن کی اس نے جو تفسیر لکھی ہے اس سے اس اندرونی جذبات کا صاف پتہ ملتا ہے۔ کیا کوئی خوشامد پسند شخص اپنی قوم کے مذہبی جذبات سے بے پرواہ ہو کر تمام مسلمانوں کے مخالفت سے بے اثر رہ کر۔ اپنے بادیان دین اور حاملان مذہب کے کفر کے فتووں کو نظر انداز کرکے۔ ایسے دلیرانہ نتائج پر پہونچ سکتا۔ اور پہونچ کر قائم رہ سکتا ہے ہم نے ان غلط خیالات کی تردید اس تفصیل کے ساتھ محض اس لیے کی ہے کہ اکثر اوقات ان کی وجہ سے ہم لوگ ملکی حالت پر غلط قیاسات قائم کر لیتے ہیں جن سے ہم نہ صرف ملکی تحریکوں کی اندرونی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں بلکہ اپنے پولٹیکل مشکلات کبھی کامیابی سے حل نہیں کر سکتے۔ صحیح تشخیص کیے بغیر ملکی امراض کا اصلی معالجہ نہیں ہو سکتا۔ کسی زبردست سے زبردست لیڈر کو خام کار تنگ خیال اور زمانہ ساز کہہ دینا آسان ہے۔ کسی قوم کو متعصب اور خوشامد پسند سمجھ لینا سہل ہے۔ اور اس سے سطحی نظر سے دیکھنے والوں کی فوری تسلی بھی ہو جاتی ہے مگر صورت حال آنکھوں سے ہمیشہ چھپی رہتی اور ملکی مسائل کی عقدہ کشائی دور ہوتی جاتی ہے۔

بہر حال سرسید ایک یگانۂ روزگار مدبر اور سچا فدائے قوم تھا۔ اس کی نظر لمبی تھی مگر مدبری کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی تھیں۔ وہ فلسفی اور ادیب تھا۔ مگر اس سے بھی سوا وہ ایک تجربہ کار مدبر اور باعمل ریفارمر تھا۔ وہ وقت کی ضرورت نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنے برادران ملت کی پستی سے چشم پوشی نہ کر سکتا تھا۔ قوم کو جس حالت میں اس نے پایا اس کا صحیح علاج اس کو تعلیم اور صرف تعلیم میں ملا۔ اور تعلیم ہی کے اشاعت پر اس نے اپنا سارا زور ختم کر دیا۔ تعلیم ہی کے سروسامان مہیا کرنے میں اس نے اپنی زندگی تمام کر دی اسی کا وہ ہو رہا اور اس کے سامنے تمام منصوبے اس نے بالائے طاق رکھ دیئے۔ اس کے سامنے اس نے کل امور ملتوی کر دیئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ فیصلہ نظر بحالات درست نہ تھا۔ گو اس پر عمل اس سے بدرجہا بہتر طریقے سے ہو سکتا تھا۔ گو اس کا عمل درآمد تعصب باہمی پیدا کیے بغیر ہو سکتا تھا۔ مگر ایک پرجوش لیڈر جو سرتاپا ایک ہی خیال میں محو ہو جاتا ہے افراط و تفریط سے کیسے بچ سکتا ہے۔

مسلم خیالات میں ایک اہم تبدیلی

اور سر سید سے بھی قومی جوش میں کانگریس وغیرہ سے علانیہ مخالفت کی زبردست غلطی سرزد ہو گئی۔ ان کو وقت نہ تھا۔ خود نہ شریک ہوتے قوم کو ضرورت نہ تھی۔ وہ اس میں شرکت کی سے صلاح نہ دیتے مگر اس تحریک کا مضحکہ اڑانے کی کیا ضرورت تھی یا اس کے اعلیٰ ترین اصولوں کی مخالفت اور ایسی بیجا سرگرمی سے مخالفت کی کیا حاجت تھی۔ خصوصاً جبکہ انھیں اصولوں کی وہ خود کسی زمانے میں حمایت کر چکے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کانسٹیٹوشن کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے لیے سرکاری مراعات کی خواہش یا حکام وقت کے رویہ کے تقلید کی ضرورت نے انھیں مجبور کر دیا ہو۔ ممکن ہے کہ راجہ شیو پرشاد اور منشی نولکشور کے طرز عمل نے سرسید کے دل و دماغ پر اثر ڈالا ہو۔ جو کچھ ہو سرسید ہی سے ہندو مسلمان کے پولٹیکل نفاق کی بنیاد پڑی۔ حکام نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور قوم نے بھی بدیہی ترقی سے متاثر ہو کر سرسید کے ہر قول و ہر عمل کو شاہراہ ترقی کا ایک سنگ نشان سمجھا۔ اور جانشینان سرسید نے کورانہ تقلید میں قوم کو بھی مات کر دیا۔ یہ اصحاب یہ بھول گئے کہ سرسید انسان تھے اور کوئی انسانی پروگرام مستقبل کی تمام تغیر و تبدل پر حاوی نہیں ہو سکتا ہے اور نہ کوئی خاکہ گرد و پیش کے حالات سے قطع نظر کچھ کام آسکتا ہے۔ جس طرح بچپن کے کپڑے جوانی میں کام نہیں آسکتے اسی طرح زمانہ بے عملی کا دستور العمل ملکی خیالات کے نشو و نما پانے اور تعلیمی ترقی حاصل کرنے کے بعد بیکار بلکہ مضر ہو جاتا ہے مگر لیڈران علیگڈھ جو اب تمام مسلمانان ہند کے مسلمہ پیشوا ہو گئے ہیں۔ اپنی آنکھ بند کیے ہوئے۔ سرسید کے نقش قدم پر نظر جمائے خاموش ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ نواب محسن الملک نے محض حکام کی خوشامد ہی مناسب سمجھی۔ نواب وقار الملک بیشک ایک آزاد خیال اور دلیر لیڈر ہیں ان کا دل و زبان بھی ایک ہے۔ وہ سیاسی امور میں بھی اہل الرائے ہیں۔ آزادی سے غور اور بیباکی سے اظہار خیالات کر سکتے ہیں لیکن مذہبی رنگ ان کی طبیعت پر غلبہ پائے ہوئے ہے۔ علی گڈھ کالج میں ان کا دور مذہبی سرگرمی کا زمانہ رہا۔ حکام میں وہ اپنی راست خیالی اور آزاد پسندی کی وجہ سے ایسے مقبول نہیں ہوئے جیسے کہ پیشرو نواب محسن الملک تھے۔

آزاد خیالی اور صاف گوئی میں وہ سرسید سے بہتر ہیں مگر پولٹیکل خیالات میں ان کا خیال اتنا اونچا اور اتنا دور نہیں جا سکتا۔ دوسری بڑی کمزوری یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بانی ہونے کی حیثیت سے ہندو مسلمانوں کے پولٹیکل اتفاق کی کوئی صورت ہی اُن کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ ایک دفعہ صاف کہہ چکے ہیں کہ سب اغراض متحد ہونے اور کل پروگرام ایک ہو جانے پر بھی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ہو کر اپنی پولٹیکل جدوجہد جاری کرنا چاہیے۔

ہر شخص ایک حد تک جاسکتا ہے اور اس کے آگے نہیں۔ نواب وقار الملک صاحب اپنے تمام قابل عزت اوصاف کے باوجود ہندو مسلمانوں کے پولیٹیکل اتفاق کے امکان کا خیال ہی ذہن میں نہیں لاسکتے۔ ان کے علاوہ جو رہنمایان علیگڈھ ہیں وہ یا تو کالج کے کاموں میں اس قدر منہمک ہیں کہ دوسرے مسائل سوچنے کا ان کو وقت ہی نہیں ملتا یا حکام سے ایسے وابستہ ہیں کہ اپنی آزادانہ رائے رکھتے ہی نہیں اور آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم کے مصداق ہیں۔ ان سب صاحبوں کے دماغ خیالات جدید کے اثرات سے بالکل محفوظ ہیں ان کے دلوں پر ان کا عکس تک نہیں پڑتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو حکام سے سوا قوم کے خیالات تنگ و محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی وقار کے کمی سے کبھی گھبراتے ہیں اور کسی ایسی تحریک میں جس سے ان کے رسوخ ثمر یا دباؤ میں سر مو فرق آئے قطعاً کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ مگر قوم ان کی کب پابند رہ سکتی ہے اور تعلیم کی ترقی اپنا اثر کیے بغیر کب مان سکتی ہے۔ تصنع دوامی قائم نہیں رہ سکتا۔ ملمع کی چمک پائدار نہیں ہوتی۔ تمام ملک میں پولٹیکل خیالات کے نشو و نما نے مسلمانوں کے دماغ کو بھی منور کر دیا۔ کانگریس اور اس کے رہنماؤں کی ملکی خدمتوں نے ملکی ترقی کی شاہراہ تیار کر دی ہے۔ اس کے اعلیٰ اصولوں نے جب حکام وقت تک کو قائل کر دیا تو مسلمان بھائی کا انھیں تسلیم کر لینا کیا تعجب کی بات ہے۔ خدا کی مصلحت میں کس کو دخل ہے برائی سے بھلائی پیدا کر دیتا ہے۔

ایران کی بربادی۔ ترکی کی مصیبت نے ہندی مسلمانوں پر قوموں کے عروج و زوال کا راز ظاہر کر دیا اور اب ملکی اتفاق کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ تعلیم نے ان کے حوصلے بھی بڑھا دیئے ہیں اور اب وہ دوسری قوموں کے ساتھ ملک کے انتہائی ترقی دینے میں اپنا حق ادا کرنے کے لیے مستعد نظر آرہے ہیں۔ گذشتہ کرسمس میں مسلمان بھائیوں کے جو قومی جلسے لکھنؤ میں ہوئے ان سب میں نئی اسپرٹ پورے طور پر نمایاں رہی قوم نے صاف طور پر جتادیا کہ وہ کارزار ہستی میں مردانہ وار جدوجہد کے لیے تیار ہے۔ اب وہ محض اپنے قوت بازو سے اپنا جائز حق لینا چاہتی ہے۔ اب وہ کسی رعایت کے بل پر جینا پسند نہیں کرتی۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں آنریبل مسٹر آفتاب احمد کی اس تجویز کا رد ہونا کہ گورنمنٹ قومی تعلیم کے لیے بڑے بڑے عطیے دینے والے اصحاب کی خطاب وغیرہ سے قدر دانی فرمائے نہایت پر معنی ہے۔ مفت جبری تعلیم کے متعلق اس وقت پریسیڈنٹ جلسہ نے اختلاف رائے کیا تھا مگر اس سے تمام ہال میں ایک جوش سا پھیل گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ یہ آپ کی ذاتی رائے ہے۔ یہ صرف آپ ہی کا بیان ہے۔ جلسہ کو اس سے واسطہ نہیں۔ گورنمنٹ سے طلب امداد کے

متعلق بھی حاضرین کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ غرض پرانے پرانے لوگوں کا جنھوں نے شروع سے آج تک کانفرنس کے کل جلسے دیکھے ہیں۔ بیان ہے کہ خودداری اور حب الوطنی کے ایسی زبردست لہر پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ کے جوش و خروش کا عالم ہی نرالا تھا۔ انتظامی اختیارات گورنمنٹ کے سپرد کرنے کے سب مخالف تھے۔ بعض تقریروں میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں لات مار دینا چاہیئے۔ لیڈروں کو جمہور اسلام سے وعدہ کرنا پڑا کہ وہ گورنمنٹ سے مسلم یونیورسٹی کے متعلق گفتگو کرتے وقت قوم کے عام خیالات کا پورا لحاظ رکھیں گے اور اس میں کسی خوشامد یا خود غرضی کا دخل نہ ہونے دیں گے۔ مسلم لیگ کا جلسہ بھی نہایت اہم تھا آخر کار مسلمانوں نے بھی سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری کو اپنا معیار قائم کر لیا یہی کانگریس کا مقصد و مدعا ہے۔ اب دونوں جماعتوں میں اصولاً کیا فرق رہا۔ اس اہم جلسے کی مفصل کارروائی اخبارات میں درج ہو چکی ہے۔ سب تقریریں بہت آزادی سے ہوئیں۔ ایک نامور اہل الرائے نے تو دولت مند رہنمایان قوم کی طرف سے اشارہ کرکے صاف کہہ دیا کہ اس وقت قوم کے بے ریا خدمت کی ضرورت ہے۔ ہم کو بے غرض

رہنما درکار ہیں جو صفائی اور سچائی سے ملکی ضروریات کی حکام وقت سے وکالت کریں اب وہ زمانہ گیا جب خود پسند خود پرست اور خود غرض لیڈروں کا دور دورہ تھا۔ جب تمام قوم کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ جس راستے پر چاہتے تھے قوم کو ڈال دیتے تھے۔ اب قوم بجائے خود سوچنے سمجھنے لگی ہے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اب وہ طفلی تسلیوں سے نہ مانے گی۔ اب اصل اور نقل میں اُسے فرق معلوم ہو گیا۔ اب جو لیڈر ذاتی اغراض کے بنا پر اُسے دھوکا دینے کی جرأت کریں گے انھیں وہ اس طرح اپنے درمیان سے نکال دیگی جیسے دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینکدی جاتی ہے۔ لیڈر سب سنتے اور سر دھنتے رہے مگر کیا وہ اپنے فرائض ادا کریں گے؟ اس وقت قوم کا نہیں بلکہ لیڈروں کی آزمائش کا وقت ہے قوم تو بیدار ہو چکی۔ اب برسوں کی گہری نیند سوئے ہوئے لیڈروں کے جاگنے کا وقت آگیا ہے۔ کیا یہ اس عہد جدید کے پیام امید کو گھر گھر جا کر سنائیں گے؟ یا اپنے غفلت ہی میں مست رہ کر قوم کو دھوکہ دیتے اور خود دھوکا کھاتے رہیں گے مسلمان بھائیوں سے ہم صرف یہ کہیں گے کہ نئی اسپرٹ سے موثر ہوئے ہیں تو اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔ بلکی خدمت کی اہمیت سمجھیں اور قومی ضروریات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر جو فیصلہ کریں اس پر ہمت واستقلال سے قائم رہیں۔ اور ملکی ترقی کے لیے برادران وطن کے دوش بدوش ہو کر

جدوجہد کریں۔ نمائشی لیڈروں کو چھوڑ کر روشن خیال رہنماؤں کی بھی ان میں کمی نہیں ہے سر آغا خاں۔ آنریبل مسٹر مظہر الحق۔ ڈاکٹر اقبال۔ شمس العلما مولانا شبلی۔ نواب وقار الملک کے ہوتے ہوئے ان کے درمیان قحط الرجال کی شکایت نہیں ہوسکتی یہ وہ لوگ ہیں جن پر اعتماد کر کے مسلمان دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ پھر کیا جرأت اور ہمت اور سچائی کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی ان کا فرض نہیں۔ حالات موافق ہیں قوم تیار ہے آئینی جدوجہد کا سامان موجود ہے۔ خاکہ کھینچا ہوا۔ اور منزل مقصود بھی اب صاف اور واضح ہے۔ اب صرف ایک قدم اور اٹھانے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جب کانگریس اور لیگ کا نصب العین ایک ہے تو پھر ان کے درمیان دوئی کا پردہ کیوں باقی رہے۔ بہتر ہو دونوں یک جان دو قالب ہو گئے مگر اس سے بھی بہتر ہوا اور ملک کے نصیب جاگ اٹھیں اگر دونوں تحریکیں یک جان و یک قالب ہو جائیں فقط

ع تا کس نہ نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

⁘ ⁘ ⁘

کانگریس کے صدارت کا سہرا بھارت ماتا (مادر ہند) کے بہترین فرزندوں ہی کے سر پر بندھا ہے۔ اب تک اس جلیل القدر قومی عہدے کے لیے صرف انھیں بزرگوں کا انتخاب ہوا ہے جو کیا بلحاظ علم و فضل اور کیا باعتبار حق خدمت اور قومی محبت ملک کے چشم و چراغ ہیں۔ انھیں اصحاب کی کوشش اور رہنمائی کی بدولت اب تک کانگریس پروگرام کو اہل ملک کے مشترکہ خیالات اور عام خواہشات کے مطابق ہونے کا بجا دعویٰ رہا ہے۔ اس ملکی تحریک کی تاریخ میں ہر سال نئی قسم کی ضرورتیں اور ذمہ داریاں پیش آتی رہی ہیں ہر دفعہ نئی مشکلات اور نئے خدشوں کا سامنا رہا ہے۔ مگر تائید غیبی کہیے یا کانگریس کی خوش نصیبی سمجھیے کہ اس کے صدارت اور رہبری کی اہم اور نازک خدمت صرف انھیں منتخب بیدار مغز اور با اثر محبان ملک کے سپرد ہوئی ہے جو وقت اور موقع کے لحاظ سے اس اعزاز اور اعتماد کے بہترین طور پر مستحق تھے۔

جنوری سنہ ۱۹۰۸ء دیا نرائن نگم

دیہاتوں کی تنظیم

(زمانہ دسمبر ۱۹۲۶ء)

ہم لوگ بحث مباحثوں میں بڑے مشاق اور لکچر بازیوں میں خوب طاق ہو گئے ہیں چھوٹے چھوٹے معاملے میں لمبی لمبی تقریریں کرنا۔ بال کی کھال نکالنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے۔ ہماری قومی تحریکیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا تمدنی زیادہ تر زبانی داخلے ہیں کانگریس ہو یا سوشل کانفرنس ہندو سبھا ہو یا مسلم لیگ ملکی حقوق کا سوال ہو یا چھوت ادّھار کا کام۔ سب میں ہمارا جوش عارضی ہوتا ہے اور عموماً تقریر بازیوں تک محدود رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کاروباری جلسوں میں بھی بے حد طوالت ہوتی ہے۔ تجارتی کمپنیوں اور بنکوں کی انتظامی کمیٹیوں میں بھی اکثر بات پر بحث مباحثوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے یونیورسٹی کورٹ کے جلسوں میں عموماً ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا لطف رہتا ہے۔

سال بھر میں ملک میں جس قدر کانفرنسیں۔ جلسے اور کمیٹیاں ہوتی ہیں ان کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور قومی ضروریات کا کوئی پہلو باقی نہیں ہے جس پر باقاعدہ جدوجہد شروع نہ کر دی گئی ہو۔ لیکن ہر جگہ قول و عمل کا فرق نمایاں ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت کو عوام الناس سے واقعی جیسا چاہئے ربط نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت اپنے غریب جاہل دور افتادہ اور پسماندہ بھائیوں کے حالات سے واقف تو ضرور ہے لیکن ان کو عوام ملک سے کوئی خاص مس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری جدوجہد سطحی ہے۔ ہماری تقریروں اور دعووں میں عوام الناس کی مہر تصدیق نہیں ہے۔ اور ہماری سیاسی تحریکات کی بنیاد کھوکھلی ہے۔ ہم نے اب تک عوام کی وکالت کا حق تو ادا کیا ہے لیکن ان کی واقعی خدمت کو بھولے رہے ہیں۔ ہمارا روئے سخن یا تو گورنمنٹ کی طرف رہتا ہے یا ملک کے اخبارات کی جانب تحریک نان کوآپریشن نے پہلی مرتبہ عوام الناس کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ملک کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایکبار ہلا دیا مگر سچ پوچھئے تو اس سے بھی عوام میں بے چینی تو پیدا کی لیکن ان کی راحت قلب یا سکون خاطر یا اصلاح و بہبود کا کوئی انتظام نہ کیا۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کر کے اس نے عوام الناس سے ناطہ جوڑا۔ لباس اور وضع میں بھی اس کے حامیوں نے ہمارے افلاس زدہ ملک کی نمایندگی کرنے کی کوشش کی جس سے عوام کو پہلے دفعہ یہ محسوس ہوا کہ ہمارے تعلیم یافتہ محسن ہم سے علیحدہ اور ہم سے بالاتر جماعت نہیں ہیں۔ جیل جانے کی آمادگی سے عوام نان کوآپریٹر اصحاب کو اپنا دوررس اور جفاکش

محب وطن بھی سمجھے گئے۔ لیکن اس میں وہ زیادہ تر دھوکے ہی میں رہے۔ اکثر اصحاب جو اس تحریک کے اہل نہ تھے۔ ذاتی شہرت و عروج کے لحاظ سے اس میں شریک ہو گئے۔ بعضوں نے اس کو وقت کی راگنی سمجھ کر اس کی ہم آہنگی کی۔ غرض ہمارے شامتِ اعمال سے ایک سچے محبِ وطن کے ساتھ صدہا گندم نما جو فروش اصحاب ہو گئے۔ ترکِ تعلیم کے مشورہ کا ایسا مضر اثر ہوا کہ صدہا خام کار و ناتجربہ کار نوجوانوں نے نان کو آپریشن کی حمایت بطور پیشہ اختیار کر لی۔ کھدر سے وہی فائدہ اٹھایا گیا جو ملک کے پیشہ ور سادھو اپنے جوگی نہ لباس سے روزمرہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ انھیں کثیر التعداد نا اہل اصحاب کی وجہ سے ہماری پبلک لائف میں اس قدر تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر سنجیدہ تحریکوں میں خوگیر کی بھرتی سے کبھی تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اب عوام حقیقت حال سے واقف ہو رہے ہیں اور ان میں نام نہاد نان کو آپریٹر اصحاب یا سوا رجسٹ حضرات سے بھی بداعتقادی ہو رہی ہے عام چند دن کا جو استعمال بیجا ہوا۔ اسمبلی اور کونسلوں میں جن ترکیبوں سے ووٹ حاصل کیے گئے ان کی وجہ سے عوام میں بدظنی پھیل رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو عوام کی تنظیم۔ عوام کی تعلیم عوام کی اصلاح و بہبود کے لیے ہم نے کیا خدمت کی ہے شہروں اور دیہاتوں میں اب بھی وہی بُعد ہے۔ ووٹ یا چندہ مانگنے کے سوا ہمارے محبانِ وطن اور کب دیہاتوں کا دورہ کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی لالہ لاجپت رائے اور دو ایک اصحاب کے علاوہ دیگر رہنمایان ملک عوام الناس کا ذکر زبان پر تو لاتے ہیں لیکن دل میں واقعی کب انکا دھیان رکھتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے صاحب نے حال میں ایک سلسلہ مضامین لکھ کر دیہاتوں کی تنظیم کی طرف اہل ملک کی توجہ مبذول کی ہے۔ بقول ان کے اگر ہم اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ آزادی آسمان سے ٹپک نہ پڑے گی۔ اس کے لیے مسلسل اور باقاعدہ کام کرنا ہوگا اس کے لیے ادنےٰ طبقے کو تیار کرنا ہوگا۔ عوام الناس میں سیاسی جذبہ پیدا کرنا ہوگا ان کی زندگی بہتر بنانا ہوگی۔ ان کی روزمرہ کی کشمکش کو دور کرنا ہوگا اور ان سے ربط پیدا کرنا پڑے گا۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حکمراں ہمارے مطالبات منظور کرنے پر مجبور ہوں تو ہم کو یہ انتظام کرنا چاہیے کہ ہماری آواز صدا بہ صحرا نہ سمجھی جا سکی بلکہ اس کی گونج دور افتادہ دیہاتوں میں سن پڑے۔

ہندوستان کی اصلی آبادی دیہاتوں میں سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہے تعلیم سے وہ بے بہرہ پیٹ بھر روٹی تو اس کو کھانے کو ملتی نہیں ہے۔ ملکی ترقی کا اسے کیا حوصلہ ہو سکتا ہے۔ روزمرہ تردّدات ہی سے اسے فرصت نہیں ہے۔ بڑے بڑے مسائل سے کیا دلچسپی ہو۔ زمینداروں ساہوکاروں پولیس اور تحصیل کے اہلکاروں ہی سے اس کو نجات نہیں غیر ملکی حکومت کے اہم مسائل کی طرف اسے کیا رجحان ہو۔ تعلیم یافتہ محبانِ وطن کو اس سے اب بھی کچھ زیادہ واسطہ نہیں ہے۔ بنگال میں دیہاتوں کی تنظیم کے لیے مسٹر داس نے کچھ فنڈ اکٹھا کیا تھا۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب اسپنرس ایسوسی ایشن کے ذریعہ مہاتما جی اہلِ دیہات کی خدمت کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا اثر محدود رہے گا ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک . . . . .

کی خدمت کا مرکز شہروں سے ہٹا کر دیہاتوں میں قائم کیا جائے۔ ہمارے سوراجی بھائی "عدم تعاون" جوابی تعاون" اور "باعزت تعاون" پر لڑ رہے ہیں۔ کونسلوں کو زہر قاتل قرار دے کر پھر اسی کو شیر مادر سمجھ رہے ہیں۔ اس کے لیے ہمارے لبرل مدبران ہی کیا کم موزوں تھے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ نام خواہ آپ کچھ رکھیں کونسلوں میں پروگرام وہی ہوگا جس پر لبرل اصحاب عرصہ دراز سے عمل پیرا ہیں۔ ملک کی حقیقی خدمت کرنے کے لیے ہمارے احباب کو کونسل میں جانے کی خواہ مخواہ ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے عیسائی مشنری کی طرح ہم کو زندگیاں وقف کرنا ہوں گی۔ شہروں کے عافیت کدوں کو چھوڑ کر دیہات کی جھونپڑیوں میں رہنا ہوگا۔ دیہاتی بھائیوں کی شادی غمی میں شریک ہونا ہوگا۔ ان کے ساتھ رہ کر ان کی روزمرہ ہر وقت امداد و رہنمائی کرنا ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام اہم اور مشکل ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ مسئلہ نہایت وسیع ہے تین لاکھ دیہاتوں کی تنظیم کا سوال کوئی معمولی سوال نہیں ہے لیکن اب وقت ہے کہ اس ضروری کام کی طرف ہمارے محبان وطن متوجہ ہوں۔ اگر آئندہ دس سال کے اندر ہم ایک لاکھ مواضعات کی بھی تنظیم کر سکیں تو ملکی ترقی کے راستے خود بخود کشادہ ہو جائیں گے۔ پنڈت موتی لال صاحب کے ملکی مطالبات کے پس پشت عوام کی طاقت کا ذکر فرماتے ہیں۔ مگر محض سول نافرمانی کی دھمکیوں سے یہ طاقت حاصل نہ ہوگی۔ اس کے لیے سالہا سال صبر و سکون اور استقلال کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہم کو سرمایہ اور کارکن دونوں کثیر مقدار میں درکار ہوں گے۔ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے انجمن خادمان ہند قائم کر کے ملک پر احسان عظیم کیا تھا۔ اس انجمن نے اچھے اچھے ممبران کونسل پیدا کیے ہیں اب ضرورت ہے کہ دیہاتی بھائیوں کی امداد و اصلاح تعلیم و ترقی کے لیے ایک "سیوک منڈل" قائم کیا جائے۔

اب ضرورت ہے کہ لالہ لاجپت رائے کے خاکے کے بموجب دیہاتوں کی تنظیم کا کام ہاتھ میں لیا جائے۔ ہمارے سوراجی بھائی آپس میں لڑ رہے ہیں اور جب انھیں خانگی تنازعوں سے فرصت ملتی تو لبرل اور دیگر طبقوں کو بدنام و پریشان کرنے میں وقت صرف ہوتا تھا۔ واقعات سے انکار فضول ہے ہر شخص ہر کام کے لائق نہیں ہوتا۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

اس میں رشک و رقابت فضول ہے۔ ملکی خدمت کے ذرایع اور وسائل اس قدر وسیع ہیں کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے بہی خواہ ملک اور ہر فرزند مادر ہند کے لیے اس میں بخوبی گنجائش ہے۔ پھر کیوں نہ تقسیم کار کے اصول پر عملدرآمد کیا جائے۔ مقتضائے وقت کے خیال، کام کی اہمیت کے لحاظ اور ملک کی عظمت کے نام پر نان کوآپریٹر، سوراجی اور لبرل کی تفریق کم سے کم برائے چندے عملی حیثیت سے قطعی اٹھا دی جائے۔ سوراج حاصل ہونے پر یہ تفریقیں اور فرقہ بندیاں حق بجانب ہوں گی۔ ابھی ان کا وجود

جشن نگم صد سالہ

بالکل قبل از وقت ہے۔ کیوں نہ ہم ملکی ضروریات اور ہر شخص کی ذاتی قابلیت کی بنیاد پہ اپنے کارکنوں کی جماعت بندی کریں؟ جو لوگ دیہاتوں میں کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ دیہاتوں کی [illegible] ہاتھ میں لیں۔ جو لوگ صرف شہروں میں رہ کر خدمت انجام دے سکیں [illegible] شہروں [illegible] جو لوگ کونسلوں کے قائل ہوں اور اس میں اعتقاد رکھتے ہوں ان کو بلا تعصب [illegible] میں ملکی جد و جہد جاری رکھنے کی خدمت سپرد کی جائے۔ ایک دوسرے کو گرانے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے بجائے سب سے لیاقت کے موافق کام لیا جائے۔ کانگریس اس وقت صرف ایک پارٹی کے ہاتھ میں ہو گئی ہے اس ذلت سے اس کو نکالا جائے۔ اور اس کو صحیح قائم مقام ملک بنایا جائے جس میں ہر پارٹی کے لیے پوری گنجائش ہو۔ فرضی اختلافات اور خیالی تفرقات کو نظر انداز کر کے اتفاقات اور موجودہ حالات سے واسطہ رکھا جائے۔ تحریک نان کوآپریشن کے حامیان دیہاتوں میں کام کریں۔ لبرل جوابی تعاون کے قائل سوراجی اصحاب کونسلوں میں کام کریں۔ کانگریس کے اجلاس میں ہر سال دونوں ایک دوسرے کو امداد دینے اور ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے جمع ہوں کھدر پہ اس قدر زور نہ دیا جائے۔ بلکہ کام سے واسطہ رکھا جائے۔ چرخے کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اور گھریلو صنعت و حرفت ہو سکے تو اس کو بھی ترقی دی جائے۔ بہر حال کام کا دستور العمل وسیع النظری سے بنایا جائے اور اس میں تعصبات و توہمات کو دخل نہ دیا جائے۔ لالہ لاجپت رائے نے جو خاکہ تیار کیا ہے وہ بہت کچھ عملدرآمد کے قابل ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ملک کی خدمت کرنے کا جو حوصلہ پیدا ہو چلا ہے ان کی بہت بڑی تعداد اس وقت بیکاری کا بھی شکار ہے۔ کیا ان سے معمولی معاوضے پر دیہاتوں کی تنظیم کے سلسلے میں خدمت نہیں لی جا سکتی ہے؟

کیا ہمارے محبان وطن اس اہم مسئلہ پر اپنی پوری توجہ سے غور کریں گے۔ قومی زندگی کے شیرازہ بندی کے لیے اس توجہ فرمائی کی اشد ضرورت ہے۔

٭ ٭ ٭

تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، آنے والے دور میں کوئی قوم جو عورتوں کے لیے تعلیم و ترقی کے پورے ذرائع بہم نہیں پہونچائے گی ترقی کے میدان میں نظر نہیں آئے گی۔ اس بارے میں ہم کو اپنی معاشرت میں اہم تبدیلی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نئے آئین میں عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق ملنے والے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ تنزلی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ملک کی نصف آبادی ہمارے مشاغل و ضروریات میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتی ہے۔

دیا نرائن نگم

دسمبر ۱۹۲۷ء

ہندوستانی زبان کی ترقی

(زمانہ دسمبر ۱۹۲۵ء)

ہمارے تمام ملکی مسائل کی طرح دیسی زبانوں کی ترقی کا مسئلہ بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے اور اس میں بھی واقعات سے انکار یا چشم پوشی فضول ہے۔ اس وقت تک تمام ملک کی کوئی ایک زبان نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ ہندوستانی زبان جس کو حامیان ہندی اور طرفدارانِ اردو کہتے ہیں کہ وسیع ملک کے ایک بڑے وسیع حصے میں سمجھی جاتی ہے۔ لیکن کانگریس یا اس قبیل کے دیگر مشترکہ جلسوں میں جہاں ہر حصۂ ملک کے قائم مقام جمع ہوتے ہیں اگر کسی عام فہم زبان میں باقاعدہ تقریر کی جاسکتی ہے۔ تو وہ انگریزی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہے گی۔ اور کیا عجب ہے کہ ہمیں انگریزی کو وہ جگہ دینی پڑی جو دول یورپ کو سیاسی حیثیت سے فرانسیسی زبان کو دینا پڑی ہے۔ یورپ میں اسپرانٹو کو عوام کی مشترکہ زبان بنانے کی بھی کوشش ہورہی ہے۔ ممکن ہے اس کوشش کی تقلید یا اس کا تتبع ہندوستان میں کسی وقت کیا جائے۔ مگر یہ مسئلہ اس وقت عملی سیاسیات سے خارج ہے بہرحال میری رائے میں ہندی اردو زبانوں کی باہمی کشمکش عبث ہے بنگالی، گجراتی، تامل، مرہٹی، پنجابی وغیرہ زبانوں میں جو ترقی ہوچکی ہے اور ہورہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے امید نہیں ہے کہ ملک میں کسی ایک زبان کا تنہا دور دورہ ہو۔ درحقیقت بالائی ہند یا ہندوستان خاص میں بھی ہندی اردو کی رقابت فضول تضیع اوقات ہے۔ ہندی رسم الخط کی برتری کا میں قائل ہوں۔ اردو حروف غیرملکی اور مقابلتًہ ناقص ہیں۔ مگر ہندو مسلمانوں کے قومی جذبات دونوں رسم الخط کو فنا نہیں ہونے دیں گے مجھے معلوم ہے کہ ہندی حروف بعض صوبوں میں مقبول ہورہے ہیں اور بعض دیسی زبانیں ہندی میں لکھی جانے لگی ہیں لیکن اردو زبان کے قدرشناسان سے فارسی رسم الخط کے ترک کی توقع رکھنا عملی سیاست نہیں ہے۔ اردو زبان میں جس قدر فارسی اور عربی الفاظ داخل ہوگئے ہیں ان کی وجہ سے اسکے طرز تحریر کی تبدیلی مشکل بھی ہے۔ اس لیے اردو، ہندی کے حامیوں کی زبانی جنگ جدل نہ صرف بیکار بلکہ دونوں زبانوں کی ترقی میں سنگ راہ ہے۔ اور اس سے ہندو مسلمانوں میں خواہ مخواہ کی ایک درجہ مخالفت پیدا ہوگئی ہے۔

دونوں زبانوں میں بہت کچھ مماثلت ہے بول چال میں بھی دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو بہت ہی خفیف اور قابل نظر انداز ہے۔ مگر دونوں کو ملانے یا دو کے بجائے صرف ایک زبان کو باقی رکھنے کے خیال اور کوشش کا نتیجہ معکوس ہورہا ہے۔ ایک طرف اردو میں نامانوس عربی فارسی لفظوں ترکیبوں

محاوروں کی بھرتی ہو رہی ہے۔ دوسری طرف ہندی بھاشا میں زیادتی کے ساتھ سنسکرت کے ادبی الفاظ داخل کیے جا رہے ہیں۔ تحریری زبان عوام کے لیے روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوگا، دونوں زبانوں کے توسیع ترقی میں ہرج واقع ہوگا۔ اردو ہندی لٹریچر عوام الناس کے لیے روز بروز مشکل ہوتا جائیگا اردو میں شکریہ کی جگہ "تشکر" معافی یا معذرت کی جگہ "اعتذار" اور اسی طرح صدہا بلکہ ہزارہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، کا استعمال ترقی پر ہے ہندی کو بھی روز مرہ دقیق بنایا جا رہا ہے۔ ان کوششوں کے باقاعدہ تدارک کی ضرورت ہے۔ دونوں زبانوں میں قدرتاً جس قدر اتحاد ہے اس کو باقی رکھنا ہمارا ملکی فرض ہے۔ ہر زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ جہانتک ممکن ہو وہ سلیس اور عام فہم ہو۔ سائینٹفک اور اصطلاحی الفاظ کے ترجموں میں بھی ہم کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئیے کہ خواہ مخواہ غیر مانوس عربی، فارسی اصطلاحات کی بھرتی نہ ہو ہم کو انگریزی اصطلاحات سے بھی، ان کو آپریشن کی حاجت نہیں ہے اسکول۔ اسٹول، اسٹیشن وغیرہ جو الفاظ اردو ہندی میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کے بجائے اب دوسرے لفظوں کی تلاش فضول ہے۔ آکسیجن یا ہائیڈروجن کی طرح جو الفاظ اب بھی آسانی سے جذب کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی جگہ پر ان سے زیادہ غیر مانوس عربی الفاظ رائج کرنے کا خیال خام ہے۔ ہم کو زبان کی توسیع و ترقی کے مسئلہ کو عملی حسن تدبیر کے لحاظ سے حل کرنا چاہئیے۔ ہمارے ذرائع و وسائل محدود ہیں۔ ہم کو انھیں فضول کوششوں میں رائیگاں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اردو ہندی دونوں کی توسیع و ترقی میں ابھی اس قدر کام کرنا باقی ہے کہ ہم کو نہ تو آپس میں لڑنے کا وقت ہے اور نہ اس کی حاجت نا ممکن الحصول تکمیل اور خیالی تحریکوں میں بھی پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلم واقعات کو تسلیم کر کے ہم کو اپنے کام میں مصروف ہونا چاہئیے۔ اور اس میں ہر ممکن ذریعہ سے فائدہ اٹھانا چاہئیے۔

اس میدان میں گورنمنٹ و عوام دونوں کی مشترکہ کوشش کی ضرورت ہے۔ سچ پوچھئے تو ابھی تک نہ تو اہل ملک اور نہ گورنمنٹ نے اس جانب پوری کوشش کی ہے۔ حکومت نے اب تک اپنا کام امن و امان کے ساتھ چلانے ہی تک اپنی توجہ محدود رکھی ہے۔ ہمارے علمی دماغی ترقی یا قومی بہبودی کی جیسی چاہئیے کوشش نہیں کی گئی ہے۔ تعلیم بھی جس قدر ہم کو دی گئی ہے وہ زیادہ تر سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی ضروریات کے خیال سے۔ اب کچھ دنوں سے دیسی زبانوں میں اعلےٰ ترین تعلیم دینے کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔

اس مد میں سب سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی نے قدم بڑھایا ہے۔ گورنمنٹ نظام نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کورس کی تیاری کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے اور دو تین سال میں بہت سی ضروری کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

کلکتہ۔ الہ آباد۔ لکھنؤ وغیرہ کی یونیورسٹیوں نے دیسی زبانوں کو اپنے نصاب تعلیم میں جگہ دی ہے اور بنگالی اردو ہندی کے اعلےٰ تعلیم کا انتظام کیا ہے۔

صوبہ آگرہ و اودھ کے بورڈ آف ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن نے بھی اپنے امتحانات کے لیے دیسی زبانوں کے استعمال کی اجازت دیدی ہے۔ یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ دس پندرہ سال کے اندر ہمارے نوجوان ہندوستانی زبان ہی میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کر سکیں تو ہم کو صوبے کی زبانوں کو انتہائی ترقی کی پوری کوشش کرنا ہوگی اگرچہ پرچارنی سبھا اور انجمن ترقی اردو اپنے اپنے طور پر مفید کام کر رہی ہیں مگر اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر ادبی ترقی کی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے کیوں نہ صوبہ کی گورنمنٹ اور اہلِ ملک دونوں اپنے اپنے طور پر دیسی زبانوں کی ترقی و تکمیل کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ کیوں نہ صوبہ آگرہ اودھ میں ہمارے قانونی کونسل کے ممبران گورنمنٹ کی امداد سے ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اور اردو ہندی کی ادبی ترقی کو اپنے ذمہ لیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ محبانِ وطن کو ہندی اردو کے باہمی رقابت میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور دونوں میں سے کوئی کسی کی ترقی سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اس ہندوستانی اکیڈمی کے ذمہ دونوں زبانوں کی توسیع و تکمیل کی خدمت ضرور ہونا چاہیئے۔ ملک و صوبہ کے قابل انشا پردازوں و سرپرستوں کو اس اکیڈمی کی سرپرستی و نگرانی میں ادبی خدمت کا پورا موقعہ دیا جائے۔ ہر مضمون پر معقول معاوضہ دیکر کتابیں تصنیف کرائی جائیں دیگر زبانوں کے قابل قدر سرمایہ کو اردو ہندی میں منتقل کیا جائے بچوں کے لیے لٹریچر تیار کرایا جائے۔ لغات انسائیکلوپیڈیا یا فرہنگ اصطلاحات۔ ہر شعبہ کی فہرست کتب وغیرہ کی ترتیب و تدوین کی جائے۔ غرض ہر صیغہ اور ہر صنف میں ادبی ترقی کا سامان مہیا کیا جائے۔ مناسب معاوضے دیئے جائیں انعامات مقرر ہوں معقول تنخواہ دار عملہ رکھا جائے تاکہ قابل و تعلیم یافتہ حضرات ادبی ترقی میں مصروف ہو سکیں۔ ادبی خدمت بھی پیشہ کی حیثیت سے اختیار کی جا سکے اور دیسی زبانوں کے ترقی کا بڑے پیمانہ پر بند و بست شروع ہو جائے۔

پنجاب کی قانونی کونسل میں راجہ نریندر ناتھ صاحب نے لوکل گورنمنٹ سے اس غرض کے لیے کئی لاکھ روپے کے عطیے کی تحریک کی ہے۔ بہار گورنمنٹ نے دیسی زبانوں کی ترقی کے مسئلہ پر غور کرنے کے واسطے سر علی امام صاحب کے زیر صدارت ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ پنجاب گورنمنٹ ہر سال اردو۔ ہندی پنجابی زبان کی بہترین مطبوعات کیلئے بیش قدر انعامات دیتی ہے صوبہ آگرہ و اودھ میں بھی کسی وقت اس قسم کے انعامات دیئے جاتے تھے مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں گورنمنٹ نے کئی انعامات دیئے تھے۔ لیکن اب عرصہ دراز سے ہماری لوکل گورنمنٹ دیسی زبانوں کی ترقی سے بے نیاز ہے حالانکہ صنعت و حرفت کی ترقی اور شہروں کے اصلاح کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت اہم ہے اور اس پر گورنمنٹ اور محبانِ وطن دونوں کی فوری توجہ ہونا چاہیئے۔ پنڈت پگ نرائن اپادھیا۔ ایم۔ ایل سی وکیل بنارس نے کونسل میں گورنمنٹ سے اس غرض کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ عطیہ دینے کی تحریک کا نوٹس دیا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہماری دیگر ممبران کونسل اس تحریک کی پر زور تائید کریں۔

بہتر ہے کہ ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ کی سرپرستی میں جو حسن اتفاق سے خود بھی ایک زبردست عالم فاضل اور بڑے علم دوست افسر ہے صوبہ کے نامی گرامی اصحاب کی جن کو دیسی زبانوں کی ترقی سے دلچسپی ہو، ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس کانفرنس میں مجوزہ بالا ہندوستانی اکیڈمی کے قیام کے متعلق مشورہ کیا جائے صاحب وزیر تعلیمات اس کے صدر ہوں اور تعلیمی سبجکٹ سے اس کی معقول مالی امداد نیز امیں محبان وطن سے بھی مالی اعانت کی درخواست کی جائے۔ ہمارے صوبہ میں مہاراجہ صاحب بنارس اور نواب صاحب رام پور بیگم صاحبہ بھوپال کی علمی فیاضیاں ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد راجہ رام پال سنگھ صاحب وغیرہ روسا رہ مفید ملک تحریکات کی امداد فرماتے رہتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے فیاض طبع روسا ہندوستانی اکیڈمی کی بھی امداد نہ فرمائیں۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے لکھنؤ یونیورسٹی کے کنووکیشن میں بجا طور پر اردو کی ترقی کی طرف بھی صوبہ کی توجہ مبذول فرمائی ہے بابو شیو پرشاد گپتا رئیس بنارس ہندی کے لیے ہزار ہا روپے ماہوار صرف کرتے رہتے ہیں۔ اور بھی اصحاب ہیں جو ہندی اردو کے شیدائی ہیں اور ان کی ترقی میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں۔ پھر کیوں نہ ان سب کی ایک باضابطہ کانفرنس طلب کی جائے۔ کیوں نہ ایک باقاعدہ کمیٹی ہندوستانی اکیڈمی کو چلانے اور کامیاب بنانے کے لیے مرتب کی جائے۔ رہنمایانِ صوبہ۔ افسران گورنمنٹ خصوصاً صاحب وزیر تعلیمات صوبہ سے میری استدعا ہے کہ وہ اس ضروری قومی خدمت کی طرف متوجہ ہوں۔

اس اکیڈمی کے قائم ہونے پر بھی خالص غیر سرکاری علمی انجمنوں کی ضرورت باقی رہے گی علمی ترقی کی جدوجہد کے سلسلے میں بہت سی ضروریات بھی ہیں جو اکیڈمی کے قائم ہونے کے بعد بھی ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن ترقی اردو کے لیے پوری کرنے کو باقی رہ جائیں گی۔

اردو اور ہندی دونوں میں بعض مستحقین کو جنھوں نے اپنی زندگیاں ملک کی ادبی خدمت میں صرف کردی ہیں لیکن اب بے یار و مددگار ہیں پنشن دینے کی ضرورت ہے اس سے نوجوان کارکنوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوگی۔

روسار ملک و والیان ریاست کی امداد سے مستحق اہل قلم کی امداد و سرپرستی کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اعلی حضرت نظام بعض انشا پردازوں کی قدردانی فرما رہے ہیں لیکن بہت سے مستحقین اب بھی محروم ہیں۔ اور رہیں گے۔ اگر کوئی اکیڈمی یا کوئی انجمن ان اصحاب کی سرپرستی اپنے ذمے لے سکے تو ہمارے سرمایہ ادب میں غیر معمولی ترقی کا خود بخود سامان ہو جائے۔

ملک میں اچھے پریسوں کی قائمی میں بھی ہمارے غیر سرکاری انجمنیں بہت کچھ مدد دے سکتی ہیں سرکاری

صیغہ صنعت و حرفت سے نئے پریسوں کو قرضہ جات دینے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ سررشتہ تعلیم کو ہر اسکول میں اردو ہندی لائبریری کے قائم پر زور دینا چاہئے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لیے مضمون نویسی کے مقابلے قائم ہونا چاہئے۔ ہر مدرسہ میں خوشخطی اور زود نویسی دونوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی انعامات مقرر ہونا چاہئے۔ انعامی کتابوں میں اردو ہندی کتابیں بھی مناسب تعداد میں شامل کی جائیں۔ ہر اسکول کے لیے منتخب اردو ہندی کے ادبی رسالوں کی خریداری لازمی قرار دی جائے۔

اردو چھپائی میں ٹائپ کے رواج دینے کی اشد ضرورت ہے۔ سرسید مرحوم نے اس کے متعلق کچھ کوشش کی تھی۔ ان کے وقت میں بعض کتابیں ٹائپ میں شائع بھی ہوئیں۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی گزٹ اب بھی ٹائپ ہی میں چھپتا ہے۔ مولانا محمد علی نے بھی اپنے روزنامہ ہمدرد کو پہلے ٹائپ میں جاری کیا تھا مگر اب وہ بھی لیتھو میں چھپ رہا ہے۔ منشی کشن نرائن بھارگو مرحوم مالک مطبع نولکشور نے ایک مرتبہ راقم الحروف سے اپنے مطبع میں اردو ٹائپ جاری کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن ان کی بے وقت وفات نے اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہ دیا۔ اب اس کا رواج اعلیٰ حضرت نظام دکن کی شاہانہ امداد سے ممکن ہے۔ ٹائپ کے رواج کے بغیر اردو کی قرار واقعی ترقی ممکن نہیں ہے۔

ہندوستانی اکیڈمی۔ اور اگر اکیڈمی سے ممکن نہ ہو تو ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن اردو قابل قدر اردو ہندی کتابوں کے فروخت کا بھی بندوبست کر سکتی ہیں۔ ابھی اگر کوئی مصنف مرعوب کر کوئی کتاب چھپواتا ہے تو اس کے فروخت کرنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ ایک یا دو کتابوں کے لیے نہ اشتہارات ہی کافی دیئے جا سکتے ہیں اور نہ کوئی شخص نجی طور پر فروخت کا معقول انتظام کر سکتا ہے۔ ناگری سبھا اور انجمن اردو ہر عمدہ تصنیف و تالیف و ترجمہ وغیرہ کو کچھ منافع دے کر مصنفین و مؤلفین سے خرید لیا کریں بہت سی کتابوں کے فروخت کا یکجائی بندوبست نسبتاً آسان ہے ایک کاروباری صیغہ کھولا جا سکتا ہے جس کے تحت ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا سکتی ہیں۔ موجودہ کتب فروشوں سے بھی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح مادی ترقی کے متعلق وقتاً فوقتاً تحقیقاتیں اور پیمائشیں ہوتی رہتی ہیں اسی طرح انجمن ترقی اردو اور ناگری پرچارنی سبھا کو بھی اہل ملک یا اہل صوبہ کے علمی مذاق کی باقاعدہ تحقیقات کرنا چاہئے۔ اگر مکمل طور پر نہیں تو بہت بڑی حد تک اس بات کی جانچ ہو سکتی ہے کہ صوبہ میں کتنے اصحاب دیسی زبانوں کی مختلف کتابوں کی خریداری کر سکتے ہیں۔ ایک فہرست ایسے صاحبوں کی بنائی جا سکتی ہے جنکو تاریخی کتب سے دلچسپی ہے۔ ایک فہرست افسانوں کے شائقین کی مرتب ہو سکتی ہے۔ ایک دوسری فہرست شعر و سخن کے قدردانوں کی بنائی جائے۔ غرض اس طرح مختلف شعبوں کے قدر شناسوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور مختلف شعبوں کے قدردانوں سے نئے مطبوعات کی خریداری کی تحریک ہو سکتی ہے اس انتظام میں پہلے ضرور کچھ مصارف اور محنت کرنا ہوگی۔ لیکن اشاعت کتب میں اس سے غیر معمولی مدد ملے گی۔

اسی طرح اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کو حامیان اردو ہندی اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ ہندی اردو میں مشاعرے اور کوی سمیلن بہ کثرت ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے اور باقاعدہ جد و جہد کا بہت ہی خاطر خواہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔
کیا آنریبل وزیر تعلیم صوبہ و دیگر بہی خواہان ملک اور حامیان اردو ہندی ہندوستانی زبان کی ترقی کے اہم مسئلہ پر توجہ فرمائیں گے؟ حکام و رہنمایان ملک دونوں کا اخلاقی فرض ہے کہ ہماری دماغی ترقی کی انتہائی کوشش کریں۔

✣ ✣ ✣

محض کانفرنسیں منعقد کرنے اور رد و کد و غور و فکر کے بعد چند رزولیوشن پاس کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ کانفرنسیں کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں، رزولیوشن کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں جب تک ہم لوگ فرداً فرداً اپنی ذاتی ذمہ داریاں محسوس نہ کریں گے، جب تک ہم میں ہر شخص قومی فلاح و بہبودی کی خاطر کچھ نہ کچھ قربانی پر تیار نہ ہوگا، جب تک ہر رکن قوم باہمی صلاح و مشورہ کی وقعت قائم رکھنے کا تہیہ نہ کرے گا، جب تک ہر شخص قومی رہنماؤں اور قومی جلسوں کا احترام کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرلے گا، جب تک ہر ممبر مقتضائے وقت کے بموجب ذاتی حیثیت سے اصلاح کے کام کو آگے بڑھانے پر مستعد نہ ہو جائے گا، اس وقت تک ہرگز ہرگز بہی خواہان ملک اور خیر خواہان قوم کا اصل مقصد و مدعا حاصل نہ ہوگا۔

دیانرائن نگم
دسمبر ۱۹۲۳ء

پورا وقار اور اثر حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی اخبارات کو بھی اپنی حالت درست کرنا پڑے گی۔ رفاہ عام کے مقصد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا ہوگا۔ عام بہبودی کا خیال مقدم رکھنا ہوگا۔ فرقہ وارانہ نقطۂ خیال کو معدوم کرنا ہوگا اور اخبارات کو صوبہ کے مفاد کا سچا محافظ اور رائے عامہ کا صحیح ترجمان بنانا ہوگا۔ اس لیے ہماری تحریروں اور ہمارے خیالات میں ان تمام ذمہ داریوں کا اثر نمایاں ہونا چاہیے۔ جو ایک خود دار اور خود مختار قوم کے اخبارات کے لیے لازمی ہیں۔
ابھی تک اردو ہندی پریس پر فرقہ وارانہ ذہنیت غالب ہے، مگر اب اس تنگ نظری کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا۔ اس لیے ہم اخبار نویسوں کو تعصب و تنگ دلی کی پالیسی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا چاہیے۔

دیانرائن نگم
اپریل سنہ ۱۹۱۰ء

ہندوستانی اکیڈمی

(زمانہ فروری ۱۹۲۸ء)

ہندوستانی اکیڈمی قائم کر کے گورنمنٹ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ نے اردو ہندی علم ادب کی توسیع و ترقی کے لیے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کے مادی ترقی کے تو بہت سے سامان مہیا کیے ہیں لیکن ملک کی اخلاقی اور ذہنی ترقی کے لیے ایک عرصہ دراز کے بعد یہ پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ ہندوستانی لٹریچر کی ترقی کا بند و بست کر کے ہز ایکسیلنسی سر ولیم میرس گورنر اور رائے راجیشور بلی صاحب وزیر تعلیم صوبہ متحدہ نے ملک کی آئندہ نسلوں پر جو احسان عظیم کیا ہے اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قاعدہ سے کام ہوا تو عنقریب ہی اس کا مفید اثر عام طور پر محسوس ہونے لگے گا۔

ناظرین زمانہ کو یاد ہوگا کہ دسمبر ۱۹۲۶ء کے قومی نمبر زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی کی تاسیس کے متعلق ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ سے اپیل کی گئی تھی اور اس کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ شکر ہے کہ سر ولیم میرس کی علم پروری اور ادب نوازی کے بدولت یہ خاکہ خفیف تبدیلیوں کے بعد امر واقعہ ہو گیا ہے۔ اس طرح گورنمنٹ نے تو اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ عہدہ داران و اراکین اکیڈمی اپنے فرائض سے کس طرح سبکدوش ہوتے ہیں۔ دنیا کے قریب قریب ہر مہذب ملک میں حکومت وقت کے سرپرستی میں اس قسم کی علمی انجمنیں علوم و فنون کی ترقی میں غیر معمولی حصہ لے رہی ہیں۔ قبل اس کے کہ ان انجمنوں میں سے بعض کا حال بیان کیا جائے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی نام کی موزونیت پر چند سطریں لکھنا بیجا نہ ہوگا۔ تمام ملک میں جس خطہ کا اصلی نام ہندوستان ہے وہ درحقیقت ہمارے صوبہ متحدہ ہی کا ایک حصہ ہے جس میں کسی وقت دہلی کا شہر و صوبہ بھی شامل تھا لیکن سلطنت برطانیہ نے اپنا عمل دخل ہوتے ہی اس کو اس حصہ ملک سے نکال لیا ہے۔ تاہم عرف عام میں دہلی ہندوستان خاص ہی کا ایک جزو شمار ہوتا ہے اور جو زبان اس خطہ میں رائج ہے اس کو ہندوستانی کہتے ہیں۔

تحریر میں ہندوستانی زبان نے دو صورتیں اختیار کیں۔ ایک ہندی دوسری اردو۔ لیکن دونوں کی اصل ایک ہے۔ ہاں کچھ عرصے سے ان دونوں سگی بہنوں میں ایک قسم کی ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے

دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہو رہی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی مزید نفع نہ بھی پہونچے تب بھی ہندوستانی اکیڈمی اس لحاظ سے ایک مبارک تحریک ہے کہ اس کی بدولت دونوں زبانوں کے انشا پردازوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا ہو گیا ہے جس سے آیندہ قومی اتحاد کے لیے بڑی بڑی امیدیں قائم ہو گئی ہیں۔ دونوں زبانوں کی توسیع و ترقی کی گنجائش ہے۔ اور دونوں کے ترقی کی ضرورت ہے دونوں ایک دوسرے کے لیے مفید اور ایک دوسرے کے قریب ہو سکتی ہیں، ہندوستانی اکیڈمی کے تحت میں کم سے کم ان دونوں میں رشک و عناد کے جذبات فنا ہو جانا چاہیئے۔

ہندوستانی اکیڈمی کا حقیقی منشا جاننے کے لیے اس کے دوسرے جزو کی تشریح بھی ضروری ہے۔

اکیڈمی یونانی زبان کا لفظ ہے اور قدیم یونانی ہیرو اکیڈمیس کے باغیچہ کا نام ہے جو مشہور و معروف پایۂ تخت تھیبز کے شمال مغرب جانب دریا کے کنارے واقع تھا۔ اپنے مالک کے اثر و رسوخ کے بدولت یہ باغ نہ صرف متعدد حملہ آوروں کے پامالی سے محفوظ رہا بلکہ اکثر مشاہیر نے اس کی ترقی و آراستگی میں بھی حصہ لیا۔ مثلاً اگر اکیڈمیس کے کسی مہربان نے اس کی چار دیواری بنوا دی تو اس کے دوسرے معزز قدرداں نے اس کی روشیں درست کرا دیں۔ اور کسی تیسرے صاحب نے اس میں فوارے لگا دیئے۔ بہر حال شروع ہی سے معززین کو اس باغ سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور غالباً اس سے متاثر ہو کر اس کے مالک نے اس کو عوام الناس کے تفریح طبع کے لیے وقف کر دیا۔ علمائے وقت اس آراستہ و پیراستہ باغ میں آتے اور اپنے علمی مباحث کا سلسلہ جاری رکھتے۔ شدہ شدہ یہ باغ افلاطون جیسے یکتائے زمانہ فلسفی کا تفریح گاہ بن گیا۔ حسن اتفاق کہیئے یا اس باغ کی خوش نصیبی کہ اس کے قریب ہی اس نامور فلسفی کی ذاتی جائداد بھی واقع تھی بہر حال افلاطون نے اپنے سنہ وفات یعنی ۳۴۸ قبل مسیح تک مسلسل پچاس سال "اکیڈمی" میں اپنے شاگردوں کو تعلیم دی جنھوں نے استاد کے بعد بھی اس کو اپنا درس گاہ بنائے رکھا اس طرح نو صدیوں تک مسلسل اس باغ میں تحصیل علم کا مشغلہ جاری رہا۔ حتّیٰ کہ ۵۲۹ء میں شاہ جسٹینین نے دیگر مدارس کے ساتھ اس کو بھی عوام کے لیے بند کر دیا۔ لیکن گو اس چمنستان علم و فضل میں علمی مشاغل و مباحث کی ممانعت ہو گئی تاہم اس کے تعلیمات کا اثر مدتوں تک قائم رہا۔ اور لفظ اکیڈمی ایک خاص معنی میں مستعمل ہونے لگا چنانچہ مشہور و معروف سسرو نے بھی اپنے باغ کا نام اکیڈمی رکھ کر اپنے علم دوست احباب کو فلسفیانہ بحث و مباحثہ کے لیے مدعو کرنے کا سلسلہ شروع کیا یونان میں کتنے نامور فلسفیوں نے افلاطون کے اکیڈمی کی شاندار روایتیں قائم رکھیں۔ ان سب کا بیان ایک طولانی داستان ہے بہر حال ان عظیم الشان اور مسلسل روایات کی بدولت علمی دنیا میں لفظ اکیڈمی کو ایک خاص نوعیت و اہمیت حاصل ہو گئی، جدید دنیائے ادب نے بھی اس لفظ کو قبول عام کی سند عطا کی ہے۔ اور زمانہ حال کی اصطلاح میں اکیڈمی سے مراد ایک ایسی انجمن یا جماعت ہے جس کا مقصد منشا انفرادی طور پر نیز مجموعی حیثیت سے خلوص و بے لوثی کے ساتھ بلا کسی خیال ذاتی منفعت کے علم

ادب و سائنس و فنون لطیفہ وغیرہ کی توسیع و ترقی۔ ایک سچی اکیڈمی کے ممبران کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ذاتی منفعت کے خیال سے خالی الذہن ہو کر علوم و فنون کی خدمت کرسکیں، اور علمی تکمیل و ترقی ہی کو اپنی کوششوں اور کاوشوں کا بہترین انعام تصور کریں۔ مدیر انسائیکلو پیڈیا برطانیکا پہلی اکیڈمی کو درحقیقت دنیا کی پہلی یونیورسٹی قرار دیتا ہے اور یہ اسکندریہ کا مشہور و معروف عجائب خانہ تھا جہاں تیسری صدی قبل یونان کے علما و فضلا یکجا ہو کر علمی مشاغل میں مصروف ہوتے تھے۔ اسی کی بدولت اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کی بنیاد پڑی۔ اس کے بعد مختلف ملکوں میں مختلف اکیڈمیاں قائم ہوئیں۔ زمانہ حال میں یورپ کی علمی ترقی کا بیشتر حصہ انھیں اکیڈمیوں کی حسن کوشش کا نتیجہ ہے۔ آسٹریا، بلجیم ڈینمارک۔ جرمنی۔ فرانس۔ ہنگری۔ اٹلی۔ پرتگال۔ روس۔ برطانیہ عظمیٰ، آئرلینڈ و امریکہ سبھی ملکوں میں علم و ادب و سائنس و فنون لطیفہ وغیرہ کی کے لیے خاص اکیڈمیاں قائم ہیں۔ بعض ممالک میں مختلف شعبہ جات کے لیے مختلف اکیڈمیاں قائم کی گئی ہیں اور اب ہمارے صوبہ میں بھی انھیں روایات کی تقلید کی گئی ہے۔

ہندوستانی اکیڈمی کو بھی انھیں انجمنوں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ ان کے شاندار روایات کے لحاظ سے علمی ترقی کے ساتھ ہی اصلاح زبان و تہذیب کا بھی اسے ایک بلند تر معیار ملک کے انشاپردازوں کے سامنے پیش کرنا ہوگا جس کی واقعی ملک کو اشد ضرورت ہے۔

اس وقت اردو ہندی دونوں میں عجب بے ہنگامی برپا ہے، ایک طرف بعض محسنان اردو عربی فارسی کے ادق محاوروں اور غیر مانوس ترکیبوں کو اردو میں داخل کرنا ضروری سمجھ رہے ہیں تو دوسری طرف پرجوش حامیان ہندی عام فہم روزمرہ بھاشا میں قدیم سنسکرت کے مشکل الفاظ اور دقیق استعاروں کی بھرمار کر رہے ہیں۔ تحریر و تقریر میں زمین و آسمان کا فرق ہو رہا ہے۔ اور دونوں زبانوں کے اکثر انشاپرداز ملکی ضروریات اور واقعات کو نظرانداز کرکے ایک دوسرے سے قطعی الگ راستے اختیار کر رہے ہیں اس بارے میں اصلاح و مفاہمت باہمی کی ضرورت ظاہر ہے۔ اور ہندوستانی اکیڈمی ایک صاف سلیس شستہ اور عام ہندوستانی زبان کے ترقی کے لیے بہت کچھ کرسکتی ہے یوں تو اردو ہندی کی متعدد لغات موجود ہیں اور ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن اردو کی بدولت بہت کچھ کام ہوگیا ہے تاہم زمانہ حال کی ضروریات کے لحاظ سے ہندوستانی اکیڈمی ایک مشترکہ اردو، ہندی لغات کی طباعت کا انتظام کرسکتی ہے جس میں زبان کی سلاست کا خیال بھی پورے طور پر رکھا جاسکتا ہے، اردو ہندی کے مشترکہ الفاظ کی تعداد میں اضافہ کی بہت گنجائش ہے اور ہندوستانی اکیڈمی کے علما پر اس کے متعلق خاص فرائض عائد ہیں۔

آج کل بعض احباب اپنے اپنے "اختراعات فائقہ" سے ہندوستانی علم ادب کو زیر بار احسان کر رہے ہیں "ادب عالیہ" "ادب لطیف" "انشائے جمیل" کے آڑ میں جو طوفان بے تمیزی برپا ہے، اس کا

تدارک بھی ہندوستانی اکیڈمی کا ایک خاص فرض ہونا چاہیئے۔

اردو ہندی دونوں میں بیہودہ کتابوں اور لغو افسانوں کی غیر معمولی کثرت ہے۔ جن میں نہ زبان ہی کا کوئی لحاظ ہے اور نہ فن انشا کا کوئی پاس اور نہ اخلاق عامہ اور نہ تہذیب و متانت ہی کا کوئی خیال۔ ہندوستانی اکیڈمی کے بدولت تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستانی لٹریچر کا ایک معیار قائم ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کی کوئی طاقت پوچ گویوں اور لغو نگاروں کو روک نہیں سکتی ہے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے بدولت پبلک کے روبرو ایک معیار تو پیش ہو جائیگا اور جو تصانیف اکیڈمی کی مہر تصدیق کے ساتھ شائع ہوں گی وہ مذاق سلیم کی درستی میں نمایاں حصہ لے سکتی ہیں۔

بعض اصحاب اردو ہندی کو ترقی دینے کے یہ معنی سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف شاعری اور افسانہ نگاری کو ترقی دی جائے۔ چنانچہ اردو، ہندی شعرا کی تعداد لاتناہی ہو گئی ہے مگر شاعری کی حالت دیکھیئے تو ناگفتہ بہ ہے۔ کیفیت ہمارے شعرا کے کلام میں عموماً نہ جذبات ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور نہ روحانیت ہی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ اور نہ طرز ادا میں کوئی جدت ہوتی ہے۔ نثر کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ زیادہ تر قصے کہانیاں، ناول افسانے ایسے لکھے جاتے ہیں جو دماغ کو منور اور دل کو مسرور کرنے کی بجائے طبیعت کو منغض و خیالات کو پراگندہ کر دیتے ہیں اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ادنیٰ ترین سازشوں کی جگہ ہے جہاں مکر و فریب اور بوالہوسی کے سوا اگر کسی چیز کی گنجائش ہے تو وہ جھوٹ، نسانی ہے۔ اس حالت کی اصلاح بھی ہو جائے تب بھی شاعری و افسانہ نگاری کی ترقی سے محض تفریح طبع کا سامان مہیا ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہندی ادب کو ایسا مکمل بنایا جائے کہ سائنس و طبعیات کے تمام مسائل اس میں ادا ہو سکیں۔ ہر علم و فن کی اصطلاحات موجود ہوں اور ہر جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے صحیح مناسب و موزوں الفاظ میسر ہوں لغات کی توسیع ہو اور تحریر و تقریر میں صحت کا ایک صحیح معیار قائم ہو جائے۔ بہر حال اس بارے میں ایسی کوشش ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی اکیڈمی رفتہ رفتہ علم ادب کی قومی پارلیمنٹ سمجھی جانے لگے۔

فرنچ اکیڈمی کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے میتھیو آرنالڈ لکھتے ہیں کہ ادبی دنیا میں اس کا درجہ ایک اعلیٰ ترین عدالت کے بمنزلہ ہے، مہذب طبقہ اور تعلیم یافتہ جماعت کے خیالات و جذبات کا وہ ایک مستند مرکز ہے۔ اور لب و لہجہ طرز بیان اور ذوق سلیم کے باب میں اس کی رائیں واجب التعظیم اور واجب التعمیل احکام کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ درجہ محض حکومت کے ر.. د نیشن سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ گورنمنٹ کام کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر سکتی ہے۔ مگر .. اصلی ذمہ داری کام کرنے والوں پر ہوگا۔ جب تک سرگرمی

سے باقاعدہ کام نہ کیا جائیگا۔ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو جوش و محنت سے کام کرنے پر کہیں برسوں میں جاکر کوئی نتیجہ نکل سکے گا۔ اس لحاظ سے اکیڈمی کے اولین عہدہ داروں اور ارکین پر غیر معمولی ذمہ داریاں ہیں۔ ہم کو بھروسہ ہے کہ ان بزرگوں نے جنھیں اس اکیڈمی کی قسمت سپرد کی گئی ہے۔ سوچ سمجھ کر ہی اس اہم خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ افسران اکیڈمی خصوصًا محترم صدر اردو ادب کے شیدائیوں میں ہیں انگریزی زبان میں اعلیٰ ترین دستگاہ کے ساتھ دیسی زبان کے وہ ہمیشہ سے باخبر نکتہ چیں و قدرشناس رہے ہیں۔ ملک کی علمی ضروریات اور موجودہ ادب کے نقائص خامیوں کا انھیں پورا احساس ہے۔ اگر وہ اپنے تبحر رائے کا تھوڑا سا حصہ بھی اکیڈمی کو دے سکے تو چند ہی سال کے عرصے میں ہندوستانی زبان کا غیر معمولی نشو و نما ہو جائے گا۔ اور ہندوستانی اکیڈمی ملک کے ذہنی و دماغی ترقی کا معیار بلند کرنے میں ایک نمایاں خدمت انجام دے سکے گی۔

* * *

آپ اس کو فلک کج رفتار کی شرارت سمجھیے یا گردش روزگار کا کرشمہ کہیے اب وہ وقت باقی نہیں رہا جب محض شکوہ و شکایت یا مرثیہ خوانی سے کام چل جاتا تھا۔ آج دنیا جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اس میں گلہ یا شکوہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس وقت دنیا میں بخت نارسا کی شکایتوں کا کوئی سننے والا نہیں رہا، اب یہ بیکاروں کا شغل رہ گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنی ہستی قائم رکھنا ہے تو یاد رکھیے آپ کی ہستی ترقی کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے اور اس کے لیے آپ کو اتفاق و یکجہتی کے ساتھ اپنے تئیں موجودہ حالات کے مطابق بنانا ہوگا، اور میدان عمل میں باقاعدہ قدم آگے بڑھانا پڑے گا۔ خوب سمجھ لیجیے کہ گذشتہ پندرہ سال کے اندر دنیا کی حالت بالکل بدل چکی ہے لیکن آپ ابھی تک پچاس ساٹھ سال پہلے کے مقرر کردہ راستوں پر چل رہے ہیں اور پرانے رنگ و لوشنوں کو دہرا رہے ہیں، حالانکہ کیفیت یہ ہے:

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دیانرائن نگم

دسمبر ۱۹۲۷ء

یادِ رفتگان

(ایک نظر بازگشت)

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

تا قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

چوتھائی صدی کا زمانہ قومی زندگی یا ملکی ترقی کے لیے کوئی بڑی مدت نہ ہو لیکن ایک اردو رسالہ اور ایک معمولی شخص کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فروری ۱۹۰۳ء میں جب رسالہ زمانہ کا پہلا پرچہ قیصری پریس بریلی سے شائع ہوا تھا تو ملک کی سردمہری اور اردو کی عام بے قدری دیکھتے ہوئے کس کو اس کی جوبلی دیکھنے کی امید ہو سکتی تھی، مگر شکر کا مقام ہے کہ آج اس کی عمر کے پچیس سال پورے ہو گئے اور اس نمبر کی اشاعت سے اس کا چھبیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ پچیس سال کس محنت اور جانکاہی سے بسر ہوئے۔ اس عرصے میں دنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھنے میں آئے، ملکی خیالات نے کہاں سے کہاں تک ترقی کی۔ قومی زندگی میں کیا کیا انقلاب رونما ہوئے؟ اس وقت ان اہم سوالات کے مفصل جواب دینے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن آج جب خدا کی عنایت اور بندگانِ خدا کی اعانت سے زمانہ کا جوبلی نمبر شائع ہو رہا ہے تو ان بزرگوں اور مہربانوں کے احسانات کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی کفرانِ نعمت ہوگا جن کی امداد سرپرستی کے بغیر اس ناچیز کا ادبی خدمت کا سلسلہ کسی طرح اتنے دنوں قائم نہ رہ سکتا تھا۔ مگر آج رسالہ کے چھبیسویں سالگرہ کے دن ان احبابِ زمانہ کی بے اختیار یاد آ رہی ہے جن کی مالی سرپرستی اور قلمی اعانت کے بغیر یہ ادبی تحریک سرسبز و بارآور ہونا درکنار وجود ہی میں نہ آ سکتی تھی۔ افسوس اس وقت ہمارے اکثر ہمدرد و معاون ہماری خوشی میں شریک ہونے اور ہماری محنتوں کی داد دینے کو دنیا میں موجود نہیں ہیں، ہماری بزمِ ادب ان کے بغیر سونی ہو رہی ہے لیکن دل کی بستی میں انکی لطف و عنایت کی یادگار ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کے اخلاص و محبت کے نقش زمانہ کے صفحات سے کبھی محو نہیں

ہو سکتے ہیں، اور جب تک جسم و جان کا ارتباط باہمی قائم ہے، ان محبانِ قدیم کی یاد تازہ رہے گی۔

مشیت ایزدی میں نہ کسی کو دخل اور نہ مصلحت خداوندی میں چون و چرا کی گنجائش ہے لیکن ناظرین زمانہ معاف فرمائیں اگر اس مسرت انگیز موقعہ پر ہماری خوشی اس خیال سے کسی قدر مکدر و نامکمل ہے کہ زمانہ کے نامور بانی آج کے جشن میں حصہ لینے کے لیے ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں جس ادبی خدمت کی بنیاد رکھنے کا فخر موصوف کو حاصل ہے اسے پھلتا پھولتا تو انھوں نے دیکھ لیا۔ لیکن آج ہم کو مبارک باد دینے اور ہماری مبارکباد لینے کے لیے وہ دارِ فانی میں باقی نہیں ہیں۔

سچی حب الوطنی کو ان کی ذات گرامی پر ہمیشہ فخر کرنے کا موقعہ رہے گا۔ منشی راج بہادر صاحب ریاست رام پور کے ایک ہر دلعزیز و بے لوث افسر تھے۔ انتہائی دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے علاوہ، وہ ریاست میں کسی سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ ریاست رام پور کے وہ سچے ہی خواہ تھے لیکن یہ خیر خواہی ان کے لیے فرض کے بمنزلہ تھی۔ اس لیے اس کے اعلان کی نہ انھوں نے کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس کی اور نہ اس سے کسی منفعت کوئی خاص فائدہ اٹھایا۔ اپنی دیانت داری کا یہی صلہ کافی سمجھتے تھے کہ تمام عمر اپنے آقائے نامدار کے معتمد علیہ رہے۔ عزت سے زندگی بسر کی اور عزت ہی کے ساتھ اس دار فانی سے رحلت کر کے عالم جاودانی ہو گئے۔

موصوف بریلی کے ایک قدیم کایستھ خاندان کے نامور رکن تھے۔ عرصہ تک پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے اہلکار رہنے کے بعد آپ کی خدمات ریاست رام پور میں منتقل ہو گئی تھیں، جہاں آپ نے ۳۵ سال تک ریاست کی خدمت انجام دی۔

رفاہ عام کے کاموں سے آپ کو شروع ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ بریلی کا مشہور یتیم خانہ آپ ہی کا قائم کردہ ہے، جب تک اس کی عمارت تیار نہیں ہوئی آپ نے یتیموں کے لیے اپنا گھر خالی کر دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن اس سے ان کی دلی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے۔ منشی راج بہادر کا خاصہ تھا کہ جس کام کو شروع کرتے تہ دل سے کرتے۔ ان کی آنکھ میں مروت اور دل میں درد تھا۔ وہ دولت مند نہ تھے۔ لیکن خلوص اور نیک نیتی کی بدولت ان کے ہاتھ میں جس اور ان کے روپیہ میں برکت تھی۔ انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صرف کام سے غرض رکھتے تھے نام سے نہیں۔

ان کی سب سے بڑی لیاقت یہ تھی کہ دوسروں کو بھی وہ اپنے نیک جذبات سے متاثر کر کے ان سے حسب مرضی کام لے سکتے تھے۔ ان کی بے لوثی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ کئی سال تک وہ زمانہ پر ہزار ہا روپیہ صرف کرتے رہے لیکن کسی پر اپنا نام تک ظاہر نہ ہونے دیا۔ واقعی موصوف زندگی بھر "نیکی کن بدریا انداز" کے اصول پر کاربند رہے۔ زمانہ جاری کر کے چھبیس برس بعد تک وہ زندہ رہے لیکن کبھی انھوں نے اپنا نام نامی ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی۔ البتہ خاص احباب واقف تھے، لیکن ان کو

بھی آپ کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ بابو گنگا پرشاد ورما آنجہانی نے اپنے معزز اخبار ہندوستانی مورخہ ۴؍ ستمبر ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا کہ "ہم رسالہ زمانہ کے مالک کی جن کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے ملکی جوش کی تعریف کریں گے کہ وہ نقصان کثیر سے رسالہ چلا رہے ہیں۔" بعض دور اندیش و زر پرست اصحاب نے انھیں اس کام میں اپنا روپیہ برباد کرنے سے منع بھی کیا لیکن وہ اپنی دھن کے پکے تھے جو کام کرتے تھے کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتے تھے۔ اس کے لیے خود بھی ایثار کے لیے تیار رہتے اور دوسروں کو بھی ایثار کے واسطے آمادہ کر دیتے تھے۔ منشی راج بہادر کو رفاہ عام کے کاموں کا دلی شوق تھا وہ ملک کی قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے کوشاں تھے۔ اسی لیے اصلاح تمدن کے زبردست حامی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی ترقی کے خواہشمند اور علمی ترقی کے دلدادہ تھے۔ اور ہر مدمیں قومی کارکنوں کی تعداد میں اضافہ ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے کوئی موقعہ اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتے بابو شیو برت لال صاحب ورمن آج ایک کامیاب مصنف ہیں۔ جن کی صد ہا کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ درحقیقت کثرت تصانیف کے لحاظ سے زمانہ حال کے اردو مصنفین میں بابو شیو برت لال ورمن اور خواجہ حسن نظامی ہی ایسے اصحاب ہیں جنھوں نے ہر طرف مضامین کے انبار لگا دیے ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بابو شیو برت لال صاحب کو سرکاری ملازمت سے ہٹا کر تصنیف و تالیف کے راستے میں منشی راج بہادر بانیٔ زمانہ ہی نے ڈالا تھا۔ آپ ہی کی متواتر و مسلسل کوششوں سے نامور محب وطن بابو گنگا پرشاد ورما نے اپنا مشہور و معروف انگریزی اخبار ایڈوکیٹ جاری کیا تھا۔ آپ ہی کی بزرگانہ حوصلہ افزائیوں نے ناچیز ایڈیٹر زمانہ کے دل میں ملک کی ادبی خدمت کا چسکا پیدا کر دیا۔ اور اس کی زندگی اسی کام کے لیے وقف ہو گئی۔

بہرحال منشی راج بہادر کی ذات گرامی پر اس رسالے کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے دنیا میں کوئی شخص نہ ہمیشہ رہا ہے اور نہ رہے گا لیکن منشی راج بہادر کے اخلاص و حب الوطنی کی یاد عرصہ تک دلوں میں باقی رہے گی۔

چھبیس سال کی پرانی جلدیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور ہمارا دل احسان مندی اور شکر گذاری کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کن کن عنایت فرماؤں کا ان مختصر صفحات میں ذکر کیا جائے۔ عہد حاضرہ کے سبھی انشا پردازان اردو نے ہماری اعانت فرمائی ہے۔ بقول" بالمکند گپتا ایڈیٹر بھارت مترکتنے ہی بوڑھے اہل قلم جو بیس بیس سال سے لکھنا چھوڑ بیٹھے تھے' زمانہ کے اجراء کے بعد اس میں لکھنے لگے" ان میں سب سے پہلا قابل ذکر نام ہمارے صوبہ کے زندۂ جاوید شاعر و فلسفی' اکبر کا ہے۔ جن کی شاعری کا طلسم سکوت سالہا سال کے بعد اسی ناچیز رسالہ کی مسلسل کوششوں سے ٹوٹا تھا۔ جناب اکبر قدیم اودھ پنچ کے مشہور مضمون نگاروں میں تھے۔ علی گڑھ کی تحریک و فلیشن پر اپنے بے مثل انداز میں ظریفانہ تنقید یں کیا

کرتے تھے۔ مگر جب اردو شاعری قدیم و جدید طرز کی کش مکش میں پھنس گئی تو آپ ذرا بچ کر رہے صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ جو کچھ کہتے اپنے ہی دل کی خوشی کے لیے کہتے، کلام کی اشاعت کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔ اور مزاج میں یک گونہ بے پروائی دخل پا گئی تھی۔ لیکن ہمارے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر آخر آپ نے جنوری ۱۹۰۳ء سے زمانہ کے لیے اپنی نظمیں عنایت فرمانا شروع کیں، چنانچہ آپ نے زمانہ سالنامہ جدید کے پہلے ہی نمبر میں اپنی شاعرانہ مشکلات کا نہایت پرلطف پیرایہ میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — تو اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا

جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ ادھر — زیادہ حد سے دیے پاؤں سب نے ہیں پھیلا

ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک — ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

اکبر مرحوم سرکاری ملازمت کے زمانہ میں کانپور رہ چکے تھے اور ایڈیٹر زمانہ کے بزرگوں پر عنایت فرماتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اس پرچہ پر خاص طور پر مہربان رہے اور ان کا بہترین کلام زمانہ ہی میں شائع ہوا ہے۔ اب ایسے وضعدار اور عالی خیال بزرگ کہاں دیکھنے کو نصیب ہوں گے ادبی اور فنی امور کا بھی لحاظ فرماتے تھے۔ نجی خط و کتابت میں ذرا ذرا سی بات کی داد دیتے تھے۔ ۱۹۰۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ ایسے قابل اور وسیع المشرب نوجوان کی درحقیقت ملک کو ضرورت ہے خدا کامیاب کرے۔ اس قدر انگریزی پڑھ کر شاذ ہی ایسی طبیعت رہتی ہے .....

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کا خط پڑھ کر پہلی ہی جو بات ذہن میں آئی وہ یہ تھی۔ "عزیز اعیان" یہ اردو آپ کو کس طرح آ گئی۔ آپ کہیں گے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ جی ہاں، یہ ایک بات ہے اور بڑی بات ہے۔

۱۹۱۰ء میں آپ نے اول مل کی لوئی منگوائی تھی۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں کلیاتِ اکبر کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اور اس کا ریویو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر آپ نے لکھا: "خدا خوش رکھے آپ داد بھی دیتے ہیں، اور خلعت بھی۔ لوئی اوڑھ کر آپ کا ریویو پڑھتا ہوں، اور تھینکس دیتا ہوں"..... ایسے لائق سخن شناس کم ہوتے ہیں۔ میں نہ ہوں گا۔ لیکن آپ میری یاد کو بہت دن زندہ رکھیں گے۔"

۱۹۱۱ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

عزیزم سلمہٗ۔ اول تو آپ کے بزرگوں سے مجھ سے مراسم تھے، دوسرے آپ میرے بہت ابتدائی پبلشروں میں ہیں۔ میرے قیمتی تحائف (۱) جو تھے آپ کی سلامت روی ان وجوہ سے آپ کو یاد رکھتا ہوں اور نیاز نامہ لکھا تھا۔ ورنہ میں اب بہت کچھ معذور ہوں اور معذور ہوتا جاتا ہوں۔ نہ نشاطِ طبع ہے نہ حرص فردا ....

۲۰ نومبر ۱۹۱۳ء کے ایک نوازش نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"میرے محترم عنایت فرما۔ بیماری، ناتوانی اور ترددات نے نکما کر دیا ہے۔ حکم کو ٹال نہ سکا۔ مشکل سے کچھ اشعار نقل کر کے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ قدر افزائے اکبر کو خدا خوش رکھے۔"

کیا اس محبت کی یاد دل سے کبھی محو ہو سکتی ہے؟

❖ ❖ ❖

اس صوبہ کے نامور اخبار نویس بابو گنگا پرشاد ورما کا نام اوپر آ چکا ہے۔ آپ بھی زمانہ کے اولین معاونین میں تھے۔ ہمعصر بھارت مترنے لکھا تھا "کہ کتنے ہی مشہور مصنف اور کتنے ہی نامی اخباروں کے ایڈیٹر زمانہ کے لیے مضامین لکھتے ہیں۔ ایڈیٹروں کو اپنے اپنے اخباروں ہی سے فرصت نہیں پھر ان سے مضامین لکھانا زمانہ کی بہادری ہے"۔ خیر جو کچھ ہو ورما صاحب کے پاس ہندوستانی ایڈووکیٹ کی ایڈیٹری اور دیگر پبلک مصروفیتوں کی وجہ سے مشکل کوئی وقت بچتا تھا۔ تاہم ستمبر ۱۹۲۴ء میں آپ نے پولٹیکل تعلیم کی ضرورت پر ایک خاص مضمون لکھ کر زمانہ کو عنایت فرمایا۔ اور اس کے بعد بھی کئی بیش بہا مضامین لکھے۔ صوبہ متحدہ میں پولٹیکل اخبار نویسی کی بنیاد ورما صاحب ہی کی بدولت قائم ہوئی آپ کی وجہ سے اس کا معیار اور اس کی شان بہت بڑھ گئی۔ آپ کی بے لوث نیک نیتی اور فرض شناسی ضرب المثل تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت پر بھی آپ نے اخبار کا دفتر بند نہ کیا۔ جس محنت و جانفشانی سے آپ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے۔ جس خلوص و محبت کے ساتھ اہل وطن کی خدمت کرتے تھے۔ اس کا احسان ہمیشہ ہماری گردنوں پر رہے گا۔ آپ کا اردو خط آسانی سے پڑھا نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے آپ زمانہ کے لیے جو مضامین بھیجتے ہمیشہ اپنے اخبار کے کاتب سے صاف کرا کے بھیجتے تھے۔ اور قریب قریب ہر خط میں یہ لکھ کر حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ کہ "میں آپ کی محنت کی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"۔ خدا کرے آپ اردو داں اصحاب کے لیے فزوعات سے پاک، ایک اعلیٰ درجہ کا میگزین بہم پہونچانے میں کامیاب ہوں"۔

زمانہ کو سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کے کئی خاص مضامین شائع کرنے کا اعزاز ورما صاحب ہی کے توسط سے نصیب ہوا تھا۔ ورما صاحب کو رسالہ سے سچی محبت تھی اور وہ دل سے اس کی ترقی چاہتے تھے، چنانچہ اکثر خطوط میں کفایت شعاری کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ گو اس وقت اس مشورہ پر عمل نہ ہو سکا لیکن زندگی کے تلخ تجربات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مشورے فضول تھے۔ ہمارے صوبہ کے نامور سوشل ریفارمر رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب جج نے بھی اصلاح تمدن کے متعلق کئی قابل قدر مضامین زمانہ کے لیے تحریر فرمائے جن کا سلسلہ ان صاحب کی آخر عمر تک قائم رہا۔ آپ نے عمر بھی اچھی پائی لیکن سوامی جی کو زیادہ مہلت نہ ملی۔ ان کی بے وقت وفات سے جہاں ملک کے روحانی مفاد کو زبردست صدمہ پہنچا وہاں زمانہ

کا بھی نقصان عظیم ہوا۔ سوامی جی کو بھی اس پرچے سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ مئی ۱۹۰۵ء کے زمانہ کی رسید دیتے ہوئے آپ نے جو صلہ افزائی کے راہ سے لکھا کہ جہاں تک آپ کا مہربانی نامہ اور زمانہ ملا۔ یہ میگزین تصنیف میں ہر ایک پہلو سے بہت عمدہ ہے۔ اور ضرورت زمانہ کو بہت کچھ پورا کرتا ہے۔ تھوڑے دنوں میں رام کے قلم سے بھی ایک مضمون آپ تک پہنچ رہے گا۔ اوم آنند

آپ کا رام

اس کے بعد سوامی جی کے کئی بیش بہا مضامین زمانہ میں شائع ہوئے اور ملک میں ان کی خوب قدر ہوئی۔ ان مضامین میں سوامی جی نے واقعی روحانیت کا دریا بہا دیا ہے۔ مولانا شرر مرحوم نے ان کے متعلق ایک مفصل نوٹ اپنے رسالہ دلگداز میں شائع فرمایا تھا۔ جب اس کا تذکرہ آیا گیا۔ تو آپ نے ایک نجی خط میں لکھا کہ "واقعی ان مضامین کی پوری تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ میں نے دلگداز میں جو کچھ کہا وہ اس سے بہت زیادہ کے مستحق ہیں۔"

سوامی جی مہاراج آخر دم تک زمانہ کی قلمی سرپرستی فرماتے رہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ آخری فیض جو دنیا کو ان کی ذات مقدس صفات سے پہونچا۔ زمانہ ہی کی معرفت پہونچا۔ مضمون "خود کشی یا تسک عوج" جو زمانہ مئی ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ آپ کے مقدس زندگی کا آخری کام تھا۔ اس کے ختم ہونے ہی آپ کو پیغام وصل آپہونچا۔

مولانا شرر مرحوم زمانہ کے لیے زیادہ نہ لکھ سکے۔ تاہم آپ نے دو ایک خاص مضامین عطا فرما کر رسالہ کو ممنون منت فرمایا ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی نے بھی ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء میں کئی غزلیں اور ایک خاص نظم عطا فرما کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نجی ملاقاتوں اور خطوط میں بھی اکثر زمانہ کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ کے ایک خط میں لکھا کہ "زمانہ کا نیا پرچہ سابق سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ بے شبہہ وہ ہونہار ہے......"

مضامین کے تقاضے کا جواب آپ نے ایک بار لطیفہ کی صورت میں دیا۔ ملاحظہ ہو۔

"مکرمی۔ مشہور ہے کہ متھرا میں ایک چوبے جی کو صرف لڈو کی شرط سے کسی نے بہت سے لڈو کھلا دیئے۔ یہاں تک کہ پیٹ تن گیا۔ اور سانس اندر سما نہیں سکتا تھا وہ زمین پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے۔ کہ کوئی وید صاحب آگئے۔ انھوں نے ایک دوا دی کہ اس کو کھا لیجئے تو کھانا ہضم ہو جائے گا۔ چوبے جی نے کہا مہاراج اپیٹ میں اتنی جگہ ہوتی تو میں اس قدر لڈو ہی کیوں نہ کھاتا۔ بعینہ یہی میرا حال ہے۔ اتنی فرصت ہوتی تو الندوہ میں ہی کیوں نہ لکھتا۔ ... مخزن اور اردوئے معلی میں مدت ہوئی جو کچھ چھپا وہ ایک زیر تالیف کتاب کی عبارت تھی۔ شبلی۔ لکھنؤ۔ ندوہ ۵ جولائی ۱۹۰۵ء

لیکن اس کے بعد جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے زمانہ آپ کے کلام سے محروم نہیں رہا۔

شمس العلماء مولانا حالی مرحوم و مغفور نے بھی سرسید کی لائف پر ایک مضمون زمانہ میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن زمانہ کی اس سے کہیں زیادہ خاطر آپ کو مدنظر رہتی تھی۔ جیسا کہ آپ کے نوازش نامہ مورخہ ۸ اپریل ۱۹۰۶ء کے اقتباس ذیل سے واضح ہوگا:

"۔۔۔۔ جو لکچر سرسید مرحوم کے برسی کے موقعہ پر دیا گیا تھا وہ ان کی لائف (موسومہ بہ حیات جاوید) کا خلاصہ ہے مگر بالکل نامکمل اور ادھورا۔ میں آج اتوار کے سبب اس کو روانہ نہیں کر سکا۔ انشاء اللہ کل ضرور روانہ کر دوں گا۔۔۔۔ میرے دوست مولوی عبدالحق صاحب نے اکبر کی برسی کے موقعہ پر اس کی لائف اور اس کی پالیسی پر لکچر دیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب تک اکبر پر کسی صاحب نے ایسا عمدہ مضمون نہیں لکھا۔ میں نے سکریٹری انجمن سے زمانہ کے لیے اس کو مانگ لیا ہے وہ بھی عنقریب ہی آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔"

آخر یہ قابل قدر مضمون مولانا حالی کی عنایت و توجہ سے زمانہ کے قومی نمبر ۱۹۰۶ء میں جو شہنشاہ اکبر اعظم کی صد سالہ برسی کے یادگار میں شائع ہوا تھا ہدیۂ ناظرین ہوا۔

زمانہ پر مولانا حالی کی مزید عنایات کا حال معلوم کرنا ہو تو ذیل کی سطریں ملاحظہ فرمائیے۔ جو ایک اور خط سے ماخوذ ہیں فرماتے ہیں:

زمانہ کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان منتخب رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری آرزو دلی ہے کہ زمانہ نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی و تہذیب میں بھی روز افزوں ترقی کرے اور جو صلح کل مسلک اس نے اختیار کیا ہے اس سے سرمو تجاوز نہ کرے۔

زمانہ کی خوش نصیبی سے تمام بزرگان قوم و رہنمایان ملک کی امداد شامل حال رہی ہے۔

آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب مرحوم۔ حضرت شوق، جناب شہری، جناب شاد عظیم آبادی وغیرہ بزرگوں نے بھی قابل قدر مضامین سے زمانہ کی امداد فرمائی ہے۔ حضرت شوق نے ایک مفصل تنقید اس پر لکھ بھیجی تھی جس میں زمانہ کی حوصلہ افزا الفاظ میں تعریف کی گئی تھی۔ لیکن جب ایڈیٹر کو اس کے چھاپنے میں پس و پیش رہا تو صاحب مرحوم نے اسے کسی دوسرے رسالہ میں شائع کرا دیا۔ اپنے کمال محبت سے آپ نے کئی بہترین نظمیں ہدیۂ ناظرین رسالہ فرمائیں۔ جناب شہری نے بھی اکثر مضامین سے رسالہ کی قدر افزائی فرمائی۔ پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب کے بھی کئی عالمانہ مضامین زیب رسالہ ہو چکے ہیں۔ آپ کا ادبی ذوق آخر عمر تک قائم رہا۔ اور زمانہ و کشمیر درپن دونوں کے لیے آپ نے خوب مضامین تحریر فرمائے۔

جناب شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے علمی احسانات سے بہرہ مند فرمایا۔ جب کبھی آپ سے کلام کا تقاضا کیا گیا تو آپ نے اپنے الطاف بزرگانہ سے محروم نہیں رکھا۔ چنانچہ آپ کے کئی اہم مضامین نثر اور کئی بلند پایہ نظمیں زیبِ رسالہ ہو چکی ہیں۔ اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کلام کا دفتر موجود اور اشاعت کا منتظر ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ قدردانانِ اردو آج تک ان جواہر پاروں کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ شادؔ مرحوم زندگی میں اکثر اپنے مجموعہ کلام کے اشاعت سے مایوسی کا اظہار فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک نوازش نامے کا ایک حصہ یہاں پر نقل کیا جاتا ہے۔

"...... خدا جانے کتنی محنتیں کر کے غزلوں اور دوسرے منظومات اور مرثیوں کا ایک دفتر کیا۔ ان کے علاوہ اور متفرق تصنیفوں عروض و قوافی و فنی و بیان و نصاب تعلیم کے چھوٹے بڑے کتنے ہی رسالے لکھے۔ اب ان چیزوں کے ڈھیر کو دیکھ کر خود دم گھبراتا ہے یقین جانئے ادھر میرا دم نکلا اور یہ کل عمر بھر کا ریاض مٹی میں مل گیا......"

خدا کرے یہ خوف درست ثابت نہ ہو اور ہم اپنے اہلِ کمال کی قدردانی کرنا سیکھیں اور ان کی تبرکات ضائع نہ ہونے پائیں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ناظرینِ زمانہ عرصہ تک شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ صاحب و شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی سے بھی مستفید ہو چکے ہیں۔ دونوں بزرگوں نے عرصہ تک اس رسالہ کی قلمی اعانت فرمائی۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے جولائی سنہ ۱۹۰۵ء میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ "اس ہر دلعزیز رسالہ کی جس قدر اعانت مجھ سے زمانہ کی ہو سکے گی کروں گا" اس وعدے کو آخر دم تک انھوں نے پورا کر کے دکھا دیا۔ لطف یہ کہ پولیٹیکل نقطۂ خیال سے آپ کو زمانہ اور اس کے ایڈیٹر سے اکثر اختلاف رائے رہتا تھا۔ چنانچہ اگست سنہ ۱۹۰۰ء کے خط سے جس میں آپنے تحریر فرمایا کہ "پولیٹیکل مضامین تو بہت سے لکھے ہوئے رکھے ہیں مگر وہ سب بے کے زمانہ کی پالیسی (POLICY) کے خلاف ہیں۔ اس اختلاف کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ تاہم اس کے بعد آپنے زمانہ کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ آپ کی وضعداری کی کیا تعریف کی جائے۔ فرشتہ خصلت مسٹر اینڈریوز آپکے اخلاقِ حمیدہ کا اعتراف فرما چکے ہیں۔ آپنے اردو مصنفین کے لیے جس قدر تاریخی مسالہ فراہم کیا ہے وہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔ آپ کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی۔ ہر کام نہایت قاعدہ اور قرینہ سے کرنے کے عادی تھے۔ پابندیٔ وقت ہی کی بدولت آپ نے ہزارہا صفحوں کی کتابیں لکھ ڈالیں دوسروں کا جس قدر آپ کو خیال رہتا تھا اس سے زیادہ کم لوگوں کو رہتا ہوگا حتیٰ کہ جزئیات پر بھی آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے زمانہ بھیجنے کی ممانعت کی اور لکھا کہ آپ ناحق اپنا پرچہ کیوں بھیجتے ہیں۔ میں پبلک لائبریری میں اس کو دیکھ ہی لیتا ہوں" دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے۔

اور سرد و گرم زمانہ دیکھ چکے تھے۔ ملک کی قدر دانی کا حال بھی آپ سے پوشیدہ نہ تھا۔ چنانچہ ترقی اردو کی کوششوں کی مالی کامیابی سے قطعی مایوس تھے۔ اسی وجہ سے جب آپ نے سُنا کہ ایڈیٹر زمانہ سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہے تو آپ نے مجھی ایک کارڈ لکھا کہ "مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ وکالت میں امتحان دیں گے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے آپ قانونی عزت حاصل کرنے میں سعی کیجئے۔۔۔۔"

مولوی نذیر احمد صاحب کے قلمی احسانات کی ابتدا یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے لیے ایک عالمانہ لکچر تیار کیا تھا۔ لیکن باہمی مخالفت کے باعث اس سال انجمن کا اجلاس برہم ہوگیا تھا۔ جس سے مولوی صاحب اپنے لکچر کا ایک لفظ بھی انجمن میں نہ پڑھ سکے، چنانچہ آپ نے ازراہ محبت اسے لکھ کر بھیج دیا۔ کہ آپ اسے زمانہ کے صفحوں میں جگہ دیجئے اور دفعتہً یا ٹکڑے ٹکڑے سے جیسا آپ مناسب سمجھیں شائع کیجئے۔" مگر اس سے ناظرین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے مضامین آسانی سے مل جاتے تھے۔ درحقیقت مولوی صاحب بڑے نازک مزاج واقع ہوئے تھے، چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر سنئے۔ تقسیم بنگالہ کے ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں سودیشی تحریک کا زور شور تھا۔ اور زمانہ میں بھی اس کے متعلق اکثر مضامین شائع ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایڈیٹر زمانہ نے اس مسئلہ کے متعلق اکثر بزرگان ملک سے استصواب رائے کیا تھا۔ مولوی صاحب کو اظہار رائے کی تکلیف دی گئی اور جواب کے لیے ایک ٹکٹ دار لفافہ بھی ان کے خط میں رکھ دیا۔ مگر آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ اور فوراً ہی یہ لکھ بھیجا کہ "اب تو آپ کھینچ تان کر مجھ کو کارسپانڈنٹ کے راستے پر ڈال چلے جو میری عادت اور میرے مزاج کے خلاف ہے۔ رسالوں اور اخباروں کی کارسپانڈنٹی وہ کرتا ہے جس بدنصیب کو شہرت کا دوسرا ذریعہ میسر نہیں۔ شکر ہے خدا نے مجھ کو اس بے حرمتی سے بچا یا ہے۔۔۔۔"

بہرحال اس بحث پر آپ نے کچھ نہیں تحریر فرمایا گو اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی زمانہ کو کئی قیمتی مضامین عطا فرمائے سچ ہے۔ بزرگوں کا مزاج تولہ ماشہ ہوتا ہے کبھی ذرا سی بات میں خوش ہو جاتے ہیں اور کبھی ناخوش لیکن ان کی ناخوشی دیرپا نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اپنے سے کم عمر والوں سے ہمیشہ مراعات ہی سے پیش آتے تھے۔ مگر اب یہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں۔ زمانہ کی پرانی جلدیں دیکھ کر یہی خیال رہ رہ کر آرہا ہے کہ پچیس سال پہلے ملک میں کیسے کیسے نامی انشا پرداز موجود تھے جو اس اثنا میں ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لیے نہاں ہوگئے۔ رائے بہادر لالہ نہال چند صاحب بھی جن کی نسبت اکبر مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں۔ کہ "ورانکے فیض کا کبھی ہوتا نہیں تھا بند" زمانہ کے قلمی معاون تھے۔ نواب وقار الملک صاحب بہادر نے بھی زمانہ کے لیے ایک خاص مضمون لکھا تھا۔ لیکن جس محب وطن کے سلسلے میں یہ مضمون حوالہ قلم ہوا تھا۔

اس کے احسانات کا ہم کیا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے مولوی عزیز احمد صاحب مرحوم ہوم ممبر سرکار نظام کے متعلق ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا تھا۔ عزیز مرزا صاحب کے بہت سے مضامین زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں ان کا ہر مضمون ناظرین کے لیے ایک درجہ کی علمی ضیافت ہوتا تھا۔ جس خلوص اور محبت سے مولوی عزیز مرزا صاحب اس رسالے کیلئے مضامین لکھا کرتے تھے اس کی یاد دل سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ آپ کی محبت و قدردانی کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کتابی صورت میں بھی اپنے بلند پایہ مضامین کے مجموعوں کی اشاعت کا حق ایڈیٹر زمانہ ہی کو عنایت فرمایا ہے۔ آپ کی عملی ہمدردی اور علمی قدردانی کی کیفیت ایک اور واقعہ سے بھی معلوم ہوگی۔ آپ نے ایک دفعہ رسالہ کی مالی مشکلات کا حال سنا تو بلا کسی تحریک کے از خود رسالہ کی توسیع اشاعت کی عملی کوشش کی اور حیدرآباد میں زمانہ کے سو کے قریب خریدار بنائے اور ان سے رسالہ کی سالانہ قیمت وصول فرما کر دفتر میں روانہ کر دی۔

اسی طرح ہمارے دوست کرنیل بھولا ناتھ صاحب اور رائے شمبھو ناتھ صاحب رئیس کانپور نے ایک دفعہ رسالہ کی امداد فرمائی تھی۔ ورنہ سنہ ۱۹۰۶ء کے بعد سے بارہ سال مسلسل ہزارہا روپیہ کا نقصان یکہ و تنہا ایڈیٹر رسالہ ہی کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ ع

جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

بہر حال مولوی عزیز مرزا صاحب کی ذات گرامی سے زمانہ کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، مگر آپ کی بے وقت وفات نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے محبان وطن اس قدر جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ مولوی عزیز مرزا کی زندگی کچھ اور وفا کرتی تو اردو ادب کے لیے وہ بہت کچھ کر جاتے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے

منشی کندن لال شرر سہارنپوری رائے پربھو لال حیدرآبادی، سرور جہان آبادی منشی نوبت رائے نظر لکھنوی۔ اور پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی وفات بھی بہت بے موقعہ ہوئی۔ ان حادثات سے نہ صرف زمانہ ہی کو بلکہ اردو ادب کو بحیثیت مجموعی نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ شرر صاحب کی بہترین نظمیں زمانہ کی پرانی جلدوں میں محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر آج بھی ان کی قادر الکلامی کی داد دینا پڑتی ہے۔ آپ کی موجودگی میں جب کبھی ہندو اتہاس کے متعلق کوئی تصویر رسالہ میں شائع ہوئی تو آپ ہی سے اس پر نظم لکھنے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ ہمیشہ ہماری درخواست کو بخوشی قبول فرماتے تھے۔ اس دوستانہ نوازش کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ آپ نے تمام زندگی کبھی ہماری درخواست کو رد نہیں کیا۔ اب بھی آپ کی بعض بعض نظمیں پڑھ کر بے اختیار یاد آتی ہے۔ اب بھی بزم زمانہ میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اب بھی آپ کا قلم آپ کا ماتم کر رہی ہے۔ آج آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن آپ کا دلکش کلام ہمارے دلوں کو مسرور

کرنے کو اب بھی باقی ہے۔ اور جاہد یا دیر کبھی نہ کبھی کتابی صورت میں شائع ہوگا اربعہ عناصر سے لیکر اہم سے اہم عنوانوں پر آپ نے نہایت شگفتہ نظمیں لکھی ہیں۔ جن کی بدولت آپ کا نام عرصہ تک یادگار زمانہ رہے گا۔

پربھو لال صاحب کی مذہبی مضامین اور فلسفیانہ تحریریں آپ ہی اپنی جواب ہوتی تھیں مشہور مرہٹہ لیڈر شیواجی پر جس تحقیق و تفتیش سے آپ نے ایک طولانی سلسلۂ مضمون لکھا تھا۔ اس کی داد دینے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ گیتا کے فلسفہ کو جس عام فہم پیرایہ میں آپ نے ناظرین زمانہ کے ذہن نشین فرمایا اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال بڑے بڑے اہم مسائل تمدنیہ کے متعلق آپنے ناظرین زمانہ کے لیے ایسے مشرح اور مفصل مضامین تحریر فرمائے کہ ایک معمولی اردو خواں شخص بھی ان سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر اب یہ سب باتیں روایتوں میں داخل ہوگئیں۔ اسی طرح جب سرور جہاں آبادی لنظر لکھنوی اور چکبست مرحوم کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک درد سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ آہ اب یہ صورتیں کہاں دیکھنے کو نصیب ہونگی۔ سرور جہاں آبادی صرف سینتیس برس کی عمر میں ہم سے جدا ہوگئے۔ لیکن چکبست نے چوالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ نوبت رائے صاحب نے ۵۷ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ لیکن چند سال کے علاوہ فارغ البالی کی زندگی بسر نہ کر سکے۔ اردو شاعری آج بھی ان تینوں باکمالوں کا ماتم کر رہی ہے۔ تینوں حضرات زمانہ کے مسند نشینوں میں تھے۔ زمانے کو بھی ان تینوں صاحبوں پر ہمیشہ فخر و ناز ہوگا۔ اور ان کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت ان کی سخنوری کے چرچے اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک اردو زبان کے نام لیوا دنیا میں موجود ہیں۔ چکبست صاحب زمانہ کے اجرا کے چند ہی ماہ بعد سے زمانہ میں اپنی نظمیں عطا فرمانے لگے۔ اور یہ سلسلہ ان کی زندگی بھر قائم رہا ہے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں وہ ہم سے جدا ہوئے اور نومبر ۱۹۲۵ء کے پرچے میں ان کی آخری نظم شائع ہوئی ہے۔ موجودہ ایڈیٹر زمانہ کی ادارت میں پہلا پرچہ نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔ چنانچہ اسی نمبر سے چکبست صاحب کی نظموں کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس پرچہ میں جسٹس رانا ڈے کا نوحہ وفات شائع ہوا۔ اور اس کے بعد بیسیوں مضامین اور بیسیوں نظمیں مرحوم نے زمانہ کی خاطر لکھیں۔ مضامین نثر میں سرشار اور داغ دہلوی پر وہ خاص مضامین ایسے لکھے کہ اس موضوع پر ان سے بہتر مضامین آج تک اردو میں نہیں لکھے گئے۔ چکبست جس طرح نظم میں انیس کے مقلد تھے۔ اسی طرح نثر میں انھوں نے صاحب آب حیات کے طرز تحریر کا تتبع کیا۔ دونوں میں ان کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ جس طرح ان کی نظمیں پر جوش اور برجستہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح نثر بھی نہایت شگفتہ اور پر زور لکھتے تھے۔ ان کے سنجیدہ مضامین ان کے مذہبی خیالات ان کی نسکہ رسا کے نمونے دیکھ کر دوست و دشمن سب کو ان کی قادر الکلامی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ چکبست کے کلام نے ان کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے، ہماری آیندہ نسلیں شوق سے پڑھیں گی اور ان کے کمال فن کی داد دیں گی۔

سرور جہاں آبادی کی نظمیں دلوں میں جذبات کا تلاطم برپا کر دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک بحرِ ناپیدا کنار کی سی روانی ہے۔ ان کی طبیعت سمندر کی طرح گہری۔ ان کا خیال سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح بلند تھا شعر کہنے بیٹھے تو کاغذ پر اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیتے تھے۔ جو سوز و گداز ہم کو سرور کے کلام میں ملتا ہے اسے کسی دوسرے شاعر میں ڈھونڈھنا فضول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں شاعری ہی کے لیے بنایا تھا اور شاعری کے سوا انھیں کچھ اور آتا بھی نہیں تھا بہرحال ان کی سچی تشبیہیں ان کے نئے استعارے، عمیق جذبات، حسن و عشق کی معاملہ بندیاں، دلوں میں چٹکیاں لیتی ہیں۔ سرور کی مختلف نظمیں دیکھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کمالِ فن روز افزوں ترقی کر رہا تھا اور وہ اپنے معراجِ شاعری تک پہونچنے سے پہلے زمانہ سے چھین لیے گئے۔ اگر یہ باکمال شاعر صرف دس برس بھی اور زندہ رہ سکتا تو اردو شاعری کی حالت کیا سے کیا ہو گئی ہوتی۔ کمبخت شراب کا برا ہو جس نے عنفوانِ شباب ہی میں اس یکتائے زمانہ شاعر کے پیمانۂ عمر کو لبریز کر دیا۔ سرور کو زمانہ اور اڈیٹر زمانہ سے کیسی سچی محبت تھی۔ روپے کی انھیں پروا نہ تھی۔ پابندی سے کام کرنے کے لائق نہ تھے۔ علایق کی فکر سے بالکل آزاد ہو ہی چکے تھے جس کی وجہ سے معاش کی چنداں فکر نہ تھی۔ مگر سالہا سال سے ان کا یہ دستور رہا کہ مہینوں آکر دفتر زمانہ میں قیام فرماتے۔ شروع میں چند ماہ دفتر میں باقاعدہ کام کرنے کی کوشش بھی کرتے لیکن مزاج کی وارفتگی سے عرصہ تک یہ پابندی نبھا نہ سکتے۔ لیکن اس سلسلے میں جو انس باہمی قائم ہو گیا وہ آخر دم تک بڑھتا ہی رہا اور سرور کبھی زمانہ اور اس کے اڈیٹر سے بے تعلق و بے پروا نہ رہ سکے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے خط و کتابت میں ذرا سی بھی غفلت ہوئی تو سرور صاحب ایسا تقاضا شدید کرتے کہ شرمندگی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ لگتا تھا۔ انھیں موقعوں میں سے ایک موقعہ پر ذیل کی پرلطف نظم ہاتھ لگی۔

بھیجا نہ کوئی پرچہ لکھ کر ز راہِ شفقت — اگلی سی کیا نہیں وہ تجھ پر نگاہِ شفقت
کہنا مرے مکرم سے اے نسیم جا کر — دیوانہ خاموشی ہے کیوں سدِ راہِ شفقت
شرمندۂ کرم ہے اب تک غلام دیریں — اگلی نوازشیں ہیں اب تک گواہِ شفقت
تم وہ، تمہاری شفقت خو کردہ تغافل — میں وہ مجھے تغافل پر اشتباہِ شفقت
آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں کوئے آرزو میں — چشمِ کرم ادھر بھی صاحب! ز راہِ شفقت

تم کو قسم ہے میری حرماں نصیبیوں کی
میں کب سے منتظر ہوں مجھ پر نگاہِ شفقت

اس قسم کی شعر و شاعری کا روزانہ سلسلہ رہتا تھا۔ نظموں کی فرمائشوں پر فرمائشیں ہوا کرتیں کبھی انگریزی نظموں میں نشان کر کے ان کے ترجموں کی درخواست ہوتی۔ کبھی نثر کے خاکے تیار کر کے پیش

کیے جاتے۔ بہر حال یہی چرچا رہتا۔ اور سرور مرحوم اپنے خوش اخلاقی، نیک نفسی اور قادرالکلامی سے ہمیشہ ممنون و مرہون فرمایا کرتے تھے۔ لیکن فلک ناہنجار اس لطفِ صحبت کو دیکھ نہ سکا۔ سرور صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ان کی شراب خواری تھی۔ پے در پے خانگی حادثات کی بدولت وہ اپنا غم غلط کرنے کے خیال سے اس میں مبتلا ہو گئے اور تمام احباب کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس میں اعتدال قائم نہ رکھ سکے۔ موصوف کی یہ پہلی اور آخری کمزوری تھی ورنہ کسی حیثیت سے ان کے اخلاق کے متعلق کوئی شخص آدھی بات بھی نہیں کہہ سکتا ہے، سرور صاحب کی نیک نفسی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جو لوگ تمام عمر تائب رہ چکے ہیں ان کو بھی سرور کے خاطر مدارات میں عذر نہ ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ سرور بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن آخر اسی کمبخت شراب ہی نے ان کی جان بھی لی،

منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی بھی کئی سال تک زینت افزائے بزمِ زمانہ رہے ہیں ۱۹۰۵ء میں رسالہ کا مقامِ اشاعت بریلی سے کانپور میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں طباعت وغیرہ کے انتظام کے لیے ایک مہتمم کی ضرورت پڑی چنانچہ نظرِ انتخاب نظرؔ صاحب ہی پر پڑی۔ آپ کا مشہور رسالہ خدنگِ نظر، مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ مگر دل میں ادبی خدمت کا ذوق تھا۔ اس لیے نظرؔ صاحب نے بھی اس خدمت کو دوسرے کاموں پر ترجیح دی۔ بہر حال کئی سال تک وہ منیجری کے فرائض ادا کرتے رہے۔ وہ خود بھی اچھے مصور اور خوش نویس تھے اور کتابت و طباعت دونوں سے بحیثیت فن بخوبی واقف تھے۔ اہتمام کے علاوہ حصۂ نظم کی ترتیب کا کام بھی آپ کے ذمہ تھا۔ زمانہ قیامِ کانپور میں آپ نے رسالہ کے لیے کئی خاص مضامین بھی لکھے۔ جن کو پڑھ کر آج بھی آپ کی قابلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے، نظرؔ صاحب کا ادبی مذاق نہایت سنجیدہ واقع ہوا تھا۔ ان کی طبیعت غیور، مزاج نفاست پسند اور خودداری لیے ہوئے تھا۔ غضب کے طباع اور ذہین تھے گو انگریزی میں اسکول کا معمولی کورس بھی ختم نہ کیا تھا لیکن دقیق سے دقیق مضامین کا بخوبی ترجمہ کر لیتے تھے۔ آپ کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ گو زمانہ میں آنے سے پہلے انھوں نے کبھی طرزِ جدید کی کوئی تنقید نہیں لکھی تھی لیکن چند ہی اشاروں اور مشوروں کے بعد آپ کو تنقید نگاری میں ملکہ حاصل ہو گیا۔ آپ کی پہلی تنقید "نقاد لکھنوی" کے نام سے جون ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں مثنوی گلزارِ نسیم کے متعلق شائع ہوئی تھی اس کے بعد آپ کی اکثر عالمانہ تنقیدیں شائع ہوتی رہیں۔ شکوہ آبادی، داغ دہلوی، رجب علی سرور پر آپ کے مضامین آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ زمانہ میں ایک سلسلۂ مضامین اردو رسالوں کے حصۂ نظم کی تنقید کا بھی شروع کیا گیا تھا۔ یہ بھی نظرؔ صاحب ہی کا لکھا ہوتا تھا۔ وفات سے ماہ سوا ماہ قبل "خطوطِ اکبر" پر آپ نے ایک آزاد اور عالمانہ تنقید زمانہ میں لکھی تھی جس سے آپ کے بلند پایہ

معیار کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ زمانہ میں چند سال رہ کر آپ انڈین پریس چلے گئے تھے جہاں سے اردو کا مشہور رسالہ ادیب آپ کی ایڈیٹری میں جاری ہوا۔ تھوڑے سال بعد ۱۹۱۱ء میں ایک واقعہ کے سبب سے مستعفی ہو کر لکھنؤ واپس آ گئے۔ اور بعد چندے پھر کانپور جا کر زمانہ کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ یہاں ان دنوں ہفتہ وار "آزاد" کے اجرا کی تیاریاں ہو رہی تھیں، چنانچہ اس دفعہ آپ نے اخبار کا بھی کچھ کام اپنے ذمہ لیا۔ شروع شروع میں آپ کو اس سے کسی قدر جھجک تھی۔ انھیں اس کا عملی تجربہ کبھی نہ تھا لیکن چند روز کام کرنے کے بعد آپ نے اس میں بھی کافی مہارت پیدا کر لی۔ اور اڈیٹوریل نوٹ وغیرہ لکھنے لگے۔ لیکن والدہ کی علالت و تنہائی کے خیال سے وہ اس مرتبہ زیادہ دنوں تک کانپور نہ رہ سکے۔ آخر احباب نے مطبع نولکشور لکھنؤ میں ان کے لیے گنجائش نکال دی، جہاں آپ پہلے اخبار تفریح اور بعد کو اودھ اخبار کے اڈیٹر ہو گئے۔ آپ کے وقت میں اودھ اخبار کی کایا پلٹ ہو گئی اور صوبہ کا قدیم ترین پرچہ بھی رفتارِ زمانہ سے متاثر نظر آنے لگا۔ لیکن اس کی اصلاح و ترتیب میں جو محنت شاقہ کرنا پڑی اس کا بار آپ کی طبیعت دیر تک اٹھا نہ سکی۔ پے در پے خانگی حادثات نے طبیعت کو اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ پہلے ان کا چہیتا نواسہ پھر والدہ اور اس کے بعد اکلوتی لڑکی داغ مفارقت دے گئی۔ چند ہی دنوں بعد اودھ اخبار سے بھی قطع تعلق ہو گیا۔ جس کے بعد آپ کا اطمینان قلب ہی رخصت ہو گیا آخر ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو آپ خود بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کا مجموعہ کلام بہت مختصر ہے لیکن جو کچھ ہے لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ ان کی شاعری پر خواجہ آتش کا مقولہ صادق آتا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح اپنی جگہ پر جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اپنے اشعار کے حرف حرف پر غور کامل فرمایا کرتے تھے۔ نظرِ ثانی سے کبھی ان کا جی نہیں بھرتا تھا۔ جب دیکھیے کچھ نہ کچھ رد و بدل کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی صفائی۔ بندشوں کی چستی، مذاق کی شستگی، اور فکر کی بلندی میں وہ اکثر معاصرین سے گوے سبقت لے گئے۔ نظم صاحب کلام میں ندرت مضامین اور جدت بیان دونوں ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کا ہر شعر رفعت نظری کا نمونہ ہوتا تھا۔ بھرتی کے اشعار سے انھیں دلی نفرت تھی۔ معمولی بات کو بھی نئے پیرایہ میں کہنے کی کوشش کرتے جس سے فصاحت و بلاغت کا انتہائی لطف ان کے کلام میں پیدا ہو گیا ہے۔ کبھی کوئی پیش پا افتادہ مضمون آپ نے نظم ہی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس دھن میں رہتے تھے کہ جو بات کہیں اسے سن کر لوگ پھڑک اٹھیں۔ افسوس نظم صاحب کو زندگی میں مالی اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوا۔ فارغ البالی میسر ہوتی تو شاید ان کے کلام میں یہ سوز و گداز بھی نہ ہوتا طبیعت میں خودداری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس سے اور بھی قباحت ہوتی تھی۔ اس لیے ان کے کلام میں اکثر خوددارانہ یاس اور جھلاہٹ نمایاں ہے۔ آپ نے ایک دوست کو ایک قصیدہ لکھ کر دیا تھا جس میں شکوہ کم بختی کے سلسلے میں آپ کا ایک شعر قابل اقتباس ہے۔ فرماتے ہیں۔

بے بہا جنس کی صورت ہوں جہاں میں بیکار
بکنے بھی جاؤں تو اٹھتے نہیں بازار میں دام

اسی انداز کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

مے کو دنیا آتشِ سیال کہتی ہے نظر — لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ ایک سکونِ خاطر جو میسر نہیں ہے

اے انقلابِ عالم تو بھی گواہ رہنا — کاٹی ہے عمر ہم نے پہلو بدل بدل کر

ناموافق حالات کی وجہ سے ان کی بعض نظمیں دوسروں کے حوالہ ہوگئیں، تاہم جس قدر مجموعہ کلام انھوں نے اپنے دیوان کے لیے باقی رکھا وہ بھی ان کے نام کو عرصہ دراز تک روشن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ سچ ہے۔

چشم و چراغِ دہر تھا پر چھپ کے ہو نظر کو کیا — سرمہ ہے اسکی خاک بھی دیدۂ روزگار میں

لکھنؤ کے دو اور شعرا جناب آبر و نادر کاکوروی بھی زمانہ کے خاص معاونین میں تھے لیکن ان کا شمار بھی مرحومین میں ہے۔ پنڈت کشن نرائن صاحب آبر اردو کے اچھے شاعر انگریزی کے بلند پایہ ادیب نامور نقادِ سخن اور ملک کے مشہور رہنما تھے۔ یوں تو شروع ہی سے آپ زمانہ کے سرپرست رہے لیکن جب آپ بہ سلسلۂ علالت الموڑہ تشریف لے گئے تو آپ کی ملاقات ایڈیٹر زمانہ کے ایک دلی دوست اور قریبی عزیز ڈاکٹر مادھو سرن صاحب نگم مرحوم سے ہوگئی جو خود بھی اسی نامراد مرض میں مبتلا تھے جس کے پنڈت صاحب عرصہ سے شکار تھے۔ فرشتہ خصلت مادھو سرن نے شروع ہی سے زمانہ کی اعانت و امداد کو اپنا فرض سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ جب الموڑہ میں انکا اور پنڈت صاحب کا ارتباط بڑھا تو انہوں نے زمانہ کے لیے پنڈت صاحب سے ایک اچھا خاصہ دیوان حاصل کر لیا۔ آبر صاحب نے اس مجموعہ کی سب غزلیں عزیزی مادھو سرن جی کے تفننِ طبع کے لیے کہی تھیں، اور ان پر انھیں اختیار کامل دے دیا تھا کہ جو چاہیں کریں۔ چنانچہ یہ مجموعہ ان دونوں اصحاب کی باہمی محبت کی یادگار ہے۔ اس کی غزلیں مختلف موقعوں پر مادھو سرن جی مرحوم نے خود اپنے قلم سے نہایت خوشخط لکھی ہیں۔ جناب آبر نے اس کی نظرثانی کر دی ہے۔ جس کاپی پر یہ کلام نقل کیا گیا ہے وہ اسکول کی ایک معمولی اکسر سائز کاپی ہے جس میں نام کی جگہ ڈاکٹر مادھو سرن نے اپنا نام کلاس کی جگہ "مجبوری" سکول کے نام کی جگہ تماشۂ عالمِ فانی اور سبجکٹ کے خانے میں

"دل تو کھا ہے آج یہ دونوں محب عالم بالا میں ہیں لیکن ان کی حب وطن کی نشانی اب تک اسی طرح محفوظ ہیں اور شاید کسی وقت دنیا کے روبرو پیش کر دی جائے۔ ... صاحب نے مادھو سرن جی کے وفات (۱۹۱۱ء) کے بعد زمانہ پر خاص نظر ثانی مبذول فرمائی۔ چنانچہ اس بیاض میں خاص خاص مقامات پر نیلے نشانات بنا کر بہت سے شعر خود انتخاب فرمائے ہیں۔ اس غزل کے آخر میں جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

دنیا میں درد کے لیے گر آفریدہ ہوں — یارب کسی غنیم کا اشکِ چکیدہ ہوں

آپ نے خود دفترِ زمانہ میں تشریح کی لا کر یہ دو اشعار جن سے اضافہ فرما دیئے تھے۔

میں کیا خراب محفلِ زنداں میں ہوں گا شیخ — ایمان کسی کا ہوں نہ کسی کا عقیدہ ہوں

خاموشی کا اشارہ یہ ہے گوشِ عقل سے — مجھ کو بھی سن کہ میں سخنِ ناشنیدہ ہوں

یہاں پر آپ کے چند اور اشعار بھی ناظرین کی نذر ہوں گے۔

نہ ٹپکا آنکھ سے جو اشک غم لہو ہو کر — وہ میرے دل میں رہا خونِ آرزو ہو کر

⁂

نہیں آشنا یہ بادِ بہاری ہوس کی عہد گزرتا ہے — میں ڈرتا ہوں اگر دیوار میں پانی بھی مرتا ہے

⁂

کبھی میخانہ میں یہ تفرقہ پرداز ہے — خم سے شیشہ ہے جدا شیشہ سے پیمانہ جدا

⁂

نظر آتے نہیں جو چشم بلبل کو بھی گلشن میں — نگاہِ شوق چن لیتی ہے ان پھولوں کو دامن میں

⁂

گھیرے ہیں آرزو میں جب تک ہے جان تن میں — ہے شمع سے ہجوم پروانہ انجمن میں

⁂

میں ہوں نہ رنگ آئینہ آبدیاں میں برابھی پیکری — نہ کدورت دلِ دشمناں نہ غبارِ خاطرِ یار ہوں

⁂

جن اصحاب نے پندرہ سال بیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستان" "مادرِ ہند" "دعوتِ گل" "شعاعِ امید" "شمعِ امید" "نغمۂ شاعری" وغیرہ ملاحظہ فرمائی ہیں ان کے دلوں سے اس محبِ وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے۔ افسوس نادر کاکوروی صرف ۴۵ سال کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۲ء میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ فروزاں تھا۔ اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرزِ جدید میں

خوب خوب نظمیں کہتے تھے۔ جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں۔ جب سے زمانہ کا سلسلہ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہہ کر اپنے زور طبع کا ثبوت دیا ہے۔ ایڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خورد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔ چند شعر آپ بھی سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

ہے جلوۂ برق طور سہرا ہے ساعد صاف حور سہرا	ہے موج دریائے نور سہرا ہے جوش جام طہور سہرا
نسیم جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہو یہ باقی	بہار فردوس ہنس پڑی تھی اسی ہنسی کا ظہور سہرا
پری نے پیچھے سے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہو اپنا آنچل	جو یہ نہیں ہے تو یوں کہو نگا ہے طرۂ زلف حور سہرا
فلک سے رحمت برس رہی ہے زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے	ہے رحمتوں کا نزول سہرا ہے برکتوں کا وفور سہرا

افسوس موت نے بہت جلد اس شاعر شیریں بیان کو بھی ہم سے چھین لیا۔ اردو شاعری کی بڑی بڑی امیدیں مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں۔

دیگر شعرائے اردو میں جو ہمارا ساتھ دینے کو موجود نہیں ہیں مگر جن کی حسن سلوک کی زمانہ کی گذشتہ جلدیں گواہ ہیں سید غلام آسین دہلوی۔ جناب شفق عماد پوری۔ مسٹر اماشنکر فنا۔ رشک بلند شہری۔ سید وجاہت حسین صدیقی۔ جناب انوق لکھنوی۔ حضرت طالب بنارسی گوہر لکھنوی۔ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نثر میں لالہ بالمکند گپتا۔ پروفیسر مرزا جان۔ مولوی شفیع الدین مرادآبادی۔ سردار لال سنگھ۔ سید علی سجاد عظیم آبادی۔ کنور کامتا پرشاد۔ قاضی کبیر الدین۔ مسٹر عبدالرحمٰن سہوارادی مولانا سعید احمد۔ لالہ دیوی دیال صاحب۔ لالہ مدن گوپال ایم۔ اے۔ مسٹر رام شنکر پرشاد ایڈیٹر تفریح۔ منشی جالیا پرشاد ایڈیٹر اودھ اخبار۔ رائے بہادر پیارے لال۔ رائے بہادر لالہ رام نارائن دیال۔ منشی دیبی پرشاد مورخ راجپوتانہ۔ پروفیسر نانک پرشاد۔ پنڈت مادھورام وکیل انبالہ وغیرہ اہل قلم کے احسانات فراموش ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ خصوصاً منشی دیبی پرشاد صاحب مصنف جو زمانہ کو جس نظر محبت سے دیکھتے تھے اس کی یاد سے آج بھی دل کو مسرت ہوتی ہے۔ آپ کے کثیر محققانہ تاریخی مضامین زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ راجپوتانہ قدیم سکہ جات۔ اور یہ [illegible] زمانہ کی معقول صورت آپ کو نظر [illegible] خاص [illegible] ہیں۔ آپ کی عطیہ تصویریں اکثر زمانہ میں [illegible] موقع پر آپ [illegible] زمانہ [illegible] دلچسپی لیتے تھے اور جب کبھی کوئی بات آپ [illegible] قابل [illegible] ہوتی [illegible] بزرگ تھے۔

دیکھنے کو نصیب ہوں گے۔ مشہور محب وطن مادھورام صاحب وکیل انبالہ کا پچھلے ہی سال انتقال ہوا ہے آپ بھی زمانہ کے اولین مضمون نگاروں میں تھے اور باوجود عدیم الفرصتی۔ آپ نے اس کے لیے نہایت محبت و محنت سے بیسیوں مضامین لکھے، صدہا معاملات میں ایڈیٹر زمانہ کو قابل قدر مشورے دیئے۔ بنارس کانگریس کے موقعہ پر جس خلوص و محبت کا آپ نے زبانی اظہار فرمایا جس شفقت بزرگانہ کے ساتھ آپ ہر سال راقم الحروف کو پہلے انبالہ پھر سولن میں مدعو فرمایا کرتے آج اس کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک درد سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ افسوس مکروہات دنیوی نے ایک دفعہ بھی تعمیل ارشاد کی اجازت نہ دی۔ دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں اور ہمارے ممدوح کو سفر آخرت پیش آگیا۔ پنڈت مادھورام صاحب کو ملکی فلاح و بہبود کے تمام مسائل میں دلچسپی تھی۔ ان کا دل حب الوطنی سے سرشار تھا دن رات انھیں باتوں پر جن پر ملکی ترقی کا دارومدار ہے غور رہتا۔ چنانچہ آپ نے زمانہ میں مختلف مسائل ملکی و تمدنی پر مضامین لکھے ہیں جن سے آپ کے خلوص اور حب الوطنی مترشح ہوتی ہے۔ موت سے ایک سال قبل آپ نے ہماری قومی ضروریات پر ایک قابل قدر سلسلہ مضامین لکھا تھا، بہرحال جب کبھی زمانہ کے لیے آپ سے کسی خاص مضمون کی درخواست کی گئی تو آپ نے کبھی مایوس نہیں فرمایا۔ اس حسن سلوک کو یاد کرکے بے اختیار یہی دعا نکلتی ہے کہ ایشور آپ کی روح پرفتوح کو اپنی سایۂ عاطفت میں جگہ دے۔

لالہ بالمکند گپتا ایڈیٹر بھارت مترکا ذکر اوپر آچکا ہے آپ کے خلوص و محبت کو یاد کرکے اب بھی دل بشاش ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ آپ جیسا جوہر شناس قدرداں محب دنیا میں باقی نہیں ہے تو تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لطف یہ کہ آپ قدیم خیال کے کٹر ہندو تھے۔ تاہم آپ کا زاویۂ نگاہ اور علمی نقطۂ خیال بلند تھا جس سے آپ آسانی سے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیتے تھے۔ ادنیٰ تعصبات سے آپ کی طبیعت بری تھی۔ لیکن روزمرہ روش اور طرز معاشرت میں آپ قدیم وضع کے سختی سے پابند تھے۔ سوشل ریفارم کے مسئلہ میں آپ کو زمانہ کی پالیسی سے بے حد اختلاف رائے تھا۔ لیکن رسالہ کی ترتیب و تدوین میں جو محنت کی جاتی تھی اس کی آپ سے زیادہ کوئی شخص داد نہ دیتا تھا۔ آپ جب کلکتہ سے اپنے گھر کے گاؤں جاتے تو ہمیشہ خواہ تھوڑی دیر ہی کیوں نہ ہو ایڈیٹر زمانہ سے ملنے کے لیے کانپور ضرور ٹھہر جاتے تھے شروع شروع میں تصویروں کی اشاعت میں آپ سے قابل قدر امداد ملی ہے چنانچہ اس کے کل بلاک آپ ہی اپنی معرفت بنوا دیا کرتے تھے۔ آپ کی بلند خیالی۔ آزاد منشی۔ صاف گوئی بے تکلفی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ جبتک آپ بھارت متر کے ایڈیٹر رہے کلکتہ کے مارواڑی آپ کی اخلاقی سخت گیریوں سے دبتے رہے حتی کہ خود پرو پرائٹر اخبار پر آپ کا اخلاقی رعب غالب

تھا اور وہ بے حد لحاظ کرتے تھے۔ آپ نے کبھی دولت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اور بڑے بڑے وائسرایوں کی سخت سے سخت نکتہ چینی میں دریغ نہ کیا۔

ان کی محبت اور بے تکلفی کا یہ حال تھا کہ ۱۹۰۶ء کی کلکتہ کانگریس کے موقعہ پر جب ایڈیٹر زمانہ معہ چند احباب دس بارہ دن آپ کا مہمان رہا۔ لیکن کسی دن کسی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی غیر شخص کا مہمان ہے۔ زمانہ کے لیے آپ نے ملک کے اخبارات پر ایک مسلسل مضامین لکھا۔ شیو شمبھو کے نام سے لارڈ کرزن کے نام چند کھلے چٹھے لکھے جنھیں دلاویز ظرافت کے پیرایہ میں آپ نے لارڈ ممدوح کے عہد حکومت کی سختی سے نکتہ چینی کی۔ ان چٹھوں کا ہندوستان بھر میں چرچا ہوا۔ اکثر انگریزوں نے انھیں پڑھوا کر سنا۔ بعض احباب کی فرمائش سے ان کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر کے انگلستان بھیجا گیا۔ خبر تو یہاں تک معلوم ہوئی تھی کہ خود لارڈ کرزن نے بھی انھیں پڑھوا کر داد سخن دی تھی۔ بہرحال آج بھی یہ چٹھے اپنے طرز خاص کے لحاظ سے آپ ہی اپنے جواب ہیں۔ آپ نے لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی کے خلاف "گرجن اور سرستی" کے عنوان سے ایک پرمذاق مکالمہ زمانہ سنہ ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا۔ یہ مکالمہ اپنے طرز کا ایک انوکھا مضمون ہے۔ گپتا صاحب کو سنجیدہ ظرافت کا خاص ملکہ تھا۔ پرائیویٹ صحبتوں میں مذاق ہی مذاق کے پیرایہ میں وہ اپنی باتیں کہہ جاتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ ان کی حاضر جوابیاں بڑا لطف دیتی تھیں۔ ان کی پرمذاق گفتگو۔ ان کے ڈھلے ہوئے فقرے، ان کے رکھے ہوئے نام، یاد آتے ہیں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش آپ کو کچھ دن اور احباب کی خوشی کی خاطر کا موقع ملتا۔ اخبار نویسی کی جو عزت آپ کے نگاہ میں تھی اس کے سامنے دنیا کی بادشاہت ہیچ تھی۔ وطن اور اہل وطن سے آپ کو ایسی محبت تھی کہ اپنے کو سر خادم ملک کا نیازمند سمجھتے تھے زمانہ کے ساتھ آپ کی عنایات کا کیا بیان کیا جائے۔

دل من داند من دانم و داند دل من

⁂ ⁂ ⁂

خاتون مضمون نگاروں میں یہاں پر دو مرحومہ بہنوں کے احسانات کا ذکر کرنا ضروری ہے شریمتی ہردیوی جی۔ بھارت بھگنی لاہور کی ایڈیٹر اور بزرگ قوم لالہ روشن لال صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ہماری درخواست پر ۱۹۱۱ء کے دربار نمبر زمانہ کے لیے ایک خاص مضمون تحریر فرما کر ہم کو شکر گذار بنایا تھا۔ فرقہ نسواں کی اصلاح و بہبود کے لیے آپ کی کوششیں یادگار زمانہ ہیں۔ دوسری بہن شریمتی چاند رانی کو پرلوک سدھارے ہوئے کئی سال ہو گئے لیکن ان کے متعدد مختلف مضامین جو زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ عرصہ دراز تک ان کے زور قلم اور فکر بلند کی یاد دلاتے رہیں گے۔ چاند رانی صاحبہ ایک لائق ماں کی لائق بیٹی تھیں۔ گھر ہی میں تحصیل علم کیا تھا مگر سادہ و موثر عبارت میں لی جذبات

تلمذ کرنے کا انھیں ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ عنفوانِ شباب ہی میں اپنی رفیق زندگی سے ان کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ مگر شوہر کے سوگ میں تمام عمر رونے دھونے میں کاٹنے کے بجائے انھوں نے ملک کی علمی خدمت کا تہیہ کر لیا تھا۔ افسوس زندگی نے وفا نہ کی ورنہ ان کی ذات گرامی پر ہمارے صوبہ کو بہت کچھ فخر حاصل ہوتا۔

سچ ہے "خدا کا نام رہتا ہے ہمیشہ کچھ نہیں رہتا"۔ ہمارے یہ ہمدرد و معاونین جن کی ہم رہ رہ کر یاد کر رہے ہیں، ہماری امداد و اعانت کے لیے اس عالم علم و عمل میں موجود نہیں ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ ان کا روحانی فیض اس وقت بھی ہمارے شامل حال ہے۔ ان کی ہمدردی۔ ان کی دستگیری بیکار نہیں گئی۔ ان کے کارنامے ہمیشہ یادگار زمانہ رہیں گے، اور جب تک ادب اردو کا نام و نشان باقی ہے ان کے اعلیٰ خیالات اور پاکیزہ جذبات جو زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں محفوظ ہیں، عزیزان وطن کے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے رہیں گے، اور شائقین ادب ان کے نامور ناموں کو فخر اور مسرت سے یاد کریں گے۔ ان کی مثالیں شمع ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ ان کے نقش قلم رہنمائی کا فرض ادا کرینگے۔ اور ان کی محنت و محبت کی یادگاریں آیندہ نسلوں کو بھی ملک کی ادبی خدمت پر مائل کرتی رہیں گی۔ اس وقت بھی شکر کا مقام ہے کہ خادمان ادب کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جن مقاصد کو مدنظر رکھ کر زمانہ جاری ہوا تھا ان کی تکمیل و توسیع کا کام اس وقت ملک میں ایک بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے ملک کی ادبی خدمت میں کئی معزز معاصرین بھی ہمارے ساتھ سرگرم کوشش ہیں۔ ملک کے منتخب و چیدہ اہل قلم اسی جوش و خلوص کے ساتھ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس وقت بھی اس خدمت میں ہمارے شریک کار ہیں۔ اس وقت بھی ملک کے اہل کمال ہم کو زیر بار احسان کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ہم ان کی مسلسل و پیہم عنایات کا شکریہ ادا کر سکیں۔ کوئی بضاعت نہیں کہ ہم ان کی عرق ریزیوں کا کوئی صلہ پیش کر سکیں، ہاں، ہماری گردن ان کے بار احسان سے جھکی ہوئی ہے۔ ہمارا دل ان کی شکر گذاری سے لبریز ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اور ہمارے ناظرین ان احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے محسنوں کو نہ کسی داد کی خواہش ہے اور نہ کسی صلہ کی پروا، کیونکہ وہ کسی اور خیال سے نہیں بلکہ ایک مقدس فرض سمجھ کر ملک کی ادبی خدمت کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم بھی اسی دعا پر ختم کلام کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ہمارے ہمدردوں کی عمر میں برکت دے، ان کے حوصلے بلند رہیں، ارادے کامیاب اور ارمان پورے ہوں۔ برادران وطن اپنے ملکی ادب کی قدر کریں۔ کارکنان زمانہ کا خلوص باقی اور جوش قائم رہے۔ مزید خدمت کی توفیق ہو اور اس کے لیے ان کا حوصلہ بڑھتا رہے۔ زمانہ آیندہ اس وقت سے بھی زیادہ ملک کی علمی و عملی ضروریات کو پورا کرتا رہے۔

٭ ٭ ٭

حضرت جوش ملیح آبادی

نقش و نگار و "شعلہ شبنم"

زمانہ ستمبر ۱۹۳۶ء

نقش و نگار و شعلہ و شبنم کے نام سے حال میں اردو کے شاعر اعظم حضرت جوش ملیح آبادی کے دو دلفریب مجموعے کلام جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں۔ جن میں موصوف کی متعدد دلکش نظمیں اور دلآویز غزلیں کتابی صورت میں نہایت پسندیدہ طریقے پر جمع کر دی گئی ہیں۔ اور اس نامور شاعر کا ایک پرشفقت پنسل اسکیچ بھی ہدیہ ناظرین کیا گیا ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے ہیں ان کے آبا و اجداد کو دربار اودھ میں ایک امتیازی شان حاصل تھی۔ ان کے والد۔ دادا اور پردادا سبھی شاعر تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش نے شاعری کی فضا میں آنکھ کھولی۔ اور شاعری ہی کے گود میں پرورش پائی۔ شاید اسی کی برکت ہے کہ وہ نو برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ شروع میں تین چار سال تک انھوں نے حضرت عزیز لکھنوی مرحوم سے مشورہ سخن لیا۔ اس کے بعد کسی استاد کی امداد کے بغیر مشق سخن کرنے لگے اب ایک عرصہ سے خود انکا شمار اساتذہ میں ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ موجودہ عہد میں اردو کے شاعر اعظم کہلانے کے مستحق ہیں۔

حضرت جوش نے اردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پرانے طریقے سے حاصل کی تھی انگریزی کے لیے البتہ انھوں نے اسکول و کالج کی خاک چھانی لیکن ان کی لاابالی طبیعت نے اس کو تکمیل تک نہ پہونچنے دیا کئی سال ہوئے "روح ادب" کے نام سے ان کی ابتدائی شاعری کا ایک دلچسپ مجموعہ شائع ہوا تھا جس کی اکثر نظمیں کہنہ مشقی کی شان رکھتی تھیں۔ تاہم وہ ان کی تقلیدی شاعری تھی جس پر لکھنویت کا اثر غالب تھا۔ مگر اس وقت بھی ان کا کلام نفس مضمون کی لطافت اور جدت، تخیل کے اعتبار سے قابل تحسین تھا۔ ان کے خیالات و جذبات میں صداقت معنوی کا رنگ موجود تھا۔ اور تغزل میں وہ غالب کے مقلد معلوم ہوتے تھے۔

تصوف کی جھلک بھی موجود تھی اور جا بجا ٹیگور کے طرزِ سخنوری کی تقلید بھی نمایاں تھی۔

حسنِ اتفاق سے ۱۹۲۲ء میں جوش صاحب کو حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں ملازمت کا موقعہ مل گیا۔ اور وہ اس محکمہ کے ادبی تصانیف کے نگراں کار بنا دیئے گئے۔ اس طرح کئی سال تک وہ "ناظرِ ادب" کی اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی شعر و سخن کا چرچا بھی گرم رہا اور انھیں اپنی قابلیت بڑھانے اور اس میں مزید ترقی کرنے کا موقع ملا جس سے انکا جوہرِ قابل چمک اٹھا اور وہ تقلیدی شاعری سے کنارہ کش ہو کر فطری شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس طرح جوش اقلیمِ سخن کی مقررہ ترکیبوں اور دائرۂ شاعری کی روایتی باتوں سے کنارہ کش ہو کر اصلی شاعری کا حق ادا کرنے لگے اور اپنی نازک تخیل و طرزِ ادا دونوں کے بدولت وہ اردو کی بزمِ سخن میں مسند نشینی کے حقدار ہو گئے ہیں۔

غرض شاعرانہ تخیل و طرزِ ادا دونوں لحاظ سے جوش زمانہ حال کے اردو شعرا میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ فطرتاً رند مشرب، آزاد منش، حق پرست اور بیباک واقع ہوئے ہیں۔ ان کا دل آئینہ کی طرح صاف ہے۔ طبیعت کو تملق و تصنع سے نفرت ہے۔ تخیل بلند، نگاہ وسیع اور دماغ نکتہ رس ہے۔ وہ فرقہ وارانہ ہمدردی کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں اور نہ دماغی حیثیت سے وہ کسی تنگ خیال جماعت کے ہمنوا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بنی نوع انسان کے مخلص دوست اور زمانہ بھر کی جمہوری تحریکوں کے سچے ہمدرد اور پست و پامال طبقوں کے زبردست حامی ہیں۔ ان کا خاندان زمینداری پیشہ ہے۔ اور خود ان کی زندگی عیش و عشرت کی سوسائٹی میں بسر ہوئی تاہم دماغی حیثیت سے وہ جمہوریت کے دلدادہ اور غریب ہم وطنوں اور افلاس زدہ لوگوں کے خیر خواہ ہیں۔ تنگدست مظلوم لوگوں کے درد دکھ کا ان کے دل میں سچا قلق ہے۔ جس کا اثر قریب قریب ان کی ہر نظم میں نمایاں ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ سے قومی حمیت اور ملکی غیرت کا اعلیٰ ترین معیارِ زندگی ان کے شاعرانہ تخیل کا مرکز بن گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادی حیثیت سے ملک کے اعلیٰ و عام طبقے کی معاشرت میں جو افسوسناک فرق نمایاں ہے۔ اس کا ان کی شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ گو وہ اب بھی کچھ عادت اور کچھ ضرورت سے مجبور ہو کر اہلِ دولت اور ذی اثر طبقے سے بے نیاز نہیں ہیں لیکن دماغی حیثیت سے انھیں ملک کے اہلِ ثروت و اہلِ جاہ کی زبردستیوں سے قلبی نفرت ہے۔ جس کا ثبوت ان دونوں مجموعوں کے اکثر نظموں میں قدم قدم پر ملتا ہے۔

جوش صاحب کی نظم و نثر دونوں میں انقلاب کا اکثر ذکر ہوتا ہے۔ ان کے اکثر قدردان بھی انھیں "شاعرِ انقلاب" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن ہم انھیں "اردو کا شاعرِ اعظم" سمجھتے ہیں۔ اور اسی خطاب سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کے اردو شاعروں

میں ملک کے سیاسی ماتحتی کا سب سے زیادہ قلق جوش ہی کو ہے۔ ہندو مسلمانوں کے نفاق کا بھی سب سے زیادہ رنج انھیں کو ہے۔ اس عہد میں ویسی علم و فن کے بے قدری کے لیے سب سے زیادہ آنسو بھی وہی بہاتے ہیں۔ نااہل امراء کے بھی وہ سخت مخالف ہیں اور ان کے کلام میں اکثر سوشلزم بلکہ کمیونزم کی جھلک بھی نمایاں رہتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو وہ "انقلاب" "انقلاب" پکارتے ہوئے بھی صرف موجودہ صورت حال کی خاطر خواہ اصلاح ہی چاہتے ہیں۔ اور ہر محب وطن کی طرح ملک کے غریب طبقے کو فارغ البال اور ہندوستانیوں کو اپنے گھر میں پولٹیکل حیثیت سے آزاد دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ انقلاب کے متعلق ان کا تخیل یہی ہے کہ ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ پولٹیکل غلامی باقی نہ رہے۔ اور اہل کمال کی قدر عام ہو۔ لیکن ملکی معاشرت کا خاکہ قدیم مشرقی تہذیب ہی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ اس میں وہ سر مو کوئی تبدیلی دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں اور اگر مطلق العنان شخصی سلطنت کے ذریعہ ان کا مدعا حاصل ہو سکے تو انھیں اس میں ذرا بھی عذر نہ ہوگا۔ وہ دراصل مغربی تہذیب کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اصولی حیثیت سے بھی اس کے تخیل مساوات کے خلاف ہیں۔ مثلاً عورت کو وہ محض خانگی زندگی کا امین سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی جوانوں کی دل بستگی بچوں کی پرورش اور بوڑھوں کی نگہداشت کے لیے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اسے مرد کا محبوب ہی نہیں بلکہ معبود کا درجہ تک دے سکتے ہیں۔ لیکن میدان عمل میں عورت کو مساوی حیثیت سے مرد کے دوش بدوش مصروف کار دیکھنے یا جدوجہد حیات میں برابر کا شریک بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں اور ان کا بس چلے تو وہ اس بارے میں ہٹلر و مسولینی سے بھی زیادہ سختی روا رکھیں وہ عورتوں کے اعلیٰ تعلیم کے بھی حامی نہیں ہیں۔ اور انھیں اس خیال ہی سے تکلیف ہونے لگتی ہے کہ

حسن کا آغوش رنگین دلفریب و دل ربا — علم سے بن جائے اقلیدس کا صرف اک دائرہ

مصحف روئے کتابی۔ روکش نازِ گلاب — اور بن جائے لغت یا دفتر علم حساب

آزادی نسواں کی تحریک سے بھی وہ بہت مشتبہ ہیں اور جب کبھی موقعہ ملتا ہے وہ "مغرب زدہ" ہندوستانی لیڈیوں کے مضحکہ اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ اسی طرح یورپین معاشرت کے اکثر خصوصیات کے بابت انھیں غلط فہمی ہے۔ ان کے دل میں عورت کی انتہائی قدر و منزلت ہے۔ کیونکہ ان کی رائے میں اس کی ذات بزم عالم کے تزئین۔ اور خلق اللہ کی تفریح طبع کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی حسن و عشق کی دنیا ہی ویران ہو جائے گی۔ اس لیے جذبات کے ماتحت وہ عورت کو اپنے دل کا مالک بنا دیں گے۔ لیکن ٹھنڈے دل سے کبھی برابر کا شریک اور مشیر نہ سمجھیں گے۔ اور خلوت یا گھر کی چہار دیواری کے باہر بیرونی دنیا کی جدوجہد میں اسے کوئی درجہ نہ دیں گے۔

ہمارا خیال ہے کہ جوش جب دور زریں کا راگ گایا کرتے ہیں اس کے لیے قدر شناس اہل

ثروت کی موجودگی ضروری ہے۔ البتہ ناشناس اہل دولت کے وہ جانی دشمن ہیں اور اس طبقے کو جس صورت سے بھی ممکن ہو تو فوراً معدوم کرنے کے لیے کم سے کم ذہنی طور پر تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پوزیشن اور سرمایہ داری کی اصولی مخالفت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جوش کے کلام میں سپاہیانہ رنگ بھی غالب ہے" ان کے نعرۂ مردانہ" کے چند شعر ملاحظہ ہوں

همنشیں مجھ کو لرزتے ہوئے آگاہ نہ کر — کہ بلاخیز حرارت کی نظر ہے مجھ پر

جانتا ہی نہیں درماندہ و حیراں ہونا — کھیل ہے غم سے مجھے دست و گریباں ہونا

درج ہو مجھ میں صورت کے پرستاروں کی — شب ہوتا ہو مجھے چھاؤں میں تلواروں کی

دھجہ کہتا ہوں ہیں چلتی ہوئی تلواروں پر — نیند آتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں پر

نازک اندامان کالج والی نظم میں بھی انھوں نے عیش پرست' آرام طلب نوجوانوں کو بہت سخت سست کہا ہے۔ یہ انداز بیان ناصحانہ نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہے یوں بھی ان کے الفاظ بہت جاندار ہوتے ہیں جس سے ان کا ہر شعر حیات و حرکت سے معمور رہتا ہے۔ زبان پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر وقت ان کی زور طبع کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ اور جس طرح وہ چاہتے ہیں اپنی شاعری کے سانچے میں اسے ڈھال لیتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں نئی اور تشبیہیں بالکل نرالی ہوتی ہیں۔ ان کا تخیل اچھوتا۔ ان کا طرز بیان الوکھا اور ان کے استعارے اور تخیل ہوتے ہیں۔ اور محاوروں کو تو وہ اپنی ضرورت کے موافق' اس طرح توڑ موڑ کرکے رکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کے پرکیف کلام کے لطف اندوزی میں اس کے احساس کی فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔

غرض جوش لفظ کے صحیح معنوں میں زمانہ حال کے بہترین اردو شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو چار چاند لگائے ہیں' اور بقول جناب کیفی" ان کی شاعری نے ہم کو اس قابل بنا دیا کہ ہم آنکھیں نیچی کئے بغیر اردو شاعری کو دنیا کے ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں۔"

موجودہ شعراء میں جوش نظم کے بادشاہ ہیں ان کی غزلیں ان کی نظموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں گو وہ جو کچھ کہتے ہیں پر لطف' پرکیف ہوتا ہے اور غزلوں میں بھی اکثر بلا ارادہ مسلسل نظم کا رنگ غالب ہو جاتا ہے۔

ایک سچے شاعر کی حیثیت سے جوش بھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ان کی شاعری کو حیدرآباد ہی میں تکمیل کا درجہ نصیب ہوا۔ لیکن وہاں بوجوہ ان کے شاعرانہ کمال کی واجبی قدردانی نہیں ہوئی۔ اس لیے نسبتاً فارغ البالی میسر ہونے پر بھی وہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ ہوئی اور باوجود اس کے کہ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور نظم لکھنے کا شغل

بھی جاری رہا۔ بیرونی دنیا کو ان کے شاعرانہ کمال سے زیادہ واقفیت نہ ہونے پائی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب راقم الحروف کو نستعلیق کانفرنس کے سلسلہ میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا تو اسے کلام جوش کے مختلف قلمی مجموعے دیکھ کر بڑا تعجب اور افسوس ہوا۔ تعجب حضرت جوش کے کمال فن کی ترقی پر افسوس اس بات پر کہ حیدرآباد جیسے سرپرست اردو ریاست میں ایسا زبردست شاعر اس کس مپرسی میں پڑا رہے۔ مگر ہر کمال کے لیے ایک میدان ہوتا ہے اور ہر شخص کو وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ کو دو ڈھائی سال تک کلام جوش کے مسلسل اشاعت کا فخر نصیب ہوا۔ اور ہندوستان کے قدرشناسان فن اس تاجدار اقلیم سخن کے کمال شاعری سے بخوبی واقف ہو گئے۔ تاہم دو تین سال تک اشاعت کلام کا بندوبست نہ ہو سکا۔ مگر اب جامعہ ملیہ دہلی کے توجہ اور اولعزمی سے دلکش نظمیں، خوبصورت کتابی صورت میں قلم بند ہو گئی ہیں۔

نقش و نگار اور شعلہ و شبنم دونوں میں بہت سی نظمیں وہی ہیں جو ناظرین زمانہ پہلے پڑھ چکے ہیں مگر بہت سی نئی نظمیں بھی ہیں جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ناظرین زمانہ و دیگر قدردان سخن کو ان مجموعوں کے جلد سے جلد خریدنا چاہیئے۔

ابھی جوش کی شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے نظموں کا انبار لگا دیا ہے اور ابھی ایسے ایسے کئی مجموعے شائع ہونے کو باقی ہیں۔ دراصل ان کی ذات سے اردو شاعری کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں لیکن ان کی کمال جوہر سخنوری کی مزید ترقی کے لیے اڈیٹری کے خشک فرائض سے سبکدوشی ضروری ہے۔

جوش مجسم شعر ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی بھی شاعری کے لیے وقف رہنا چاہیئے۔ حسن و عشق کے معرکے ہی اُن کے لیے کیا کم جان لیوا ہیں جو کسی مستقل ادبی خدمت کا بار بھی ان کے سر ڈالا جائے ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک نہ خواص میں فن کی قدرداتی کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور نہ عوام ہی کو اس کا خیال اور اس کی مقدرت ہے کہ وہ ملک کے اہل کمال کو ضروریات زندگی سے بے نیاز کر دیں۔ دوسرے ملکوں میں جوش جیسے شاعر کی نظموں کی آمدنی ان کی ضروریات کے لیے کافی سے زیادہ ہوتی۔ مگر ہمارے ملک میں احباب کی قدردانی زبانی تعریف تک محدود رہتی ہے۔

خیر کچھ ہو۔ جوش حسن و عشق کے بندے اور شعر و سخن کے پتلے ہونے کے بدولت۔ غم فردا سے آزاد ہیں۔ سچے حسن پرست کی حیثیت سے انھیں ہر جگہ حسن ہی حسن دکھائی دیتا ہے۔ انسانی حسن کے متعلق ان کا تخیل نہ رسمی تکلفات کا پابند ہے اور نہ کسی روایتی خصوصیات کا قائل ان کی طبیعت میں مرد

و محبت۔ شرافت و سیر چشمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

غیرت مندی کا یہ حال ہے کہ ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل | ننگ رنیوں ہی میں کٹتا تھا زمانہ جن کا
ان کے بعد اب ہیں کچھ اس طرح ملول و غمگین | کہ انھیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا
دست خالی کی طرف دیکھ کے رہ جاتا ہوں | ان کا چہرہ نظر آتا ہے جب اترا اترا

ساغر و بادہ کے وہ علانیہ قدردان ہیں۔ مگر ان کی میخواری درویشانہ ہے اور ریاکاری سے انھیں انتہائی نفرت ہے۔ رسمی مذہب کی ظاہر پرستوں کے وہ بڑے دشمن ہیں۔ چنانچہ زہد و ریاکاری" کے عنوان سے انھوں نے "ظاہر پرست ملاؤں کی" جو پرلطف تصویر کھینچی ہے۔ اس میں ان کا پورا حلیہ آ گیا ہے اور ان "شبیہ قبہ و تصویر منبر حضرات" کو "حور دل کا شوہر" کہا گیا ہے۔ "فریب خانقاہ اور ذاکر سے خطاب" نامی نظموں میں بھی ریاکاری و مذہبی نمائش سے دلی نفرت کا خوب دل کھول کر اظہار کیا گیا ہے۔

جوش کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ مہر و وفا ان کی فطرت ثانی ہے۔ خلوص اور حق پرستی ان کا شعار ہے۔ یہی باتیں ان کے شاعری میں ہر جگہ درخشاں ہیں۔ ان کے کلام کی تاثیر کا اصلی راز ان کے خلوص باطن میں پوشیدہ ہے چنانچہ اشعار ذیل میں انھوں نے حیدرآباد میں اپنی نجی زندگی کو کس پرلطف انداز سے بے نقاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے شخص! اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے | وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظر نظارۂ قدرت | طرف چمن و صحن بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی | شہر ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مرد خدا، رند خوش اوقات | رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتی کاکل و رخسار | بزم طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

رند جوش اوقات اور عاشق شاد کام ہیں۔ مگر ان کے کلام میں تصوف، فلسفہ نفسیات سبھی کچھ ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی کی روح کھینچ کر سمو دی گئی ہے۔ البتہ وہ روحانیت نہیں جو حافظ کے ہر شعر میں موجود پائی جاتی ہے۔ تاہم جوش کے کلام میں بلا کا زور ہے روانی اور گھلاوٹ کی کبھی کمی نہیں۔ ان کی بندشیں ایسی چست اور تشبیہیں ایسی درست ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کہیں ثقیل اور نامانوس الفاظ آ جاتے ہیں تو اس

ست دانہ ترکیب ہے کہ طبع نازک پر گراں نہیں گزرتے۔

"نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" دونوں متعدد ابواب میں منقسم ہیں۔ ہر باب کا نام علیحدہ رکھا گیا ہو مثلاً نقش و نگار کی پانچ ابواب میں ایک کا نام "نگارخانہ" ہے دوسرے ابواب میں کسی کو "خمریات" کسی کو "مطالعہ نظر" قرار دیا گیا ہے "نقش و نگار" میں چھوٹی بڑی کل بانوے نظمیں قطعات ہیں۔ شروع میں لطیف الدین صاحب اکبر آبادی نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں مصنف کے ذاتی و خاندانی حالات کے علاوہ ان کی شاعری پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور شعر و شاعری پر ایک فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔

"شعلہ و شبنم" کی انجمن گر ہیں" بقول مصنف" شعلے بھی ہیں شبنم بھی"۔ اس مجموعہ کے بھی چار حصے ہیں۔ "آتشکدہ" جس میں سیاسی رنگ کی نظمیں ہیں۔ "رنگ و بو" میں خالص شاعرانہ نظمیں ہیں۔ "اسلامیات" میں خدا، پیغمبر اسلام، علی وغیرہ پر نظمیں ہیں" بادہ سرجوش" میں مسلسل و غیر مسلسل غزلیں ہیں۔ جن میں جدید و قدیم رنگ تغزل دونوں کے دلکش نمونے موجود ہیں قدیم رنگ کے کلام میں بھی جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ جوش کی شاعری فرسودہ و پامال و رسمی شاعری نہیں ہے۔ ان کا تخیل بہت کچھ اور تخیل (ORIGINAL) ہوتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کے حسن و قبح کو اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے واضح کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تقلید کا شائبہ نہیں ہے۔ چنانچہ حسن و عشق ہو یا حکمت و فلسفہ۔ مناظر قدرت ہوں یا فتوحات انسانی ان کی ہمہ گیر طبیعت اور دور رس نظر سب کو اپنا بنا لیتی ہے۔ اور ہر چیز کو ایک ایسے نئے اور اچھوتے پیرائے میں پیش کرتی ہے کہ ناظرین محو حیرت ہو جاتے ہیں۔

یہاں پر کوہستان کی عورت کے عنوان سے ان کی نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ اس کی انوکھی ترکیبیں اور پرمعنی تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

یہ الٹتی عورتیں، اس جلجلاتی دھوپ میں — سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
واہ کیا کہنا ترا اے حسن ارض آفتاب — یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگین شباب
ہر سراپا بت، تراشوں کی عرق ریزی کا پھل — اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل
چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال — غارغوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں ہیں بتیال
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب — پھٹ پڑا ہے حسن یہ طوفان خیز بھرپلا شباب
یہ جواں چہرے ہیں چہروں میں برنائی کا جوش — تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش
جسم میں کچھ اس قدر ٹھوس الحفیظ و الاماں — لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں
مچھلیاں شانوں کی ابھری سی بٹی سی کلائیں — آہن و فولاد کے ہیں سلاخوں کی رگیں
دیدنی قابل ہیں ان کا زنگوں کا رمادہ روپ — کھپ چکی ہے جن میں بارش نہ سکی ہے جن کو دھوپ

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں — پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں — آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں
کیا خبر کتنے دلوں کی جوشؔ پامالی ہوئی — ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

شاعری مصوری کا اس سے بہتر نمونہ اور کونسا پیش کیا جا سکتا ہے! البتی عورتیں سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں "تپتے ہوئے سنگیں شباب" "برسات کی راتوں کے خواب" "پتھریلا شباب" یہ عجیب و غریب ترکیبیں جوشؔ کے سوا اور کہاں دیکھنے میں آ سکتی ہیں۔

ہر سراپا ہے تراشوں کی عرق ریزی کا پھل — اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

"صلابت" کا لفظ کسی قدر ثقیل بلکہ مہیب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہندی کا پیارا لفظ "سجل" کس خوبی کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ جس سے دونوں لفظ برمحل معلوم ہو رہے ہیں شاید اسی وجہ سے شعر کے حسن میں کوئی فرق آنے نہیں پایا یہ قادر الکلامی کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی طرح جامن والیوں پر جو نظم لکھی گئی ہے۔ اس میں جوشؔ نے شمال ہند کے غریب دیہاتی عورتوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ ملاحظہ ہو

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں — روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

اس مضمون میں ہم نے مفصل انتخاب کلام سے قصداً گریز کیا ہے۔ کیونکہ جوشؔ کی ہر نظم شروع سے آخر تک بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ شائقین کو ان سے بہ حیثیت مجموعی لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ واقعی جوشؔ جو کچھ لکھتے ہیں بے مثل لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ اور ہر سخن فہم اور ہر اہل دل کو اس کی قدر کرنا چاہیئے۔ دونوں کتابوں کی لکھائی چھپائی کاغذ و جلد وغیرہ بھی قابل تعریف ہے۔

⁂

اصلاح تمدن (سوشل ریفارم) کے میدان میں تو فرقہ وارانہ جد و جہد کے بغیر آپ مروجہ برائیوں کو دور ہی نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہر فرقے میں چند خاص نقائص داخل ہو گئے ہیں جن کی قرار واقعی اصلاح کسی عام تحریک کے ذریعہ آسان نہیں ہے، اس کے لیے آپ کو مجبوراً فرقہ وارانہ تحریکوں کا سہارا لینا ہوگا، جس طرح آپ کو خاص خاص بیماریوں کے لیے علیحدہ علیحدہ اسپتال قائم کرنا پڑتے ہیں اسی طرح مختلف فرقوں کے خاص خاص عیوب دفع کرنے کے لیے آپ کو علیحدہ علیحدہ کوششیں کرنا پڑیں گی۔

دیا نرائن نگم

زمانہ، دسمبر ۱۹۳۲ء

تھانیسر کی لڑائی اور اس کے اثرات

زمانہ، اگست ۱۹۳۸ء

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اسی قسم کی لڑائی بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر میں ہوئی تھی۔ جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لیے گل کر دیا۔ اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لیے یہاں مضبوطی سے جما دیئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی کے بعد ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوتِ عمل دے رکھی تھی۔ اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لیے راستہ بھی کھول دیا تھا۔ لیکن تھانیسر کی لڑائی کے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابلِ ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کے تاریخ پر پڑا۔ ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قائم کی۔ لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔

دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے درپے حملوں کا ہے مگر یہ بھی بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا۔ محمود کی وفات کے بعد چند ہی سال بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دلی میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ از سر نو کھول کر آئندہ مسلمان حملہ آوروں کے لیے اس ملک میں داخل ہونے کی یقینی راہ دکھائی دراصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔

محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اسے ہندوستان خاص تک پہونچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہو کر سرہند تک پہونچ گیا۔ جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے۔ جس کے بدولت اکثر سلطنتوں نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔

تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد جوان بھائی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بودھ مت کی بھکشنی ہو گئی، اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر چھوڑ کر قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ مگر تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ برقرار رہی اور آگے چل کر اس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہمیشہ کے لیے پلٹ دیا۔

تھانیسر کی لڑائی ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھوی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہو گئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں حکومت کرنا نصیب ہوا۔ دکن میں وجے نگر کی سلطنت ایک بجھنے والے شعلہ کی آخری بھڑک تھی اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں کا عروج بھی محض چند روزہ تھا جسے ایک طرف احمد شاہ ابدالی نے اور دوسری طرف انگریزوں نے کچل دیا۔ سیاسی حیثیت سے قطع نظر تھانیسر کی لڑائی کا ملک کے مذہب، معاشرت اور کلچر پر دائمی اثر پڑا۔ اور اس کا پولیٹیکل اثر لگ بھگ سات صدی تک باقی رہا۔

اس وقت ہندوستان میں کئی طاقتور راجپوت خاندانوں کی حکومت قائم تھی۔ جن میں قنوج کے راٹھور اور دہلی کے چوہان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوہان، دہلی اور اجمیر کے حکمران تھے۔ راٹھوروں کی حکومت قنوج کے گرد و نواح میں تھی۔ مگر چوہانوں کا عروج سب سے بڑھا ہوا تھا اور پرتھوی راج کی بہادری کا سکہ ہندوستان بھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانیسر سے متصل ہی ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھوی راج محمد غوری کو شکست فاش دے چکا تھا جس سے اس کا رتبہ تمام ہندو راجوں میں اونچا ہو گیا تھا۔ لیکن غوری کے دل میں یہ شکست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ اور ۱۱۹۲ء میں وہ اسی میدان میں ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ جس میں ترک، افغان اور دیگر دلاور جنگجو شامل تھے اپنی شکست کا بدلہ لینے آیا۔ اس وقت پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم تھی اور لاہور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اس لیے عرب راجپوتوں پر تھانیسر کے میدان میں حملہ کر سکتے تھے۔ پرتھوی راج متعدد راجاؤں اور بیشمار بہادروں کے ہمراہ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی لے کر ترائن کے میدان میں تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر مقابلہ کے لیے آ ڈٹا۔ مگر اس بار راجپوتوں کی بہادری کام نہ آئی اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ راجپوت بہادری اور جاں بازی میں کسی سے کم نہ تھے، مگر انھوں نے پچھلے تجربے سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور وہ تمام غلطیاں دہرائیں جن کی وجہ سے وہ پہلے بھی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلہ میں ہار چکے تھے۔ ان دونوں فریقین کا دارومدار سواروں پر تھا، لیکن ہندو سرداروں کو یہ گر معلوم نہ تھا

کہ تیزی سے نقل و حرکت کرنے والے سواروں کے پے در پے حملے ایک جگہ پر کھڑی ہوئی کثیر فوج کو آسانی سے پراگندہ کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہونے پر جب ہندو سواروں نے مسلمان سواروں کے پہلے حملے کو کامیابی سے روک لیا تو محمد غوری کی یہ ترکیب چلا کہ اس نے اپنی فوج کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر بقیہ فوج کے چار حصے کر کے چاروں طرف سے راجپوتوں پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سوار راجپوتوں پر حملہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس طرح تمام دن میدان کارزار گرم رہا۔ آخر کار جب راجپوت لڑتے لڑتے تھک گئے تو خود محمد غوری بارہ ہزار چیدہ اور تازہ دم سواروں و تیر اندازوں کو ساتھ لے کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ راجپوت دل کھول کر لڑے مگر وہ تھکے ہوئے تھے آخر ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پرتھی راج میدان سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن قلعہ سرستی کے قریب گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔

یہ خیال صحیح ہے کہ اگر جے چند والیٔ قنوج اس لڑائی میں پرتھی راج کا ساتھ دیتا جو اس وقت صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تمام راجپوتوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو راجپوتوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات جے چند کے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے کلنک کا ٹیکا بنی رہے گی کہ اس نے ذاتی عداوت یا پولیٹیکل رقابت سے متاثر ہو کر اس کڑی مصیبت کے وقت اپنے ملکی یا قومی آن کا کوئی خیال نہ کیا اور گو اس کی سلطنت پرتھی راج کی حکومت سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقتور تھی لیکن اس نے ملک کی حفاظت کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اگر وہ پوری قوت سے پرتھی راج کا ساتھ دیتا تو ترک اس قدر آسانی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکتے۔ مگر تقدیر اٹل ہے۔ شروع سے لے کر اب تک ہندوستان اپنی پھوٹ ہی کی وجہ سے برباد ہوتا چلا آیا ہے۔ جے چند بھی اس قومی غداری کے بعد بہت دنوں تک چین سے نہ بیٹھنے پایا پرتھی راج کی شکست کے دوہی سال بعد اس کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد راجپوت وقتاً فوقتاً مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن دہلی اور قنوج کی ریاستوں کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کے سیلاب کو روکنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ ہانسی اور اجمیر کی ریاستیں بھی آسانی سے فتح ہو گئیں اور سلطان محمد غوری قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا نائب مقرر کر کے غزنی واپس چلا گیا۔

یہاں پر اس زمانہ کے سماجک حالات کا مختصر بیان بیجانہ ہوگا۔ ذات پات کی بندشوں نے اس وقت کے ہندوؤں کو پوری مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ برہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے، حتیٰ کہ وہ موت کی سزا سے بھی مستثنیٰ تھے۔ راجپوتوں کا درجہ بھی چنداں کم نہ تھا۔ ان کی بہادری بے نظیر تھی، اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کر جان بچانے سے وہیں جان دینا کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن مصائب حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ان میں مادہ نہ تھا۔ ذاتی شان اور خاندانی آن کے لیے وہ ہر وقت

مرنے کو تیار رہتے تھے لیکن مجموعی حیثیت سے دیس یا دھرم کی حفاظت و ترقی کا انھیں چنداں خیال نہ تھا اور جتنا انھیں اپنی بات کا لحاظ اور اپنی عزت کا پاس تھا اس کا آٹھواں دسواں حصّہ بھی ملک کی شان یا قوم کی حفاظت کا لحاظ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت محکومیت کی تھی۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کا اختیار نہ تھا، ستی اور جوہر کا عام رواج تھا۔ دختر کشی بھی عیب نہ تھی۔ بچپن میں شادی کر دی جاتی تھی۔

ملک کی مالی حالت اچھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ علم و ادب کا عام چرچا تھا اور راجپوت راجوں رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور وہ پنڈتوں اور ودوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے کئی حکمران خود بھی شاعر و مصنف تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ملک میں کوئی نظام یا سنگھٹن نہ تھا اور نہ عوام کو منتشر طاقتوں کے شیرازہ بندی کی کوئی صورت تھی۔ باہمی رقابتوں اور روزمرہ خانہ جنگیوں نے ملک کو کمزور کر دیا تھا۔

تھانیسر کی لڑائی کے پہلے ہی سے بودھ مت کی جگہ شیومت اور وشنو دھرم نے لے لی تھی جس کو بھگتی کی مذہبی تحریک سے بڑی تقویت پہونچ چکی تھی۔ ملک میں ہزاروں مندر اور شوالے بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات نے اس سوشل نظام کو تہ و بالا کر دیا اور ہندو مذہب، ہندو لٹریچر اور ہندو کلچر سب کو ان سے بڑا دھکا پہونچا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے مندر توڑ کر مسجدیں بن گئیں اور بیشمار ہندو مسلمان ہو گئے۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں سطحی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لیے مسلمان حکمرانوں کو ہندو ملازموں ہی کو رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے سلطنت میں انقلاب ہو جانے کے باوجود مال گذاری کی تحصیل وصول اور عدالتوں کا کام، تعمیرات اور دیگر سول محکمے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو کاریگر ہی کام کرتے تھے۔ ہندو سناران کے سکے ڈھالتے اور ہندو پنڈت دھرم شاستر کے متعلق انھیں مشورے دیتے تھے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے جس کا ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایک جگہ سکونت رکھنے کے بعد ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے کیسے بے اثر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کر لیا جو نہ خالص ہندو تھا اور نہ خالص مسلم۔ بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا جسے ہم "ہندو مسلم کلچر" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمان دونوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اس نئے طرزِ معاشرت میں ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور سائنس نے مسلم عناصر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح ہندو مسلم تصادم سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور خود اسلام نے ہندوستان میں ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصے سے سست پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادرِ مطلق پرمیشور کا خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کر کے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آ کر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا جس کا عام خیالات پر بہت بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا ان کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیر اور گورو نانک کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ریداس، داؤد، ملوک داس، اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آ کر ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہنچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کر لیے۔

اس وقت کی تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے۔ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں خالص ہندو طرز کی نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مسلم، پرانے طرز کی جگہ لے لی ہے اس طرح مسلم تعمیرات میں صاف طور پر ہندو اثر نظر آ رہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرزِ تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے، لیکن جب یہ پہلو ہندو طرزِ تعمیر میں شامل ہو گئے تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرزِ تعمیر کی سادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوقِ آرائش[1] سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہو گئی۔ ہندو صناعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پچی کاری تو قائم رہی لیکن اس پر مخروطی محراب اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگ گئے وہ مسلم فنِ تعمیر کے خاص جز تھے۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ اس زمانہ کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا جاتا ہے، چنانچہ مغل اور راجپوت

---

[1] ORNAMENTAL

مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری اجنتا کے فن تصویر سے بہت دور مگر مغل مصوری کے بہت قریب ہے۔ دراصل مغل اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی ہے راجپوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور نائکوں کی تصویروں میں جو عورتیں بنائی گئی ہیں وہ شکل و صورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے بالکل جداگانہ ہے اور اس کو فقط "ہندو مسلم آرٹ" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ نئے طرز میں اجنتا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند اور ہرات کا تناسب اور وصل و فصل بھی موجود ہے اور انواع و اقسام کے رنگوں کے حیرت انگیز شوخی اور ان کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ مل کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا ہے۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ مسلم فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا، اور اس کی جگہ اظہار خیال کے لیے ہندی۔ مرہٹی۔ بنگالی، گجراتی زبانیں وجود میں آئیں مسلمانوں نے بھی ترکی۔ فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش ہیں۔ الفاظ۔ گرامر تشبیہات اور طرز تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری اسی اثر کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ قطب الدین ایبک کا خطاب لاکھ بخش ان دونوں زبانوں کے میل جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اہل عرب بہت دنوں پہلے ہندو علم حساب اور ہندو فن طب کے مرہون منت ہو چکے تھے لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس لیے وہ ان مضمونوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہونچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لیے اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دواسازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں۔ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں نے چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس اتحاد کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگ راگنیاں تو قبول کر لیں لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ ردوبدل کیا جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس۔ رسمیات۔ آداب محفل۔ غذا۔ کھانا پکانا سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا

Spacing -

کا گہرا اثر پڑا موجودہ حلوائی کی دکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہین منت ہے۔ خود حلوائی کا لفظ اور اکثر مروجہ مٹھائیاں گلاب جامن۔ بالوشاہی۔ امرتی وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کا تحفہ ہیں۔ روٹی بھی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ چمچہ۔ توا وغیرہ معمولی الفاظ بھی مسلمانوں کی بدولت رائج ہوئے ہیں۔ چاچا۔ چاچی۔ دادا۔ دادی۔ بیجا۔ بیجی۔ سب غیر ملکی الفاظ ہیں جو اب ہمارے روزمرہ زندگی کا ضروری جز و بن گئے ہیں۔ اماں کا لفظ بھی ہم کو ترکوں سے ملا ہے۔ ہمارا موجودہ درزی خانہ بھی مسلمانوں کا رہین منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا۔ اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے دانستہ یا نادانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے۔ آج کل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سن کر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکوں کا سانچہ قائم رکھا۔ اس کے سکوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ملبتن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ پہونچا کہ آٹھویں عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو از سر نو جاری کیا۔ چنانچہ یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعہ ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا عروج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔

٭ ٭ ٭

جب انسان حسن و عشق کے مرحلے طے کرتا کرتا منزل کمال تک پہونچ جاتا ہے تو وہاں حسن و عشق دونوں فنا ہوجاتے ہیں، نہ حسن حسن رہتا ہے اور نہ عشق عشق، بلکہ ایک عام محویت طاری ہوجاتی ہے اور دوئی کے پردے درمیان سے اٹھ جاتے ہیں اور انسان اس مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں من توشدم تو من شدی کا وظیفہ ورد زبان ہوتا ہے۔ اس منزل پر پہونچ کر منصور نعرۂ "انا الحق" لگاتا ہے اور مجنوں "انا لیلیٰ" پکارنے لگتا ہے۔

جنوری ۱۹۲۶ء دیا نرائن نگم

نگاہ خلوص بیں کا

جواب

کانپور۔ ۲۵۔ اپریل ۱۹۴۳ء

بھائی جوش! تسلیم

نفس کو تعریف کا عادی بنانا میں نے ہمیشہ جرم سمجھا۔ اور "زمانہ" کو بھی اس معصیت سے بچائے رکھا ہے، اس طرح جیسے کوئی ماں اپنی بیٹی کا نگاہِ بد بیں سے بچاتی ہے۔

پرچے میں شاذ و نادر ہی کبھی آپ نے میرا ذکر یا احباب کی خواہ مخواہ تعریف دیکھی ہوگی۔ ہاں جب کسی کے کمال کی حکومت دل پر قائم ہو جاتی ہے تو مجبوراً دو چار سطریں قلم سے نکل جاتی ہیں۔ مگر ان سطروں کو آپ وہی درجہ دیجئے جو اہلِ حکومت خراج کو دیتے ہیں۔ بعض احباب اسکو طبیعت کا فطری بخل سمجھتے ہیں۔ بعض اسے نتیجہ عارفانہ یا غرور بیجا کہتے ہیں مگر میں اپنی جگہ پر اس خصلت سے جو میری جزوِ طبیعت ہو گئی ہے شرمندہ نہیں ہوں۔ اور شاید یہ معمولی سی ادا کارسازِ حقیقی یا منتظمِ عالم کو بھا گئی۔ اور آج اس نے عمر بھر کی کمائی کا حساب آپ کی نظم کی صورت میں بیباق کر دیا ہو۔ شاید میرا انعام (اگر میں کسی انعام کا مستحق تھا) اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ اتنا افسوس ہے کہ میں دولت دنیا سے محروم ہوں ورنہ آج قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو آپ کے محبت بھرے اشعار پر تصدیق ہو جاتا۔ خواہ بچے کوستے اور دنیا جو چاہتی کہتی، مگر یہ بھی عنایت ایزدی ہے کہ آپ کی محبت کی داد دینے کی جرأت کرنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ ورنہ کمالِ فن اور خلوصِ قلب، دونوں کو اپنی اپنی جگہ شرمندگی سے منہ چھپانا پڑتا۔

آپکی نظم سننے کے بعد میری کیا حالت ہوئی؟ شاید آپ مبالغہ سمجھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب کی کیفیت ناقابلِ اظہار ہے۔

آپ کے اشعار کا اہل ہونے کے لیے میں ایک نہیں، اپنے کئی جنم نثار کرنے کو تیار ہوں۔ کسی انسان کو اس نظم کی تمنا میں سو برس بھی جینا پڑے تو کم ہے۔ دعا کیجئے کہ شاعر کے لافانی اشعار کہیں مجھے مغرور نہ بنا دیں۔ اور کہیں ان سے نفس کی بدی کو تقویت نہ مل جائے۔ زندگی کے چند لمحے جو باقی ہیں اسی قرینے سے کٹ جائیں اور بعد کو اہلِ نظر کو یہ کہنے کا حق نہ ہو کہ جوش جیسے نکتہ رس شاعر کی "نگاہ خلوص بیں" دھوکا کھا گئی تھی۔

میرے لیے یہ اشعار حاصلِ زندگی ہیں خدا کرے آپ کو یا مجھ کو ان کے لیے کم سے کم اس جہانِ آب و گل میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

آپ کا خادم
دیا نرائن نگم

بخدمت حضرت جوش ملیح آبادی صاحب

(از زمانہ یادگار نمبر ۱۹۴۳ء)

پریم چند

زمانہ، اکتوبر ۱۹۳۶ء (اقتباس)

آج جب ادبی دنیا کا یہ آفتاب عالم تاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ آج کل جب آئے دن اردو ہندی کی باہمی رقابت میں ترقی ہو رہی ہے جب ہمارے ادبی رہنما خواہ مخواہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ پریم چند کے بعد ہم کو کوئی انشا پرداز ایسا دکھائی نہیں دیتا ہے جو دونوں کے درمیان سفیرِ صلح کی خدمت انجام دے سکے اور جس سے باہمی غلط فہمیاں رفع کرنے کی امید کی جا سکے۔ ملک میں لکھنے والوں کی کمی نہیں انشا پردازوں کا قحط نہیں۔ شاعروں کی کھیپ ہر طرف بہتات ہے لیکن ایسے لکھنے والے کہاں ہیں جن کو قدرت نے تخلیق کا مادہ بخشا ہو۔ جن کو فطرت نے اتفاق و اتحاد کی تلقین کا حق عطا کیا ہو جو فرقہ وار تکلف۔ سطحی اختلافات اور ظاہری تصنع سے بالاتر ہو کر عوام کو زندگی کے حقائق کی طرف متوجہ کر سکیں اور جن کی بات دل پر نقش ہو کر بیٹھ جائے۔

پریم چند کو قدرت نے یہ مادہ فیاضی کے ساتھ عطا کیا تھا۔ جس خلوص و مستقل مزاجی بلند نظری و الوالعزمی کے ساتھ انہوں نے اپنے خداداد زورِ قلم کو ملک اور قوم کی اعلیٰ ترین خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ موجودہ زمانہ کی ادبی تاریخ کا ایک زریں کارنامہ اور ہمارے ملکی ادب کی عظیم الشان داستان کا تمہیدی باب ہے جس پر آئندہ ہماری انشا پردازی کی قدر و قیمت کا دارومدار ہوگا۔ پریم چند کے افسانے چار دانگ عالم میں ہمارے ملک اور ہمارے ادب کا نام روشن کریں گے۔

پریم چند نے اپنی تمام تصانیف میں ہم کو اپنے ملک پر فخر اور اہلِ ملک سے محبت کرنے کی عملی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے پسماندہ سے پسماندہ طبقوں کی فطری شرافت کو نمایاں کر کے وطن پرستی کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے پست و پامال لوگوں میں بھی انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر ڈھونڈ ھ نکالے ہیں۔ اُن کے ناول ترجمانِ حقیقت ہیں۔ ان کے قصے درسِ عبرت ہیں۔ ان کی سیرت نگاری نے مردانہ محاسن اور زنانہ خوبیوں کی حدیں کھینچ دی ہیں۔ ان کے ناولوں کے کیرکٹر خیالی دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ روز مرہ زندگی کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان کے مضامین رہنمائے حقیقت ہیں ان کے ڈرامے انسانی فطرت کے دلنشیں عکس ہیں۔

٭ ٭ ٭



Mrs. Daya Narain Nigam
1884 – 1939



Mr. Sri Narain Nigam M.A., LL.B. (Senior Advocate)
He Edited Zamana from 1942 to 1949

زمانہ

اپنے مضامین کے آئینہ میں

حب وطن کی منزل

لالہ لاجپت رائے

زمانہ جنوری ۱۹۰۸ء

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

گذشتہ دو سال سے جو سلوک سرکار ہند کی طرف سے باشندگان ملک کے ساتھ ہو رہا ہے اس پر ہمارے اہل وطن بہت رنجیدہ اور ناراض ہیں۔ لیکن حقیقت میں اگر غور کیا جائے تو سرکار انگریزی نے جو کارروائی کی ہے۔ وہ کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔ ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کہ ظلم اور بدمعاملگی۔ انسانی نیچر میں طبعی ہیں۔ تاہم معمولی انسانی تجربہ یہ تبلاتا ہے کہ جب کوئی شخص واحد یا جماعت انسانی ایک دفعہ کسی دوسرے کے مال و متال اور حقوق پر قبضہ کرلیتی ہے اور ایک مدت تک اس سے مستفید ہوتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ ایک نہایت ہی مشکل امر ہو جاتا ہے کہ وہ شخص یا جماعت محکوم و تحت کے دعوے پر اس کے حقوق اس کو دیدے۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک مدت کے ناجائز یا جابرانہ قبضے کے بعد شخص یا جماعت قابض کی ذہنی اور اخلاقی حالت میں ایسی تبدیلی واقع ہوتی ہے کہ اس کو فریق محکوم و ماتحت کے دعوے خلاف قدرت اور بیہودہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ اپنا جائز حق سمجھتا ہے کہ ہر قسم کے وسائل سے اپنے قبضے اور اختیارات کی حمایت اور محافظت کرے۔ اور شخص غیر قابض کو نہ صرف اس کے دعووں کی بیہودگی کا یقین دلائے بلکہ جبر و تشدد سے بھی اس کی ان سب کوششوں کا مقابلہ کرے۔ جو وہ اپنے حقوق کے واپسی کے لیے کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کے معمولی تعلقات میں یہ بات روزمرہ دیکھنے میں آتی ہے تو پولیٹیکل دنیا میں اس کا تجربہ اور مشاہدہ اور بھی وضاحت سے ہوتا ہے۔ ہم اس سے پہلے ایک تحریر میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ہم اس بات کو باور نہیں کرتے کہ اس ملک میں انگریز اہل ہند کے فائدے کے لیے آئے۔ اور ان کی موجودہ حکومت محض اہل ملک کے فائدے کی غرض سے ہے۔ انگریزی قوم کو ہندوستان پر قبضہ رکھنے میں بڑا فائدہ ہے شاہ برطانیہ کے تاج میں ہندوستان سب سے بڑا نگینہ ہے۔ شہرت۔ طاقت اور ملکی رتبہ کے علاوہ

انگریزی قوم کو ہندوستان سے بہت کچھ مالی فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں قدرتاً انگریزوں کی وہ جماعت جو ہندوستان پر حکومت کرتی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں کروڑہا ہندوستانیوں کی قسمت ہے۔ ہندوستانیوں کی ان کوششوں کو جو وہ اپنے اختیارات کی کمی اور اپنے حقوق کی بحالی کے لیے کرتے ہیں۔ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ اول تو وہ ہندوستانیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہلِ ہند کی بہبودی اسی میں ہے کہ ہندوستان کے طرز و طریق حکومت میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ لیکن جن لوگوں پر یہ جادو نہیں چلتا۔ اُن کو جبراً روکنا بھی وہ اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ اس وقت تک ہندوستانی غالباً اس خیال میں بیٹھے تھے۔ کہ جس وقت انگریزوں سے اپنے حقوق طلب کریں گے اسی وقت انھیں وہ حقوق مل جائیں گے۔ دو سال گذشتہ میں جو تجربہ اُن کو ہوا ہے۔ اس سے اُن کی ان امیدوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا یہ خیال کہ انگریز محض طلبی پر بخوشی خاطر اُن کے پولیٹیکل حقوق عطا کردیں گے محض ایک خام خیالی ہے اور ہم خوش ہیں کہ ان سب پر اب اس خیال کی غلطی ظاہر ہو گئی۔

ہم کو پہلے سے یقین کامل تھا کہ جس وقت ہندوستانیوں نے اپنے حقوق طلب کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنے آپ کو اپنے قومی رشتے میں مضبوط کرنے کا ارادہ کیا تو فوراً حکام وقت کی طرف سے اُن کی مخالفت ہوگی اور اگر ضرورت ہوئی تو جبر و تشدد سے بھی کام لیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بذات خود ہم کو اپنے حکام وقت کے کارروائیوں پر نہ کوئی حیرت ہوئی اور نہ ہے۔ ہم اپنے ذہن میں اس جبر و تشدد کے لیے بالکل تیار تھے۔ اور اسی لیے ہم کو ذاتی طور پر اس جبر سے بہت تکلیف نہیں ہوئی۔ ہم نہایت خلوص دل سے اپنے اہلِ وطن کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ قومی خدمت کا راستہ آسان گذار نہیں ہے۔

عشقبازی کار بازی نیست اے دل سرباز
زانکہ گوئے عشق نتواں زد بچوگان ہوس

جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو اس قسم کے جبر و ظلم کے لیے تیار رہنا چاہیے ورنہ اس راستہ میں قدم ہی نہ رکھنا چاہیئے۔ گورنمنٹ ہند جو کچھ کر رہی ہے وہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے دیگر گورنمنٹیں کرتی چلی آئی ہیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ہم سے پہلے دیگر ممالک کے محبان وطن کے ساتھ ہو چکا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ پس عقلمندی اور دانائی اس میں ہے کہ بغیر کسی غصہ و ناراضگی کے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کام کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس منزل میں جو تکلیفیں دنیا میں دوسرے انسانوں کو ہوئی ہیں وہ ہمیں بھی ہونگی۔ ان کے بغیر

راہ گذاری ناممکن ہے۔ خواہ مخواہ شکوہ و شکایت میں وقت ضائع کرنے اور اپنی قوتوں کے بیجا استعمال اور تصرف سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس راستہ میں نہ شکوہ و شکایت کی گنجائش ہے اور نہ شخصی نفع و نقصان کے حساب کو دخل ہے۔

خواہی کہ در گذشت شود احوال سر عشق
از شمع پرس قصہ ز باد صبا مپرس
در دفتر طبیب خرد باب عشق نیست
اے دل بدرد خو کن و نام دوا مپرس

⁂ ⁂ ⁂

میری رائے میں سودیشی تحریک کی کامیابی سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی، اختلاف اور تلخی کا ایک بوجہ بہت حد تک کمزور ہو جائے گا۔ اس وقت سرکاری عہدوں کے لیے جو کشمکش تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہے، وہ بڑی حد تک اس موجودہ افسوسناک شکر رنجی کی ذمہ دار ہے میرا خیال ہے کہ اگر سودیشی تحریک کی کامیابی سے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان سرکاری ملازمت کی ضرورت سے آزاد ہو کر اپنے ملک کی تجارتی ضروریات پوری کرنے کو اپنی ترقی و دولت کی بنیاد بنا دیں تو اس باہمی شکر رنجی کا ایک باعث اگر بالکل دور نہیں کم از کم کمزور تو ضرور ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے تجارت [illegible] تمیز کا قائم رہنا بھی اگر ناممکن نہیں تو [illegible] محض ہندوؤں کی ساخت کی اشیاء استعمال کرے گا۔ تجارتی معاملات میں باہمی اعتبار اور باہمی گہرے تعلقات کے پیدا ہونے کے بہت موقعے ہیں جو سرکاری ملازمت میں نہیں۔ سودیشی تحریک سے مسلمانوں کی بہت سی بیکار پیشہ جماعتوں کو کام ملے گا اور ان کی کمائی اور مزدوری میں معقول بیشی ہوگی جس سے ان میں سیلف ریسپکٹ کا خیال ترقی پائے گا بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ تجارت و حرفت کے معاملات میں بھی دونوں مذہبی جماعتیں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں تو بھی یہ مقابلہ ملک کے لیے مفید ہوگا اور ملک کی دولت بڑھانے میں مدد دے گا اور چونکہ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں اس واسطے مالی حالت کی بہتری اور دولت کی بیشی سے دونوں کو فائدہ پہونچے گا۔ اس میں دونوں کا مساوی انٹرسٹ ہے کہ دولت اس ملک سے باہر نہ جائے۔

زمانہ مئی ۱۹۰۶ء   لاجپت رائے

ہندی مذاق

سلطان احمد

زمانہ نومبر ۱۹۰۸ء

ترا کہ گفت کہ مائل بہ سرکستان باش
بہ نوش یک دو سہ جامے بخود گلستان باش

جن لوگوں نے زبانوں اور زبانوں کے آثار، کیفیات اور جذبات پر منصفانہ غور اور نظر کی ہے وہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی نگاہوں میں یا ادبی ترازو میں باعتبار وسعت، اثر اور مذاق کے زبانوں کی حالت مقابلتاً کیا ہے۔ جب انسان ادبی راہوں سے زبانوں کا تماشا دیکھتا ہوا گذرتا ہے۔ تو اس وقت اس تنگ چشمی یا تنگ دلی سے یہ تماشا نہیں دیکھتا جو عموماً عوام الناس کا شیوہ ہوتا ہے۔ ادبی مذاہب میں سب زبانیں ایک ہی سلسلے کی کنڈیاں ہیں اور ان میں باعتبار مراتب ایک نسبت وحدت پائی جاتی ہے۔ جس طرح باعتبار انسانیت کے سب انسان ایک ہی شاخ خلقت کے ثمر ہیں۔ اسی طرح سب زبانیں ایک ہی سلسلہ نطق یا شاخ طلاقت کی شعبہ ہیں یہ جدا بات ہے کہ ان میں باعتبار بعض حالات یا کیفیات کے گونہ امتیاز اور فرق ہو۔ مگر ان کے ایک سلسلے میں ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور ممالک کی زبانیں کچھ نہ کچھ آپس میں نسبت رکھتی ہیں اور ان سب میں ایک واسطہ ہوتا ہے۔

یہ الحاق یا اتحاد اس لیے ہے کہ قدرتی اقتضا سے زبانوں کے مبادیات قریباً ایک ہی قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ سب زبانوں کی ابجد میں کم و بیش ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتی ہیں مگر ان کی افتاد ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ مثلاً الف۔ ب۔ پ وغیرہ حروف کا تلفظ قریباً ہر ایک زبان میں یکساں ہی واقع ہوا ہے۔ ہندی میں باپ۔ انگریزی میں پادر۔ فارسی میں پالودہ ایک ہی کشش سے جو حرف پ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اطلاق پاتے ہیں بعض زبانوں مثلاً عربی اور عبرانی میں پ کا تلفظ ب سے کیا جاتا ہے وہ اس وجہ سے کہ عربوں اور عبرانیوں کی زبان پر پ کا اطلاق ثقیل ہے وہ تلفظ ان کا بھی ہندیوں، انگریزوں اور فارسیوں کی طرح ہے ایک عربی یا ایک عبرانی پالودہ یا پادر کا اطلاق بالودہ یا بادر سے کرے گا۔ صرف ثقالت کی وجہ سے بجائے تین نقطوں

کے ایک نقطہ کام دے جائے گا۔ گو مختلف زبانوں کی ابجدوں اور انفا دابجدوں میں فرق ہے مگر ابجدی سلسلے ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر زبان دوسری زبان سے ایک نسبت رکھتی ہے زبانیں دو قسم کی ہیں۔

(۱) اصل یا قدیمی زبانیں۔

(۲) جدید یا ما بعدی یا متفرع زبانیں۔

اس میں ہنوز بحث ہے کہ اصل یا قدیمی کون کون سی ہیں۔ بعض کے خیال میں حسب ذیل ہیں جرمن۔ فرنچ۔ اطالین۔ یونانی۔ سنسکرت۔ عربی۔ عبرانی۔ فارسی۔ بعض نے اس سلسلے میں کچھ ترمیم یا شکل ایزادی کی ہے۔ ان کے ماسوائے اور جس قدر زبانیں ہیں وہ ان ہشتگانہ السنہ سے رفتہ رفتہ نکلی ہیں۔

بعض کا ایسا خیال کرنا کچھ بے جوڑ نہیں۔ اگر دوسری زبانوں کے الفاظ اور معانی کا مقابلہ ان ہشتگانہ السنہ سے کیا جائے تو صدہا کیا ہزاروں الفاظ اصل زبانوں کے ان میں پائے جاتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اصل زبانوں کا سرمایہ نہ لیا گیا ہوتا تو ان کی پونجی کچھ بھی نہ تھی۔

انگریزی زبان کا سرمایۂ ذاتی نسبتاً کم ہے اطالین اور فرنچ سرمائیہ سے یہ زبان بنی ہے یا دوسری زبانوں سے عاریتاً سامان طلاقت لیا گیا ہے۔

اردو زبان کا کیا سرمایہ ہے۔ یہ زبان بنی تھی ہندی۔ فارسی۔ عربی سے اور اب رفتہ رفتہ اس میں انگریزی بھی ملتی جاتی ہے۔ اگر ہندی۔ فارسی۔ عربی کے جوڑ یا پرزے نکال دیئے جائیں تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بھاشا کا سرمائیہ سنسکرت ہے اگر اس میں سے سنسکرت کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو بھاشا بذاتہ کچھ بھی نہیں رہتی۔

جو زبان دوسری زبانوں سے مرکب ہیں اُن کی ترکیب دو جہت ہے۔

(الف) بہ جہت الفاظ و ترکیب۔

(ب) بہ جہت معانی و آثار و جذبات۔

ہر ایک مولفہ یا مرکبہ زبان میں یہ دونوں قسم کے آثار اور کیفیتیں پائی جاتی ہیں انگریزی میں فرنچ لٹریچر کی لہریں بہت کچھ پائی جاتی ہیں۔ اردو میں ہندی موجیں اپنا ٹھاٹھ دکھا رہی ہیں۔ عربی۔ فارسی بھی جھلک مارہی جاتی ہے۔ اردو زبان میں جس کثرت سے ہندی الفاظ کا ذخیرہ پایا جاتا ہے اُس کا اندازہ اور احصار مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اردو کا اندوختہ بہت کچھ ہندی ہی کے مترشح ہے۔

اردو کی بنیادوں میں ہندی الفاظ ہی کی بھرتی کی گئی ہے۔ اور سوائے اس بھرتی کے اردو کی بنیاد رہتی بھی کھوکھلی۔

گو عربی فارسی الفاظ سے بھی عمارت اردو کی رنگامیزی ہوئی ہے۔ مگر ہندی مصالحہ بہت کچھ لگایا گیا ہے اور یہ لازمی بھی تھا۔ کیونکہ ہندی سامان خاص اپنا تھا اور عربی فارسی عاریتاً لیا گیا تھا۔ ہند میں وہ پیدا ہوئی تھی اور ہند ہی میں اس نے پرورش بھی پائی ہے۔ اگر ہندی سامان میں اس کا بہت کچھ حصہ نہ ہوتا تو کس کا ہوتا۔

عربی۔ فارسی سے اردو نے جو کچھ لیا اچھے انتخاب سے لیا اور اپنے اپنے موقع پر اسے اچھا بنایا۔ اردو میں اب جس قدر الفاظ عربی فارسی کے پائے جاتے ہیں یا جن کا اس وقت استعمال ہوتا ہے وہ ایک خوبی اور متانت سے رکھے گئے ہیں اور ان سے اچھا کام لیا جا رہا ہے ان کی نشست منزل اردو میں اس خوبی اور اس عمدگی سے رکھی گئی ہے کہ ان کا ذرا سا تغیر تبدل بھی ترتیب میں فرق لاتا ہے۔ جس طرح ایک فوج صف شکنی سے بے ترتیب ہو جاتی اور بھدی لگتی ہے۔ اسی طرح اگر ان الفاظ کی صف شکنی کر کے انھیں ردیف نقطہ سے نکال دیا جائے تو اردو بھی نہیں رہتی۔

اگر ہندی الفاظ نکال دیئے جائیں تو پھر اور بھی اس کی مٹی خراب ہوتی ہے عربی فارسی الفاظ کا نکال دینا کڑیوں کا نکال دینا ہے۔ اور ہندی الفاظ سے اس کا خالی کر دیا جانا ایک شہتیر توڑ دینا ہے۔ خواہ زمانے میں کسی کی رائے کچھ ہو اب یہ وقت نہیں کہ اردو کی تختی میں سے ان زبانوں اور ان زبانوں کے الفاظ نکال کر کوئی خوبی اردو میں باقی رہ سکے اردو نے ہندی الفاظ جس طرح کثرت سے لیے ہیں اس نسبت سے ادبی دنیا میں یہ شعبہ شاعری یا نظم فارسی سے اس قدر حصہ نہیں لیا زمین نثر میں تو بہت کچھ تبعیت ہندی کی کی جاتی ہے! لیکن نظمی سلسلوں میں زیادہ تر فارسی کا زور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظموں اور شاعری میں ہندی خیالات یا ہندی جذبات کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔

اس کی سب سے بڑی وجہیں یہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) ہندی کے اصل شعبوں سے ناواقفیت

(۲) ہندی کی شاعری اور نظم سے ناآشنائی۔

اگر فارسی ذخائر کی طرح ہندی ذخیروں سے بھی کام لیا جاتا تو اس وقت اردو شاعری کی کچھ اور ہی وقعت اور وسعت ہوتی۔ یہ غلطی قابل تسلیم ہے کہ ہندی کے ذخائر کی بابت بہت کم

کوشش کی گئی اور ہندی کا حاصل کرنا پس پشت ڈالا گیا۔ ایران میں دوڑ دھوپ رہی اپنے گھر یا اپنے مسکن کی خبر تک نہ لی۔ سیفی و ناصر کے عروض پر نظر رہی۔ ان کی تقلید کا شوق رہا۔ اسی طرح غنی، سعدی اور حافظ کے کلام زیر مشق رہے۔ ہندی پنگل یعنی فن عروض، اُترا یعنی فن قافیہ۔ کاتب یعنی فن شعر سے شناسائی حاصل نہ کی نہ فن بنٹ یعنی تقطیع جانا اور نہ فروعات شعری مثلاً چھند، سانکھی، دوہا، وغیرہ سے واقفیت پیدا کی۔

اس غلطی کا صرف یہی نتیجہ نہ نکلا کہ معلومات میں ترقی نہ ہوئی۔ بلکہ یہ بھی کہ اردو کے ادبیات اور نظم شاعری میں جن قیمتی خیالات کی ضرورت تھی۔ ان سے اردو اب تک کسی حد تک خالی ہے اور دوسرے یہ کہ زبانوں کے خیالات جو بذریعہ تبادلہ خیالات کے ایک دوسری قوم کو ایک دوسرے کے قریب تر لے جاتے ہیں اُس میں بہت کچھ فرق آگیا۔

یہ بات ہمیں ہندو کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں کی فارسی آموزی سے معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ان دونوں قوموں میں فارسی کی ترقی تھی اس واسطے ان کے تعلقات اور رسم و رسوم اکل و شرب بہت کچھ مسلمانوں سے ملتے جلتے گئے۔ ان کے گھروں میں اب تک فارسی بولی جاتی ہے اور فارسی نے بخوبی ترقی کی۔

اگر اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہندی کا سلسلہ جاری ہو تو بہت کچھ خیالات کا تبادلہ ہو کر اور بھی قریب ہو جاتا بالخصوص جب شعری دنیا میں یہ جذبات بتدریج دخل کرتے جاتے تو علاوہ ادبی دنیا کے ترقیات کے سوشل روابط میں بھی ایک قیمتی افزائش ہوتی۔ فی الواقع اس وقت منجملہ اور کمیوں کے یہ کمی بھی ایسی ہے جو ملکی میل ملاپ کے راستے میں حائل ہے۔

فارسی عربی کے مذاق اور جذبات سے ہم چونکہ واقف ہیں اس واسطے اس طرف کھنچے جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح ہندی مذاق سے واقف ہوں تو اس طرف بھی ہمیں ضرور جھکنا پڑے گا۔ اور سرمایہ اردو میں ایک بے بہا ترقی ہوگی۔ بالخصوص یہ اردو شاعروں یا ناظموں کا کام ہے کہ وہ ہندی خیالات یا ہندی جذبات کا خاکہ اردو زبان میں لیں اور ہندی حاصل کر کے ہندی میں بھی طبع آزمائی کریں جب ہندو فارسی اور اردو میں قابل تعریف ملکہ حاصل کر چکے اور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان نہ کریں۔

صدہا نہیں تو بیسیوں ہندو تو ضرور ایسے قابل و لائق مل سکیں گے کہ جو فارسی اور اردو میں اچھی نثر و نظم لکھ اور کہہ سکتے ہیں۔ بتلائیے مسلمانوں میں اتنے کیا انگلیوں کی پوروں پر بھی ایسے نہیں گنے جا سکتے جو ہندی میں اس وقت فی البدیہ کیا بعد تامل و غور و احتیاط بھی کچھ کہہ سُن سکیں۔ کیا مسلمانوں کے لیے یہ کچھ تھوڑی کمی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان تنگے ہاتھ یہ کمی

بھی پوری کرنی جائیں۔ سب سے اول شاعران نازک خیال کی توجہ مبذول ہونی چاہیئے وہ یہ سیکھ لیں پھر ان کی توجہ سے یہ راہ خود بخود کھل جائیگی۔ اور اس تحریک سے اردو کی شعری دنیا میں ایسی ترقی ہوگی کہ گویا جو اس کی کمی تھی وہ بوجہ احسن پوری ہو کر تکمیل ہو جائے گی۔ ہندی کے بعض خیالات منظومہ ایسے لطیف اور موثر ہیں کہ اب تک اردو دنیا میں ان کی برابر بہت تھوڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ بیشک فارسی میں ایسی نازک خیالیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر اردو سرزمین ہنوز ان سے خالی اور محروم ہے۔

مسلمانوں میں بالعموم کاروباری دنیا کے متعلق عام تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ایک کمی ہے۔ اگر ہندی پہ زور دیا جائے تو عام جماعتوں میں سے بہت سی جماعتیں معمولی نوشت و خواند اور روز مرہ حساب و کتاب کے لیے نکل سکتی ہیں۔ اردو بھی سیکھیں اور ہندی بھی۔

میری رائے میں تو اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان ہندی کیا گو رکھی۔ لنڈے بھی سیکھیں اور انھیں میں روزمرہ کاروبار جاری رکھیں۔

علم اور سر زبان کا سیکھنا ایک بڑھتی دولت ہے۔ اس سرمایہ سے کون انکار کر سکتا ہے جو اردو نہیں سیکھ سکتے وہ ہندی سیکھیں۔ جو بھاشا نہیں جان سکتے وہ لنڈے اور پہاڑی حروف ہی میں کام کاج کریں۔

یہ تو ایک ضمنی تذکرہ تھا ہمارا روئے سخن شاعروں کی طرف ہے۔ مسلمانوں اور بالخصوص مسلمان شاعروں کا فرض ہے کہ وہ ہندی خیالات سے بھی اپنی شاعری کی وسعت اور وقعت میں ایک قیمتی اضافہ کریں ہم نے کسی اخبار میں پچھلے دنوں ایک مسلمان کے چند ہندی اشعر مناجات میں دیکھے تھے۔ خاصے اور اچھے تھے۔ اور ان میں ہندی اثر اور جذبات کی ایک عجیب کیفیت دل پر زد کرتی تھی۔

بھیکا بھوکا کوئی نہیں ہر گٹھڑی میں لال
گرہ کھول پرکھیو نہیں اس بدھ بھئے کنگال

⁘ ⁘ ⁘

نوع انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ کچھ لوگ ایسے ہوتے رہیں گے جو تکلیف برداشت کیا کریں گے اور کچھ ایسے جو دوسروں کو تکلیف دیتے رہیں گے اور بدی کا خاتمہ کبھی بھی پوری طرح سے نہ ہو سکے گا بلکہ جس طرح شعلہ روشن رہتا ہے اسی طرح یہ ایک مسلسل کیفیت ہمارے تمدن میں بھی قائم رہے گی ٹیگور

اردو زبان میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ

زمانہ جنوری ۱۹۰۶ء

ممتاز انشاء پردازوں کا ایک زمرہ ایسا بھی ہے کہ اردو زبان میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کو وحشی اور غیر مانوس الاستعمال سمجھ کر ان کے استعمال سے متنفر ہے اور یہ جانتا ہے کہ ان کے استعمال سے اردو زبان سرد یعنی بگڑی ہوئی اردو ہو جاتی ہے۔ وہ ان کا اپنی زبان میں گنجلک ترجمہ کر کے اس کے سر پہ نئے معانی کے بال جماتا ہے جو کسی طرح جمائے جمتے نہیں۔ یہ نئے الفاظ نئے معانی کو ذہن نشین نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً ڈپٹی گیٹ[1] کا ترجمہ نمائندہ کیا جاتا ہے جو قانون وقف نامی کی شرمناک اصطلاح کو یاد دلاتا ہے۔ والنٹیئر[3] کا ترجمہ رضاکار کیا جاتا ہے جو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہے۔ انارکسٹ[2] کا ترجمہ لاحکیوں کیا جاتا ہے جس کی ترکیب عربی فارسی زبان کے موافق درست نہیں۔ ڈیپوٹیشن کا ترجمہ وفد کیا جاتا ہے۔ جو ٹھیک ترجمہ ہے مگر انگریزی اور عربی الفاظ دونوں ایسے ہیں کہ وہ عام فہم نہیں۔ جیسے وفد کے معنی جانتے ہیں مشکل ہے ایسی ڈیپوٹیشن کے معنی ہیں۔ اس باب میں پنجاب یونیورسٹی کے علماء زبان دان نے جو فیصلہ اصول زبان کے موافق کیا ہے کہ جس انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے معانی اردو الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اصل الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے۔ اردو زبان کا بالطبع اقتضا یہ ہے کہ آخرکار اس فیصلہ جاری و ساری ہوگا۔ گو اس وقت اپنی زبان کے متعصبین اس کو اپنی زبان کے حق میں زہر سمجھتے ہیں۔ اور انگریزی زبان کے ممنون منت نہیں ہوتے جو اردو زبان کی اپنے الفاظ و اصطلاحات مستعار دے کر توسیع کرتی ہے اور طرح طرح کے حسن بیان پیدا کرتی ہے ان متعصبین کو اردو زبان کی اس تاریخی سرگزشت پر متوجہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی بادشاہی زبان عربی فارسی نے یہاں کی بھاشا زبان کے الفاظ کو خارج کر کے ان کی جگہ اپنا تسلط کیا۔ اسی طرح انگریزی زبان جو بادشاہی زبان ہے عربی سنسکرت فارسی زبانوں کے الفاظ کو ٹکسال باہر کر کے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا سکہ جمائے گی۔ چنانچہ اس کی مثالیں مشاہدہ میں آتی ہیں کہ روزمرہ کی بول چال میں جن انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ترجموں کو پہلے استعمال کرتے تھے اب ان کی جگہ انگریزی اصل الفاظ بولنے لگے۔ جن کی فہرست بڑی طول طویل ہے اور جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہماری زبان میں انگریزی الفاظ کے داخل ہونے

DEPUTATION [1] ANARCHIST [2] VOLUNTEER [3] DELEGATE [4]

کا حال ایسا ہی ہے جیسے کہ پہلے عربی فارسی الفاظ کے داخل ہونے کا ہوا کہ ہندوؤں نے اپنے مسلمان بادشاہ کے ساتھ ہمکلام ہونے اور اپنا مطلب آسانی سے سمجھانے کے لیے بھاشا کے الفاظ کی جگہ عربی فارسی الفاظ بولنا شروع کیے اور آخر کو اس کی نوبت یہاں تک پہونچائی کہ انھوں نے ایک نئی زبان پیدا کر دی ایسے ہی انگریزی حکام سے ہم کلام ہونے اور اپنے اغراض مطالب و مقاصد سمجھانے کے لیے عربی فارسی سنسکرت زبانوں کی جگہ ہم انگریزی الفاظ بول بول کے ایک نئی زبان اردو جس میں انگریزی زبان کا غلبہ ہوگا پیدا کر دیں گے۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کے فیصلہ پر خیال کر کے اپنی تحریرات میں نئی اصطلاحات اور الفاظ تراشنے کی تکلیف نہیں اٹھائی بے تکلف پولیٹکل اصطلاحات کے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا اور انکی معانی بہت توضیح اور تشریح کے ساتھ اپنی زبان میں بیان کر دیئے۔ بے شک انگریزی الفاظ کا تلفظ ہندستانی غلط سلط کریں گے مگر اس تلفظ کی خرابی سے زبان کو نقصان ایسا نہیں پہونچے گا جو معانی کے غلط سمجھنے سے یا نہ سمجھنے سے ہوتا ہے۔ تلفظ بھی رفتہ رفتہ ایسا ان کا ہو جائے گا کہ کچھ دشواری نہیں رہے گی۔ میری ساری عمر اپنی زبان میں مغربی خیالات کے بیان کرنے میں گذری ہے۔ مجھے ایک انگریزی ضرب المثل یاد تھی کہ جو شخص غیر زبان کے الفاظ اپنی زبان میں استعمال کرتا ہے وہ احمق ہوتا ہے اس لیے میں نے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے لیے الفاظ تراشنے میں بڑا وقت ضائع کیا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ ضرب المثل ایسے الفاظ کے لیے ہے جو ناحق اپنی زبان میں داخل کیے جاتے ہیں۔ ضرورت کی صورت میں اس کے موافق عمل نہیں ہو سکتا۔ گو میں جانتا ہوں کہ ابھی تک بہت انشا پرداز ایسے ہیں کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیصلہ کو نہیں مانتے اور اپنی زبان کے الفاظ تراشنے کو حسن بیان اور بلاغت زبان جانتے ہیں اسلئے وہ میری زبان کو شگفتہ بیانی اور رنگین بیانی اور شیریں زبانی سے خالی سمجھیں گے۔ مگر میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ مشرقی خیالات مشرقی زبان میں جو بلاغت و فصاحت رکھتے ہیں وہ مغربی خیالات مشرقی زبان میں نہیں رکھتے۔

⁂　⁂　⁂

شہرت: شہرت کا خیال کیسا دل خوش کن ہے' اس کی آرزو کیسی مسرت خیز ہے۔ اس کی تمنا کیسی دلفریب ہے کون سا دل ہے جس میں وہ جلوہ گر نہیں۔ وہ کون سا دماغ ہے جو اس کے نام سے متاثر نہیں؟ شاہ و گدا' امیر و غریب سب پر اس کی حکومت یکساں ہے۔ ہر شخص کشادہ پیشانی سے ان مصائب اور تکالیف کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے جو شہرت حاصل کرنے میں اسے پیش آتی ہیں۔ ہر شخص اس کی آن پر جان دیتا ہے اور ہر شخص کا یہی منشا خیال ہے' بھلے اور بُرے سب اس کے جویاں اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

زمانہ اپریل ۱۹۱۱ء　　　محمد یحییٰ تنہا

لکھنؤ کے پرانے سین

نوبت رائے نظر

زمانہ مارچ ۱۹۱۲ء

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

شاہانِ اودھ کی شوکت پسندیوں اور زرابستیوں کے افسانے ہندوستان سے یورپ تک مشہور ہیں اور ان میں کچھ ایسی ندرت پائی جاتی ہے کہ تمام مغربی سیاحوں نے جو گذشتہ سلطنت کے زمانۂ عروج میں یہاں آئے یا قیام پذیر رہے انھیں قلم بند کرنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے ان اولوالعزم فرمانرواؤں کے ذاتی مشاغل۔ ان کی شاہانہ زندگی اور پولیٹیکل مسائل کی پیچیدگی کو جب باہم ملا کر دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ باوجود ان سیاسی مشکلات کے جن کی مقدار روز بروز بڑھتی جاتی تھی ان کے دماغ پولیٹیکل تفکرات سے آزاد ہو کر ان کی روزانہ زندگی کو کس طرح اس قدر فرحت ناک بنا سکتے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کے حدود میں قیصر و فغفور کی سی شان و شوکت اور جمشید و خسرو کی سی عشرت پسندی قائم رکھتے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان کے آباؤ اجداد براہ راست فارس سے آئے تھے اور نیشا پور ان کا اصلی وطن تھا۔ فارس پر اگرچہ فی الحال نکبت و زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں لیکن ابتدائے زمانہ تاریخ سے اب تک وہ کم و بیش شان و شوکت اور عشرت پسندی کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ پس یہ باتیں ان حکمرانوں کی طبیعت میں خلقی طور پر موجود تھیں جن پر پولیٹیکل تفکرات غالب نہ آسکے۔ اگرچہ اودھ کے ابتدائی حکمرانوں میں دلیری جنگجوئی اور کشورستانی کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ جیسا کہ "برہان الملک" "صفدر جنگ" اور شجاع الدولہ کی تاریخوں سے واضح ہے۔ تاہم ان سپاہیانہ طبیعت کے حکمرانوں میں بھی (حالانکہ وہ محض ایک صوبہ دار کی حیثیت رکھتے تھے) شاہانہ مغلیہ کی سی شوکت پسندی اور عشرت پرستی کا شائبہ موجود تھا۔ لیکن ان کی بہادرانہ زندگی نے ان کی عشرت پسندی پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اور اخیر شاہانِ اودھ چونکہ دلیرانہ اوصاف سے تدریجاً معرا ہوتے گئے لہٰذا صرف ان کی عشرت پسندی ہی بدنما صورت میں ظاہر ہوئی بلکہ ان کی شوکت پسندی اور فیاضی

بھی معیوب معلوم ہونے لگی۔

ان بادشاہوں کی اولوالعزمیوں میں جو امر سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے وہ ملک کے قلیل محاصل ہیں جن کی تعداد کسی زمانہ میں دو کروڑ سے زیادہ نہیں ہوئی بلکہ آخیر شاہان اودھ کے محاصل گھٹتے گھٹتے ایک کروڑ سے بھی کم رہ گئے تھے۔ سعادت خاں برہان الملک کے عہد میں تقریباً سات کروڑ پس انداز ہوتے رہے تھے جو آصف الدولہ کی مشہور فیاضیوں کے کام آئے اس کے بعد سعادت علی خاں نے اپنے عہد میں تقریباً بائیس کروڑ پس انداز کیے جو غازی الدین حیدر اول بادشاہ اودھ سے لے کر نصیرالدین حیدر کے عہد تک صاف ہو گئے تھے کیونکہ جب محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے ہیں تو داروغہ خزانہ سے استفسار پر معلوم ہوا کہ خزانہ بالکل خالی ہے صرف تیس لاکھ روپیہ ایک دیوار میں چنے ہوئے تھے جو تقریباً جلوس اور حسین آباد کی تعمیر کے ابتدائی کاموں میں صرف ہوئے۔ لیکن تخت نشینی پر نذروں کی رقم اس قدر غیر معمولی تھی کہ خزانے کا ایک حصہ فوراً معمور ہو گیا اور سلطنت کے افلاس کا پردہ فاش نہیں ہونے پایا۔ نیز بادشاہ کی نقدیات کی قلت کے خزانہ اودھ جواہرات سے ہمیشہ لبریز رہا۔ اندر ہی وہ جواہر تھے جو میر قاسم ناظم بنگالہ سے شجاع الدولہ کے ہاتھ آیا تھا اور جسے میر قاسم مونگیر سے بچا کر ہاتھیوں پر بار کر کے لائے تھے۔

دربار اودھ کی دولتمندی کے افسانوں کی صداقت کے لیے صرف ایک نظیر کفایت کرتی ہے جو نواب معتمد الدولہ آغا میر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے ندیم خاص اور وزیر اعظم تھے بادشاہ کو اپنے آخری ایام سلطنت میں اپنے ولی عہد نصیرالدین حیدر سے اس قدر کشیدگی پیدا ہو گئی کہ انھیں نظر بند کر دیا۔ ولیعہد کو یقین دلایا گیا کہ اس عتاب کے بانی نواب معتمد الدولہ اور راجہ امرت لال عرض بیگی ہیں بہرکیف جب نصیرالدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ان لوگوں سے مواخذہ ایک قدرتی بات تھی آخر تھوڑے عرصے کے بعد ان کی معزولی اور ضبطی جائداد کا حکم صادر ہوا۔ راجہ امرت لال کے لیے یہ بھی حکم تھا کہ ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر تشہیر کیے جائیں۔ لیکن راجہ غیرت مند تھے۔ انھوں نے خودکشی کر لی تاہم بادشاہ کا غصہ فرو نہیں ہوا اور ان کی لاش کی تشہیر کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ تمام ہندو امرائے دولت نے اس انسانیت سے گذرے ہوئے حکم کے خلاف خود بادشاہ سے اپیل کی اور کہا کہ "آج ہمارے ایک بھائی کی لاش کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کل ہم حضور سے کیا توقع رکھیں گے۔ مناسب ہے کہ ہمارے استعفے قبول کیے جائیں اور اجازت دی جائے کہ ہم شہر چھوڑ کر کسی طرف چلے جائیں" شاہ نصیرالدین حیدر اپنے حکم کی پابندی کے لیے مشہور اور ان

معاملات میں بہت سخت تھے۔ تاہم اس خیال سے کہ تمام انتظامِ سلطنت درہم برہم ہو جاتا ہے اپنا حکم واپس لینے پر مجبور ہوئے اور راجہ مرحوم کے مکان سے شاہی پہرے اٹھا لیے گئے جائداد کی ضبطی اس سے بیشتر ہی عمل میں آچکی تھی جو سلطنت اودھ میں ایک معمولی بات تھی۔

لیکن نواب آغا میر بہت با اثر آدمی تھے اور ان کی گرفتاری یا اخراج کے لیے بادشاہ کو ریزیڈنٹ سے مدد لینے کی ضرورت لاحق آئی تھی۔ بہر حال ان کے لیے رسد، پیادہ اور کچھ مہر کا کر وہ اپنے عہدے سے معزول ہو کر کانپور چلے گئے۔ جس وقت یہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے تھے تو ان کے ہمراہ نقد و جنس کے آٹھ سو چھکڑے اور صندوق ہاتھی اور اونٹ تھے جن پر ان کا تمام مال و اسباب لدا ہوا تھا۔ جس قدر نقد و جنس اپنے ہمراہ لے گئے تھے اس کا اندازہ ایک انگریزی مورخ نے پچیس کروڑ روپیہ کیا ہے جس سے دربار اودھ کی دولت مندی پر روشنی پڑتی ہے۔ آغا میر نے اپنے زمانۂ عروج میں جس قدر دولت خرچ کر ڈالی اس کا اندازہ ناممکن ہے کیونکہ ان کا دربار شاہی دربار سے شاید ہی کچھ کم ہو۔ شہر میں ان کا محل اس قدر عظیم الشان تھا کہ مشکل سے شاہی عمارت اس کی ہمسری کر سکتی تھی اور اس کے منہدم ہو جانے پر ریلوے اسٹیشن، مجسٹریٹی اور میونسپلٹی کی کچہریاں، جوبلی ہائی اسکول، اور ایک لمبی چوڑی سڑک سب اس کے رقبہ میں سما گئے۔ تاہم ہر طرف بڑے بڑے میدان نظر آتے تھے۔ ان کی سرائے بھی ایک نہایت وسیع عمارت تھی جو کسی قدر خراب حالت میں اب تک موجود ہے اور جس میں گھوڑوں کے سوداگر ٹھہرا کرتے ہیں

شاہ نصیر الدین حیدر کا دورِ سلطنت ان کی طفلانہ حرکات کے لحاظ سے خواہ کیسا ہی تاریک دور کیوں نہ کہا جائے۔ لیکن عام دولت مندی، رفاہیت، علمی ترقی اور اظہارِ شان و شوکت کے لحاظ سے وہ ایک مرکزی دور تھا جیسے ہم شاہ جہانی عہد سے مثال دے سکتے ہیں اردو زبان کو ترقی اس عہد میں ہوئی وہ ناسخ و آتش، خلیق و ضمیر وغیرہ کے کلام سے ظاہر ہے۔ اگرچہ لوگ اب اُس مذاق شاعری کو پسند نہیں کرتے جو اس عہد کے بے شمار شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن شاعری کی علت غائی بدرجہ اتم اس میں موجود ہے۔ اور سوسائٹی کی جیسی بے عیب تصویر اس میں ملتی ہے وہ حال کی شاعری میں کبریتِ احمر کا حکم رکھتی ہے نیز اس وقت کی شاعری کا ایک معیار قائم تھا جس پر اس کی جانچ ہو سکتی تھی اور آج کل کی شاعری بلا معیار ہے جس کی جانچ کے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ شاعری کی بحث سے قطع نظر کر کے نثر اردو کو بھی اس عہد میں خاص ترقی ہوئی اور مرزا رجب علی بیگ نے "فسانۂ عجائب"، "سرورِ سلطانی"، "گلزارِ سرور" وغیرہ وغیرہ متعدد تصنیفات سے نثر اردو پر وہ احسان کیا جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا ان تمام بحثوں سے علیحدہ ہو کر جب بادشاہ کے

علمی شوق کی طرف خیال کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس پس ماندہ زمانے میں ایک شاہی رصدخانہ اس پیمانہ پر قائم ہوا تھا۔ جس کی نظیر تمام ہندوستان میں موجود نہ تھی۔ جس بے نظیر عمارت میں یہ رصد خانہ قائم کیا گیا تھا اوس کا نام "تارے والی کوٹھی" تھا جس میں بالفعل بنک آف بنگال قائم ہے۔ اور اس میں انگریزی آلات رصد مہیا کیے گئے تھے جو نہایت اعلیٰ تھے اور جو ہنگامہ غدر کے بعد یا اس سے بیشتر تلف ہو گئے نیز لیتھو گراف یعنی چھاپہ خانہ بھی اسی عہد میں پہلے پہل قائم ہوا جس کا نام مطبع سلطانی تھا اور ایک اسپتال بھی جو شاہی دارالشفا کے نام سے اب تک موجود ہے ڈاکٹر اسٹیون سن کی نگرانی میں قائم کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک محتاج خانہ بھی جس میں معذور غربا اب تک پرورش پاتے ہیں کانپور سے لکھنؤ تک ایک نہر بھی اسی عہد میں راجہ بختاور سنگھ کے اہتمام سے لائی گئی تھی اور صاحب رزیڈنٹ کے اہتمام میں ایک شاہی اسکول قائم کیا گیا تھا جس میں انگریزی تعلیم دیجاتی تھی۔

دولت مندی اور اظہار شان و شکوہ کی داستان نہایت طولانی ہے تاہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے چند حکایتیں درج کی جاتی ہیں جو ایسے مصنفین کے قلم سے نکلی ہیں جن کی نسبت مبالغے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مسز پارک اپنے سفرنامے میں ایک انگریزی خاتون کا چشم دید بیان حسب ذیل درج کرتی ہیں جو ان کی دوست تھیں اور جو شاہ نصیر الدین حیدر کی محل سرا میں اُن کی تاجپوشی واقع ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۱ء کی صبح کو بطور مہمان گئی تھیں۔

> موجودہ بادشاہ کی بیگموں کے ٹھاٹھ نہایت اعلیٰ درجے کے تھے اور بادی النظر میں وہ الف لیلے کے قصوں کے مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ خصوصاً ایک بیگم جن کا نام "تاج محل" ہے اس قدر خوبصورت ہیں کہ میں انھیں "لالہ رخ" کے سوا اور کچھ نہیں خیال کر سکتی۔ دنیا کی تمام نسلوں میں خواہ وہ گوری ہوں یا سیہ فام حسن و جمال کا ایسا کامل نمونہ میری نظر سے کبھی نہیں گذرا ان کے خط و خال کی دلکشی اور مناسبت میں قدرت نے اپنی کاریگری ختم کر دی ہے۔ ایسی خوبصورت آنکھیں اور پلکیں اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ فی الحال یہی بادشاہ کی منظور نظر ملکہ ہیں اور ان کی شادی کو ابھی ایک ہی دو مہینے گذرے ہیں۔ ان کی عمر سولہ سال کے قریب ہے قد بوٹا سا ہاتھ پاؤں نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے اور نگاہیں بہت ہی شرمیلی۔ ان کی طرحداری اور دلربائی کی یہ انتہا ہے کہ تم انھیں دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاؤ۔

وہ سرخ کمخواب کا شاہانہ (شادی کا) جوڑا پہنے ہوئے تھیں اور ان کے بالوں میں اول سے آخر تک موتی پروئے ہوئے تھے جن کی لمبی لمبی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ہر لڑی کے آخر میں بڑے بڑے موتی تھے اور یہ لڑیاں پیچدار زلفوں میں اسی طرح مخلوط تھیں جس طرح " چارلس دوم " کے حسینوں کے سنگار کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے سر پر خالص سونے کا ایک حلقہ رکھا ہوا تھا جس میں بہت بڑے بڑے موتی اور زمرد لٹک رہے تھے۔ اس کے اوپر ہما کے پر کی ایک کلغی لگی ہوئی تھی جس میں موتیوں کی لڑیاں آویزاں تھیں اور سر کے بالائی حصے کی طرف اسی طرح پھری ہوئی تھیں جس طرح ہم لوگ اپنے بال سنوارتے ہیں۔ کانوں میں سونے کی بھاری بھاری بجلیاں تھیں جن میں چاروں طرف موتی اور زمرد لگے ہوئے تھے۔ جن کی لمبی لمبی لڑیاں لٹک رہی تھیں اور موتی تدریجاً بڑھتے گئے تھے۔ ناک میں سونے کی نتھ تھی جس میں بہت ہی بڑے اور گول گول موتیوں کی جوڑی اور ایک خوشرنگ یاقوت تھا۔ اسی طرح تمام جسم میں بیشمار زیور تھے جن کی تفصیل کو ایک دفتر درکار ہے۔

ان کا نیم آستین شلوکہ ایک قسم کا چھوٹا کوٹ معلوم ہوتا تھا جس کے نیچے ایک تنگ کرتی تھی۔ اور کلیوں دار پائجامہ اس قدر گھیر دار تھا کہ جب وہ چلتی تھیں تو متعدد خواصیں ان کے لمبے لمبے پائچوں کو سنبھالے رہتی تھیں۔ اسی طرح بہت سی مشی خدمتیں ان کے کوچ کے پیچھے اس غرض سے کھڑی رہتی تھیں کہ چلنے پھرنے میں سر کے ساز (زیورات) کے جو موتی اور جواہرات بے ترتیب ہو جائیں یا زربفت کے دوپٹے میں الجھ جائیں ان کو درست کرتی رہیں۔ یہ حور نژاد بیگم دوسری بیگمات شاہی کی محسود ہیں جوان پر رشک کھاتی ہیں اور بادشاہ سلامت اور ان کی سوتیلی والدہ (بادشاہ بیگم) کی آنکھ کا تارہ ہو رہی ہیں جنھوں نے انھیں جدا جدا خطاب دیئے ہیں۔

(مسٹر پارک کی سیر جلد اول صفحہ ۸۰)

نواب تاج محل کا اصلی خطاب "خورشید محل" تھا اور در حقیقت بہت ہی حسین تھیں۔ ان کا وطن حسن پور بندھوا " تھا جو مضافات لکھنؤ میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ محل ہونے پر انھیں چھ لاکھ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی اور شروع شروع انھیں اس قدر عروج حاصل ہوا کہ خاص محل نواب سلطان بیہو۔ دختر مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ دہلی اور" نواب ملکہ زمانیہ" بھی گرد ہو گئیں بادشاہ ان پر اس قدر مہربان تھے کہ ایک روز فرط محبت سے اپنا تاج ان کے سر پر رکھ دیا اور اسی روز سے یہ" تاج محل " مشہور ہوئیں۔ بہرکیف ان کا عروج بہت عرصہ تک نہیں تاہم رہا

اور بالآخر یہ کربلائے معلی چلی گئیں جہاں مدت العمر نہایت تزک اور احتشام سے زندگی بسر کرکے رہیں۔ ان کی دولت مندی کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے انتقال پر (جو ۱۸۳۷ء میں ہوا تھا) باوجود بیشمار دولت صرف اور تلف ہو جانے کے جو رقم ان کے ورثا مقیم لکھنؤ کو بطور ترکہ حاصل ہوئی تھی اس کی مقدار پچیس لاکھ سے زائد تھی۔

شاہان اودھ کی تلون مزاجی سے ان کے ازواج میں کسی کو ایسا مستقل عروج نہیں حاصل ہوا کہ انھیں باقاعدہ "ملکہ" کہا جائے اور جو حقوق سلطنت میں شریک و سہیم رہی ہوں نام کو صدہا ملکہ ہوئیں لیکن آج کسی کو عروج حاصل ہوا کل کسی کو تاہم ان میں بعض بعض نہایت ذی اثر اور مضبوط کیرکٹر کی بیگمیں گذری ہیں۔ چنانچہ "بادشاہ بیگم" جن کا نام اوپر آچکا ہے اس قدر ذی اثر اور صاحب ثروت تھیں کہ بہت موقعوں پر انھوں نے سلطنت کا دلیرانہ مقابلہ کیا اور ہمیشہ اپنے ارادوں میں کامیاب رہیں یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کی زوجہ اور شاہ نصیر الدین حیدر کی سوتیلی والدہ تھیں جنھوں نے شاہ موصوف کو ان کی صغرسنی میں پالا تھا۔ جب غازی الدین حیدر کو اپنے بیٹے اور ولیعہد سلطنت سے کبیدگی پیدا ہوئی اور انھوں نے انھیں عاق کرنا چاہا تو بادشاہ بیگم نے نہایت دلیری سے بادشاہ کو باز رکھا اور ان کی وفات پر اسی دلیری سے اپنے سوتیلے بیٹے کو تخت نشین کر دیا۔ نصیر الدین حیدر اپنی سوتیلی والدہ پر بہت مہربان تھے اور اپنی سلطنت کے ابتدائی دور میں ان کے اشاروں پر چلتے رہے۔ لیکن قدسیہ بیگم کے انتقال پر بادشاہ بیگم سے ان بن ہوگئی اور اس نے اس قدر طول کھینچا کہ بادشاہ بیگم موصوف کی مخالفت میں اپنا سارا زور صرف کر دیا تاہم بادشاہ بیگم کا کچھ نہ بنا سکے۔ انھیں بادشاہ بیگم نے بادشاہ کی وصیت اور انگریزی رزیڈنٹ کے خلاف منا جان کو بھی تخت نشین کر دیا تھا اور اگر انگریزی حکومت کا پاؤں درمیان میں نہ ہوتا تو شاہی فوج بادشاہ بیگم کی ذاتی فوج کا مشکل سے مقابلہ کر سکتی تھی جو اکثر موقعوں پر بیگم کی زنانہ باڈی گارڈ سے ہزیمت اٹھا چکی تھی۔

مسز حسین علی ایک انگریزی خاتون نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں بادشاہ بیگم کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ خاتون اس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود تھیں۔ ہم اس دلچسپ کتاب سے چند پیراگراف ذیل میں ترجمہ کرتے ہیں جو بادشاہ بیگم کی سواری کے تزک و احتشام سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ ایک مذہبی تقریب پر حضرت عباس کی درگاہ میں تشریف لے گئی تھیں۔

"بادشاہ بیگم کی سواری کے جلوس میں سب سے پہلے مسلح سواروں کا ایک رسالہ تھا جس کے سپاہی پوری زردی پہنے ہوئے تھے اور اپنا نشان اڑاتے جاتے تھے۔ ان کے بعد پیدل فوج کی دو پلٹنیں تھیں جن کے ساتھ جنگی باجہ بجتا جاتا تھا اور جھنڈے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد

---

[1] دیکھئے مضمون ڈھائی گھڑی کی سلطنت

نیزہ برداروں کی ایک پوری جماعت تھی جو صاف و شفاف وردیاں پہنے ہوئے تھے ان کے برچھے خالص چاندی کے تھے۔ ان کے پیچھے جھنڈی بردار تھے جن کی وردیاں اور پگڑیاں بالکل سفید تھیں۔ ان کی جھنڈیاں قرمزی رنگ کی اطلس کی تھیں جن پر زردوزی کے کام تپ شاہی مہر کے بنے ہوئے تھے۔ اور جن میں خالص چاندی کی تقریباً تین نیٹ لمبی ڈنڈیاں لگی ہوئی تھیں اس کے بعد باجے والوں کی ایک پوری جماعت تھی جو ڈھول تاشے۔ جھانجھ اور نفیری وغیرہ بجاتے جاتے تھے۔ ان کے بعد خاص ڈنکا تھا جس سے بیگم صاحبہ کے مرتبے کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے بیگم صاحبہ کا عالیشان سکھپال تھا جس پر وہ سوار تھیں۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں آفتابے و سورج مکھیاں! اور چنوریاں تھیں جنھیں بیگم صاحبہ کے نہایت معتبر خواص لیے ہوئے تھے جن کی پوشاک نہایت زرق برق تھی۔

سکھپال کو نہایت قد آور اور مضبوط عورتیں (کہاریاں) اٹھائے ہوئی تھیں اور مسلح زنانہ باڈی گارڈ جنھیں ترکنیں، گھیرے ہوئے تھا جس کا فرض تھا کہ سواری کو اسی اہتمام سے درگاہ کے زنانے حصے تک پہونچا دے جہاں مردوں کا گزر نہیں ہے سکھپال کے قریب چوبداروں اور مرد موہن کی جماعتیں تھیں جن کی چوبیں اور سونٹے خالص سونے اور چاندی کے تھے۔ اور جو ہر قدم پر بیگم صاحبہ کا خطاب باآواز بلند پکارتے جاتے تھے یہی لوگ نفیروں کے اس نرغے کو بھی روکے تھے جو ان بیگموں کی مشہور فیاضی کی وجہ سے سکھپال کو گھیرے رہتے تھے اور جن کے غول میں بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا جو اسی غرض سے سکھپال کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مٹھیاں بھر بھر کے روپے پھینکتے جاتے ہیں۔

خواجہ سراؤں کا افسر اعلیٰ (نواب ناظر) سکھپال کے پیچھے ایک آراستہ ہاتھی پر سوار تھا جس کا ہودہ سونے سے منڈھا ہوا تھا اور اندر مخمل لگی ہوئی تھی۔ جس پر زردوزی کا بہت بھاری کام تھا۔ نواب ناظر ایک زرتار شملہ پہنے ہوئے تھے گلے میں زربفت کی بھاری چکن تھی اور ایک نہایت قیمتی دوشالہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ کی نہایت معزز خواصوں اور مصاحب خاتونوں کی فینسیں تھیں جن پر زربفت کے چھٹکے پڑے ہوئے تھے ان میں جو خاتونیں سوار تھیں ان کے مرتبے کی مطابقت سے فینسوں میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ اور ہر فینس کے ساتھ مسلح سپاہی۔ برچھے بردار اور چوبدار متعین تھے۔ بعد ازاں بیگم صاحبہ کے خانگی اور منفرد ہاتھیوں کی قطار تھی جو خوب آراستہ تھے اور جن پر مغرق جھولیں پڑی ہوئی تھیں سب کے آخر میں بیگم صاحبہ کی خادمہ عورتوں کے رتھوں کی ایک لمبی قطار تھی جو شمار میں پچاس تھے ہر رتھ میں چار چھ عورتیں ٹھساٹھس بیٹھی ہوئی تھیں اور سب پر نفیس پردے پڑے ہوئے تھے۔

ان میں بیگم صاحبہ کی پیش خدمتیں۔ باری دار میں۔ مغلانیاں۔ ماآمیں۔ گلوری والیاں۔ قرآن خوانیں۔ چھٹی نویسنیں۔ اور لونڈیاں باندیاں وغیرہ وغیرہ سوار تھیں۔ جن سے حضور عالیہ کی امارت کا اندازہ ہوتا تھا اور یہ بآسانی واضح تھا کہ ہندوستان کی ایک عالی مرتبت خاتون کی شان و شوکت کے لوازم میں کس قدر مختلف درجے کی خادمہ اور عورتیں درکار ہوتی تھیں۔ یہ جلوس اس تزک اور احتشام سے تقریباً آدھ گھنٹہ تک خراماں خراماں اس سڑک سے گذرتا رہا جو میرے مکان کے سامنے تھی اس کا انتظام نہایت عمدہ تھا اور اپنی غرابت اور شان و شوکت دونوں کے لحاظ سے بے حد اثر انداز تھا۔"

ایک اور انگریزی خاتون جن کا نام "مسز رابرٹس" تھا اپنی بیش بہا تصنیف سین اور کیرکٹر میں شاہ نصیر الدین حیدر کی سواری کے ایک جلوس کا ذکر حسب ذیل کرتی ہیں جب وہ بتقریب عید کے موقع پر عیدگاہ تشریف لے گئے تھے۔

جلوس کے اگلے حصے میں پچاس ہاتھیوں کی ایک طولانی قطار تھی جن پر شاہی نشان اور ماہی مراتب وغیرہ جھنڈے کھلے ہوئے تھے۔ ہر ہاتھی پر ایک پیلبان اور دو بندوقچی تھے جن کی وردیاں اور پگڑیاں سفید تھیں اور سرخ و سبز بانات کے کمربند باندھے ہوئے تھے۔ ان کے بعد توپخانے کی ایک جماعت تھی جن کے گولہ اندازوں کی وردیاں نیلی تھیں۔ اس کے بعد سواروں کے دو رسالے تھے جن کے سپاہی گلنار اطلس کی نہایت فوق البھڑک وردیاں پہنے ہوئے تھے اور چمڑے کی رنگین ٹوپیاں دیے ہوئے تھے ان کے پیچھے پیدل فوج کی ایک پلٹن تھی جس کے سپاہی نیم برہنہ تھے یا وحشیانہ طریق کا نا تمام لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پائجامے مشکل سے گھٹنوں تک پہونچتے تھے جہاں وہ سیاہ فیتوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے گلے میں لال کرتیاں اور سر پر سیاہ پگڑیاں ان کے ساتھ ایک فوجی نقارہ یا ڈنکا بھی تھا جسے وہ بجاتے جاتے تھے۔ جلوس کا سب سے زیادہ مہتم بالشان وہ حصہ تھا جس میں نجیبوں کی ایک اثر انداز جماعت کے پیچھے بادشاہ اور ان کے درباریوں کی "نیل گاڑیاں" تھیں بادشاہ معظم ایک قسم کی عالیشان نقرئی گاڑی میں تاج مرصع زیب سر کئے ہوئے اور تنگ شہی پر جلوہ گر تھے گاڑی کی چھتری اور پردے وغیرہ قرمزی رنگ کی مخمل کے تھے جن پر زردوزی کا نہایت نفیس اور بھاری کام بنا ہوا تھا اور طلائی جھالر لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں چار نہایت بلند اور آراستہ ہاتھی جتے ہوئے تھے جو ون سن رنگ روپ اور قد و قامت میں بالکل یکساں تھے دوسری گاڑیوں میں صرف دو ہی ہاتھی جتے ہوئے تھے لیکن سب کی سب سونے اور چاندی سے منڈھی ہوئی تھیں جو عالی مرتبت امرا اور ندیمان شاہی تفاخرانہ انداز سے ان گاڑیوں میں سوار تھے وہ سرے

پاؤں تک جواہرات اور زر بفت میں جگمگا رہے تھے ان کے زرتار خلعتوں میں جواہرات کی کلغیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور نہایت بیش قیمت موتی اور جواہر کے طرے۔ بازوبند۔ اور بدھیاں وغیرہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں گھنٹیلے جوتے تھے جن میں جواہرات لگے ہوئے تھے اور جو زر دوزی کپڑے یا قیمتی شال سے بنائے گئے تھے جن کی ساخت نہایت شاندار تھی۔ ان گاڑیوں کے اردگرد چوبداروں۔ خواصوں۔ ہرکاروں اور دوسرے خدام شاہی کے غول تھے جن میں بعض تلواریں چمکا رہے تھے۔ بعض چنوریاں ہلاتے تھے اور بعض باآواز بلند اپنے آقاؤں کے نام و خطاب پکارتے تھے۔ ان کے دونوں پہلوؤں میں بےقاعدہ سواروں کا ایک زبردست ہجوم تھا جو نیزہ بازی اور دوسرے فوجی کرتب دکھاتے تھے بعد ازاں بادشاہ کے کوتل گھوڑوں کی قطار تھی جو مرصع ساز و یراق سے آراستہ تھے اور جن کے سائیسوں کی وردیاں نہایت زرق برق تھیں ان کے پیچھے پیچھے شاہی پالکی اور میانہ تھا۔ یہ دیسی سواریاں نہایت شاندار تھیں۔ اور کلیتہً خالص سونے سے منڈھی ہوئی تھیں۔ جو کہار ان کو اٹھائے ہوئے تھے ان کی کارچوبی وردیاں تھیں اور پگڑیوں میں کلغی نے چاندی کی مچھلیاں اور شاہی مہر کے لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ کی کوتل بگھی بھی جلوس کی شان و شوکت میں زبردست حصہ لے رہی تھی جو انگلستان کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے اور ایک یورپین کوچبان ہنکار رہا تھا جو گلنار اطلس کی اچکن یا وردی پہنے ہوئے تھا۔ بادشاہ کے انگریز مصاحب جو ان کے فارن اسٹاف میں شامل تھے۔ درباری لباس پہنے ہوئے ہاتھیوں پر سوار تھے اور ان کے پیچھے دیسی امرا اور اعیان دولت کے ہاتھیوں کی ایک طولانی قطار تھی۔ ان سب ہاتھیوں پر گنگا جمنی ہودے رکھے ہوئے تھے اور مغرق جھولیں پڑی ہوئی تھیں سب سے آخر میں ان سواروں اور پیادوں کی پلٹنیں تھیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جھنڈے کھلے ہوئے تھے اور فوجی باجہ بجتا جاتا تھا اسی طرح تمام جلوس میں اطلس اور کمخواب کی ہزاروں سنہری روپہلی جھنڈیاں ہر جگہ ہوا میں لہرا رہی تھیں جن سے اون کی شان دوبالا ہو گئی تھی۔

اس معمولی بے ترتیبی سے قطع نظر کرکے جو ایسے عظیم الشان جلوس کے لیے لازمی ہے تمام جلوس بغیر کسی خاص بے ترتیبی کے جو سپاہیوں کی سخت شوری سے قریب القیاس تھی اسی شان و شوکت سے منزل مقصود تک پہنچ گیا جہاں دیسی نقاروں اور بوق و قرنا کے زبردست شور کا یورپین باجے بھی ناکام مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر بادشاہ کی سواری عیدگاہ کے اندر داخل ہوئی اور مجتہد العصر نے نماز و خطبہ وغیرہ مذہبی رسوم ادا کرنے کے بعد ایک چھرا پیش کیا جسے بادشاہ نے کلمۂ تکبیر کے ساتھ ایک اونٹ کے حلق پر پھیر دیا جو قربانی کے لیے منتخب کیا گیا تھا

توپخانے کے گولنداز اسی وقت کے منتظر تھے اور انھوں نے اشارہ پاتے ہی توپیں اور بندوقیں داغنا شروع کر دیں جن کی گھن گرج آوازوں سے شہر کے ہر گوشے میں اطلاع ہو گئی کہ بادشاہ سلامت قربانی کی رسم ادا کر چکے۔"

⁂ ⁂ ⁂

مہاتما گاندھی کے خیالات مطبوعہ زمانہ فروری ۱۹۴۰ء کے چند پیراگراف۔

مہاتما گاندھی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے' ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے اور وہ موجودہ زمانہ کے بہترین مفکر و سیاست داں خیال کئے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے بعض خیالات سے نیک نیتی کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے' تاہم ان کے اکثر خیالات اخلاقی حیثیت سے ہر مذہب و ملت کے افراد کے لیے یکساں مفید و کارآمد ہیں چنانچہ اسی خیال سے گاندھی جی کے بعض خیالات پیش کئے جاتے ہیں۔

تعلیم و تربیت: تعلیم کی بنیاد تعمیر سیرت ہے اور طالب علم کے لیے بہترین درسی کتاب اس کا معلم ہے بچے کانوں سے سن کر جتنا سیکھ لیتے ہیں' کتابیں پڑھ کر نہیں سیکھ سکتے۔

معلم کو بچوں کے سامنے اور ان کے پیچھے ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے کوئی نامناسب فعل سرزد نہ ہو۔

بزدل معلم اپنے شاگرد کو بہادر نہیں بنا سکتا۔

جو ہندوستانی والدین اپنے بچوں کو بچپن سے انگریزی بولنا اور انگریزی میں سوچنا سکھاتے ہیں' وہ اپنے بچوں اور ملک دونوں کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ ان کو قوم کے روحانی و مجلسی ورثہ سے محروم کر دیتے ہیں۔

فرض و خدمت: آدمی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنا کام انجام دینا چاہیئے۔ خواہ اس میں اسے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔ اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مرجانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

جو کام ایک بار شروع کر دیا جائے اس کو کبھی ادھورا نہ چھوڑنا چاہیئے سوائے اس صورت کے کہ اس میں کوئی اخلاقی خرابی نظر آئے۔

خدمت اسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے جبکہ آدمی کو اس میں کچھ لطف آئے۔ وہ خدمت جس میں آدمی کو خوشی نہ ہو' نہ خادم کے کام آتی ہے نہ مخدوم کے' لیکن دلی مسرت کے ساتھ جو خدمت کی جائے اس کے سامنے دنیا کی تمام دولت و راحت ہیچ ہے۔

خدمت کوئی ایسا درخت نہیں ہے کہ ہر زمین پر نشو و نما پا سکے۔ اس کے لیے پہلی شرط خلوص نیت اور دوسری تجربہ ہے

ابوالفضل راز چاند پوری

ڈھائی گھڑی کی سلطنت

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

زمانہ جنوری ۱۹۰ء

جولائی کی ۷ تاریخ سنہ ۱۸۳۷ء آدھی رات کرنیل لو صاحب کو خبر ملی کہ بادشاہ اودھ حضرت نصیر الدین حیدر دفعتاً بیمار ہو کر حالت نزع میں ہیں تو فوراً ایک ہزار سپاہی مع توپوں کے خزانے کی حفاظت کے لیے بارگاہ شاہی میں بھیج دیئے اور خود محل میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ حضرت نے ایک آہ سرد کھینچی اور جان بحق ہوئے۔ یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ بادشاہ ایسے سخت مرض میں مبتلا ہیں اس لیے بمشورہ کرنیل لو صاحب کے فصد لی گئی۔ خون نہ نکلا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس وقت مسٹر لو نے سپاہیوں کو بارگاہ شاہی کے سب دروازوں پر متعین کر کے آمد و رفت کی ممانعت کر دی اور تمام اسباب کو سربند کر کے مہر لگا دی اور فوج انتظام کے لیے طلب کر لی۔ اس کے بعد کرنیل صاحب نے نواب گورنر جنرل بہادر کے حکم کے مطابق ایک دستاویز عہدنامہ جدید کی زبان فارسی میں لکھوا کر جس بادشاہ کو تخت نشینی کے لیے تجویز فرمایا تھا ٹھیک ایک بجے رات کو دستخط کرانے کے لیے بھیجی۔ یہ بادشاہ محمد علی شاہ تھے۔ بادشاہ کو کرنیل صاحب کے آدمیوں کی آمد کی خبر پہلے سے نہ تھی اور یہ لوگ دفعتاً بے وقت در دولت پہ حاضر ہوئے اس لیے حصول ملاقات میں قدرے توقف ہوا۔ جب حاضری کے وقت دستاویز کرنیل صاحب کی پیش کی گئی بادشاہ نے برضا و رغبت بغیر کسی اعتراض و اغماض کے مہر ثبت فرمائی اور لکھ دیا کہ تمام شرطیں مجھے منظور ہیں۔ دستاویز دفتر رزیڈنسی یعنی بیلی گارڈ میں پہنچ گئی تو کرنیل صاحب نے چند آدمی بادشاہ کی طلب کے لیے بھیجے مگر بادشاہ نے بسبب کسل طبیعت گھڑی دو گھڑی استراحت فرمائی۔

بادشاہ بیگم اور منا جان بارگاہ سلطانی سے چار میل کے فاصلے پر الماس باغ میں قیام پذیر تھے اور بادشاہ کی عیادت کو آنا چاہتے تھے۔ مگر کرنیل صاحب نے کہلا بھیجا کہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں لیکن سپاہی تین بجے رات کو واپس آ کر خبر لایا کہ بیگم صاحبہ آ رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ زندگی میں بادشاہ کے دیدار سے محروم رکھا تو کیا اب جنازہ بھی نہ دیکھنے پاؤں گی خدا کے لیے مجھے نعش تو دکھا دیں کرنیل صاحب نے فوراً ایک آدمی اور سپاہ طلب کرنے کے لیے بھیجا مگر اسے سپاہ نہ ملی اور خالی واپس آیا۔ راستے میں اس نے بیگم صاحبہ کے آنے کی خبر سنی۔ یہاں آ کر دیکھا کہ کرنیل لو سامان جلوس کی تیاریوں میں مشغول تھے۔

اور جب لشکر کثیر کے ہمراہ بادشاہ بیگم کے آنے کی خبر سنی تو متحیر ہوئے اور اسی وقت کپتان پاٹن کے ذریعے سے محافظ سپاہ کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم رہیں اور نواب روشن الدولہ کو حکم دیا کہ تمام سپاہ بیگم کے مقابلے میں لے جاؤ کہ اس نے عدول حکمی کر کے بغاوت اختیار کی اور لفٹنٹ شکسپیر کو جلد انگریزی فوج لانے کا حکم بھیجدیا۔

کپتان پاٹن نے بارگاہ سلطانی کے دروازے پر آکر دیکھا کہ دو تین غلام حبشی دروازے تک پہنچ گئے ہیں اور کچھ آدمی اس کے ساتھ ہیں اور ایک جماعت کثیر آمادہ بہ جنگ ہے اور دروازہ کھولنے کیلئے محافظوں پر سختی کر رہے ہیں۔

کپتان صاحب نے بہت نرمی سے دروازے کے روزن سے ان کو سمجھانا شروع کیا مگر وہ لوگ اسی وقت ایک ہاتھی دروازہ توڑنے کے لیے لے آئے جب اس ہاتھی سے دروازہ نہ گرا تو ایک دوسرے فیلبان نے نہایت چالاکی سے اپنا ہاتھی آگے بڑھا کر ایک پٹ گرا دیا اور کپتان صاحب دوسرے پٹ کی آڑ میں چھپ گئے لوگ اندر گھس آئے اور ان کے سرگروہ نے کپتان صاحب کو دروازہ نکھولنے پر سخت باتیں سنائیں اور بندوق کا کندہ اس کے منھ پر مارا اور لکڑیوں سے پیٹا کہ وہ زمین پر گر پڑے لیکن باوجود اس سختی کے بھی وہ جواب دیتے رہے اس کے بعد بیگم صاحب کے سپاہیوں نے کپتان پاٹن اور ایک سپاہی مجروح ماکھن کو گرفتار کر لیا اور بیت السلطنت میں زبردستی داخل ہوئے اور بہت فتنہ و فساد برپا ہوا بیگم نے راہ آمد و رفت بند کر دی جو حکم نامہ لیفٹنٹ شیکسپیر کے نام لکھا تھا وہ بھی نہ جا سکا اور یہ انتظام چند منٹ میں ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں تمام بارگاہ سپاہ سے بھر گئی اور لوگ اس قدر نشہ نخوت میں گرفتار ہو گئے کہ لوہے کا دروازہ توڑ کر کرنیل لو اور ان کے ہمراہ شاہی مصاحبوں کو گرفتار کر لیا اور بالا بالا بندوق کے فیر کئے کل آدمی تخمیناً دو ہزار ہونگے۔

اس اثنا میں بیگم صاحبہ نے اپنے ہمراہ مناجان کو لا کر فرح بخش کی بارہ دری میں تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور آپ تخت کے نیچے بیٹھیں۔ سلامی کی توپیں دغیں اور محفل عیش آراستہ ہوئی ناچ رنگ ہونے لگا۔ مبارکباد کا ہر طرف سے شور و غل برپا ہوا مشعلیں روشن کر دی گئیں اور اس قدر گرفتار یاں عمل میں آئیں کہ بیان سے باہر ہے کرنیل لو نے بھی بادشاہ سے رہائی کی درخواست کی لیکن لوگ کرنیل صاحب کے منھ کے آگے بندوقیں لے جاتے تھے اور ان کا گلوبند پکڑ کے کھینچتے تھے اور کہتے تھے کہ بطریق آداب شاہی کورنش بجا لا کر نذر پیش کر۔ کرنیل لو نے انکار کیا تو کئی آدمی بہت غصے میں بھرے ہوئے اٹھے لیکن وکیل شاہی جو نہایت حلیم الطبع تھا اس نے بیگم صاحبہ کے حکم سے کرنیل لو اور اسسٹنٹ اور مترجم کو نہایت مشکل سے اوس مجمع کثیر سے نکال کر رہا کر دیا اور یہ لوگ بہت مشکل سے باہر آئے ماکھن سپاہی بھی کسی طرح وہاں سے نکل بھاگا اور کرنیل من تھ کے پاس آیا۔ انھوں نے اسی وقت

کپتان گو لی کو مع سپاہ کے روانہ کیا کہ کپتان پاٹن کو رہا کرائیں کرنیل من تھم اور کرنیل لوبی منا جان کے تخت کے قریب چند قدم کے فاصلہ پر سپاہ کشیر کی صف باندھے ہوئے کھڑے تھے اور مناجان کے جان نثار بھی کثرت سے آگے تھے اور نہایت بے باکی اور غارت گری سے شہر کو لوٹ رہے تھے ان لوگوں نے بارگاہ شاہی میں داخل ہوتے ہی وزرا اور عزیزان شاہی کو اٹھا دیا اس وقت تک وہ سب لوگ نظر بند اور اسیر تھے اور کرنیل لو بھی بہت خوفزدہ تھے ۔ اس کے بعد ایک وکیل کی معرفت رزیڈنٹ اور بیگم صاحبہ میں گفتگو شروع ہوئی ۔ کرنیل اس بات پر مصر تھے کہ بہتر یہی ہے کہ بادشاہ بیگم اور شاہ نوجوان سرکاری اطاعت قبول کریں نہیں تو اس کا انجام بہتر نہ ہوگا ۔ اور تمام خاص و عام کے سامنے وکیل سے کہا اگر بارگاہ سلطانی میں نوبت لورش آئے گی تو تم کو سولی دی جائے گی ۔ اسی گفتگو میں اتنا موقع مل گیا کہ انگریزی فوج معہ توپ آگئی ۔ اس کے بعد کرنیل لو نے پندرہ منٹ کی مہلت اس بات کے منظور کرنے کے لیے بیگم صاحب کو دی یہ مہلت اس واسطے تھی کہ اتنی دیر میں توپیں بھی ان کے پاس پہنچ جائیں ۔ میعاد منقضی ہوگئی تو فرح بخش پر گولہ باری کی گئی سات فیر ہی لوگ ادھر ادھر ہونے لگے ۔ نوجوان بادشاہ اور بادشاہ بیگم اور امام بخش کا اندر نقید ہو کر کرنیل لو کی حراست میں آئے ۔ امام بخش کو سرکار شاہ اودھ نے اپنی حمایت میں لے لیا ۔ اس لڑائی میں سرکار انگریزی کے تین سپاہی زخمی ہوئے اور اس طرف چالیس آدمی قتل اور زخمی ہوئے اور باقی بھاگ نکلے ۔

اس وقت تک حضرت محمد علی شاہ اور ان کے رفیق کمال خطرے میں تھے اور انکو وحشت اور رنج افزا کلام سننا پڑتے تھے اور لوگ برملا کہتے تھے کہ دشمنوں کو قتل کیا جائے گا جس سے بادشاہ بہت متردد تھے لیکن ان لوگوں کو یہ بات قطعی طور پر معلوم نہ تھی کہ کون دعویدار سلطنت ہے اس سبب سے محمد علی شاہ کو کوئی زحمت نہیں پہونچی ۔ پہر دن چڑھے کرنیل لو نے نعشوں کو اٹھوا کر اور مجروحین کو بارگاہ سے باہر کر کے بادشاہ کو تسلی اور دلاسا دیکر کوٹھی فرح بخش میں لائے اور سپاہ انگریزی و ہندستانی کے سامنے سریر سلطنت پر بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے بادشاہ کے سر پر تاج رکھا ۔ توپوں کی سلامی ہونے لگی اور دو گھنٹے تک جلسہ رہا ۔

بعد میں جو تحقیقات ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ بیگم صاحب کے داخل ہونے میں سپاہیوں کی سازش اور کم ہمتی تھی ۔ وزیراعظم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ چوکی اور پہرہ کے سپاہ نے غفلت کی دوپہر کو کرنیل لو نے ایک خط مشتمل بر حالات وفات بادشاہ و تخت نشینی وارث حقیقی کے لکھ کر گورنمنٹ ہند کو روانہ کیا ۔ بادشاہ دربار برخاست ہونے کے بعد خلوت میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ بادشاہ بیگم نہایت خطرناک عورت ہے اگر اودھ میں بطور قیدیوں کے رہے گی تو اس کی ذات سے

فساد کا اندیشہ ہے اور خلق خدا کو آرام نہ ملے گا لہٰذا اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملک میں رکھنا چاہئیے میں تمام مصارف قید خانے کے دونگا۔ بادشاہ بیگم کے ہمراہ دو عورتیں بھی گرفتار ہوئیں اور تینوں عورتیں اور مناجان ریزیڈنسی میں قید ہوئے ایک کمپنی ان کی نگہداشت کو مقرر ہوئی اور انکی غذا اور لباس میں بھی کمال احتیاط کی گئی لیکن ریزیڈنٹ بہادر نے بارگاہ سلطانی سے معاودت فرماکر دو کمپنیاں چوکی پہرے کے لیے مقرر کردیں۔

دوسرے دن یہ خبر تمام شہر میں پھیل گئی کہ اب نواب گورنر جنرل بہادر کے جواب کا انتظار ہے یا تو مناجان بادشاہ مقرر ہونگے یا محمد علی شاہ سلطنت کریں گے۔ مناجان اور بادشاہ بیگم کہتی تھیں کہ کرنیل لو سے خوب انتقام لیا جائے گا۔ اس غوغا سے عاجز آکر کرنیل لو نے مخفی طور پر قیدیوں کو کان پور بھیجنے کا سامان کیا۔ لکھنؤ سے کان پور چھپن کوس ہے۔ کرنیل لو نے سراشتو صاحب کمان افسر کانپور سے تین ترپ سوار قیدیوں کی حفاظت کے لیے منگالیں اور یہ بھی حکم دیدیا کہ لکھنؤ سے کانپور تک وہ کہیں راہ میں قیام نہ کرنے پائیں اور انکو پالکیوں میں سوار کرا کے لیجائیں اور قید میں کسی طرح کا پاس ادب نہ کریں کیونکہ ان کی حراست مقدم ہے کوئی غیر ہندوستانی آدمی سوا ان نوکروں کے جو ان کو کھانا پانی دیتے ہیں نہ جانے پائے اور نہ وہ کسی سے کچھ بات چیت کرنے پائیں اور نہ کوئی خط وغیرہ بھیج سکیں۔ انھوں نے اس بات کی بھی کافی احتیاط کرلی کہ یہ نقل و حرکت بصیغۂ راز رہے اور کوئی آدمی اس سے آگاہ نہ ہونے پائے اور سپاہیوں پر بھی یہ راز ظاہر نہ ہو۔ کرنیل لو کو خیال تھا کہ اگر کانپور بھجوانے کا مشورہ لکھنؤ میں ظاہر ہو گیا تو اندیشہ فساد کا ہے اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب یہ قیدی گنگا پار ہو جائیں گے تو سب فساد مٹ جائے گا۔ غرض بارہویں جولائی کو آدھی رات کے وقت قیدی کانپور روانہ کردیئے گئے اور تین کمپنیاں تلنگوں کی نہایت چستی اور چالاکی سے بائیس میل تک پالکی کے ہمراہ رہیں اور ایک آدمی بھی ان میں سے پیچھے نہ رہا۔

اس کے بعد دو ترپ سوار جو اسی وقت کانپور سے آئے تھے نہایت تیز دھوپ میں پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑے اور قیدیوں کے پہنچنے میں ہر قسم کی احتیاط کی گئی۔ اور اس طرح تیرہویں تاریخ کو نو بجے شب کے وقت سب قیدی بخیریت تمام کانپور پہونچ گئے اور ایک مکان میں رکھے گئے۔ کرنیل لو نے لکھا تھا کہ اگر باہر سے حفاظت ہو سکے تو سواروں کو مکان کے اندر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس قدر احتیاط کی گئی کہ دو دستہ اور دروازے پر بھی متعین کر دیئے گئے کہ کسی ہندوستانی سے یہ لوگ بات نہ کرسکیں۔ کپتان پہرہ کو حکم تھا کہ شب و روز میں ایک مرتبہ قیدیوں کی حاضری ضرور لیا کریں لیکن ان کے آرام میں مخل نہ ہوں۔ لکھنؤ میں تیرہویں جولائی دو پہر کو قیدیوں کے جانے کی خبر

مشہور ہو گئی اور اسی روز فساد کی افواہ سرد ہو گئی۔ دوسرے دن حضرت محمد علی شاہ نے رزیڈنٹ بہادر سے کہا کہ بادشاہ بیگم میری بھاوج ہیں مجھے ہمیشہ منظور خاطر ہے کہ گھر اسباب۔ نوکر۔ کپڑا۔ حسب منزلت اور مرتبت انہیں ملے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال بھی ملحوظ خاطر رہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ان کے قیام کے لیے بنارس میں یا کسی دوسری جگہ مکان کی ضرورت ہو گی تو اس کا روپیہ بھی میں دوں گا۔ لیکن میرے خیال میں ان کے رہنے کے لیے ایک قلعہ وسیع مجرد لن کا مناسب ہو گا۔

بیسویں تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے فرمایا کہ ان قیدیوں کو ادھر سے دور رکھنا بہتر ہے جس کے لیے انہوں نے بنارس اور چنار گڑھ دو مناسب مقام تجویز فرمائے۔ آخر میں یہی بات قرار پائی کہ قلعہ چنار گڑھ سب سے بہتر ہے اور قیدی کا نپور سے چنار گڑھ کے قلعے میں بھیج دیئے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ غرض منا جان نے ڈھائی گھڑی سلطنت کر کے تمام عمر قید میں بسر کی۔

⁂ ⁂ ⁂

قضا کی گھڑیاں

مطبوعہ زمانہ مارچ ۱۹۴۰ء کا ایک پیراگراف

وہ اندھا تھا، اسے دنیا کی دلچسپ رنگینیوں یا رنگین دلچسپیوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آسمان پر چمکنے والے چاند اور جگمگانے والے ستاروں کی روشن اور تابناک دنیا کا نظارہ اس کی بے نور آنکھوں نے کبھی نہ کیا تھا وہ لالہ و گل کی دلربا بہاروں اور پہاڑوں سے گرنے والے آبشاروں کی دلفریب روانی سے نا آشنا تھا۔ حسن و عشق کی شوخیوں نے اس کے دامنِ شباب کو آج تک کبھی جھٹکا نہ دیا تھا۔ اس کے جذبات سینہ میں یوں سو رہے تھے جیسے ایک بے جان چیز ہوتی ہے۔ حسن کی نشتر زنی اور جراحت سامانی سے اس کا دل محفوظ تھا۔ وہ سیاہی اور سفیدی میں بھی تمیز نہ کر سکتا تھا۔ اچھے اور برے کا صرف اتنا احساس اس نے کیا تھا جو اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتا اسے وہ اچھا کہتا اور جو اسے ستاتا یا آزار پہونچاتا وہ اس کی رائے میں برا ہوتا۔ چہرے کے نقش و نگار کی دلکشی اور خد و خال کی موزونیت کے اعتبار سے کسی کو اچھا یا برا کہنا اس کے نزدیک بے معنی سی بات تھی۔

کوثر چاند پوری

کلامِ ٹیگور کا فلسفہ

رگھوپت سہائے فراق

زمانہ جولائی ۱۹۱۹ء

گیتانجلی کی مدحیہ تنقیدوں کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو اہل مغرب میں ایک خاص رجحان کا پتا چلتا ہے۔ اہل مغرب کا مذہبی مزاج اور میلان جو صدیوں کی عیسائی تہذیب و تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کو ایک ایسے خدا کی عبادت و پرستش پر مائل کرتا ہے جو حقیقت میں ان سے جدا ہے۔ اور اس لیے ٹیگور کی وہ نظمیں جن کا نفس مطلب خدا اور انسان کی ہستیوں کا تفرقہ ہے۔ اہل مغرب کے مذاق کو زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ ہمارے شاعر کے عاشقانہ گیتوں میں اس تفرقہ کا راگ اکثر سنائی دے جاتا ہے۔ لیکن ٹیگور کو عشق یا بھگتی کے خاص کیفیت کا شاعر تصور کرنا ان کی ہمہ گیری اور کمال کی بہت محدود اور یکطرفہ داد دینا ہے۔ ایسی غلط فہمیوں سے بچنے اور ٹیگور کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ٹیگور کی بہت سی خصوصیات میں سے چند خصوصیات جان لی جائیں۔ تب ہم کو ایک ایسی کلید مل جائے گی۔ جس سے ہم کلام ٹیگور کے ان متضاد اور ایک دوسرے سے بظاہر برعکس تخیلات کو بخوبی سمجھ جائیں گے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے تخیل کی وسعت و جولانی محتاج بیان نہیں۔ وہ ہر طرح کے انسانوں اور انسان کے مختلف جذبات کی کیفیتوں کو ایسا اپنا بنا لیتے ہیں۔ اور ان میں شاعرانہ جوش و خروش و یگانگی اس طرح کوٹ کوٹ کے بھر دیتے ہیں گویا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کا ہمہ گیر تخیل نہایت کامیابی سے اپنے اوپر عورتوں کے خاص جذبات بھی طاری کر لیتا ہے۔ اور خاص خاص موقعوں پر وہ اپنی بجنسہ وہی حالت کر لیتے ہیں جو ایک خاص عورت کی ایسے وقت میں ہو گی۔ عورتوں کی مزاج شناسی اور ان کے جذبات کے اظہار کا ٹیگور کو خاص ملکہ ہے اور اس کا پتہ ان کے ناولوں اور ڈراموں سے صاف صاف چل جاتا ہے جن میں عورتوں کے جذبات کی مصوری کرتے ہیں وہ نسوانی فطرت کے تہ کو پہونچ گئے ہیں۔

وہ ہم کو طرز معاشرت و طریق زندگی کے وہ مختلف نمونے جو ہندوستان کی کثیر التعداد آبادی میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح دکھلاتے ہیں گویا اپنی ہی سرگزشت سنا رہے ہیں۔ ان کا تخیل فطرت انسانی پر اتنا حاوی ہے اور ان کی شاعری اصلیت میں اس قدر ڈوبی ہوتی ہے گویا انھوں نے اپنی شخصیت کے ان لوگوں کی ہستیوں پر قربان کر دی ہے۔

یہ بات ان لوگوں کو جو ربندر ناتھ کے سوانحی حالات سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں ذرا تعجب انگیز معلوم ہوگی۔ ربندر ناتھ کی عمر کا بہت بڑا حصہ ایک نہایت محدود دائرہ میں گذرا ہے۔ وہ عوام الناس سے اس قدر دور رکھے گئے تھے کہ ان سے اعلیٰ درجہ کے مردم شناس ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی مگر ان کی نظر اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ان کی جذبہ شناسی اور ہمدردی اس سے کہیں زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے جو اس علیحدگی کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ ان کی تصنیفات پڑھتے وقت وہ نفرتیں جو مشرق اور مغرب کے درمیان غارہائے عمیق کی طرح حائل نظر آتے ہیں ہم کو مٹتے ہوئے اور ملتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خاص رمز یا کسی ایسے اصول کو پاگئے ہیں جو مختلف وحدت اور معرفت کی بلند چٹان پر بیٹھ کر ایسا دلکش نغمہ چھیڑتے ہیں جو نوعِ انسان کو مسخر کر لیتا ہے۔ کیتنے ہی اعلیٰ درجہ کی تہذیب ہو اس کی تہ تک پہنچنے کے لیے ان کی ایک نظر کافی ہے۔ اور ہم لوگ جو اپنے شاعر کی ہمہ گیری سے واقف ہیں یقین رکھتے ہیں کہ ربندر ناتھ کی سیاحت یورپ اور امریکہ ضرور کسی نہ کسی شکل میں بارور ہوگی۔ کیونکہ ان کی نظر تعمق اہل یورپ اور اہل امریکہ کی فطرتوں کی تہوں تک ضرور ڈوب کر نکلی ہوگی اور ان کی آئندہ تصانیف غالباً ضرور اس رنگ میں ڈوبی ہوئی اور مغربی زندگی کے رموز سے مملو اور معمور ہونگی۔ یہ مشکل ہے کہ انکی غائر نگاہ نے کہیں خطا کی ہو یا ان کی لطیف اور باریک بین ذہانت نے کسی چیز کو نظر انداز ہونے دیا ہو۔ ظاہراً وہ کیسے ہی لاپروا اور بیگانہ معلوم ہوتے ہوں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کا تخیل ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ہو جائے ان کے تمام حواس جسمانی و دماغی ہر وقت بیدار رہتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں وہ ساکن اور بے حرکت نظر آتے ہیں۔ جن لوگوں سے وہ ملے یا جن لوگوں کو انھوں نے سرسری نگاہ سے دوران سفر میں دیکھ لیا ان کی سب باتیں اور ان کے مقاصد ان کے دل پر نقش ہوتے گئے۔ اور ان کے حواس ثانیہ کے مستقل اجزا بن گئے۔ ہر ایک شے کا عکس اس معرکتہ الآرا دماغ کے سنسیٹو پلیٹ۔ SENSITIVE PLATE: پر فوراً اتر جاتی تھی۔ اور اسی دماغ کے کسی ڈارک چیمبر DARK CHAMBER میں ان عکسوں کا نگیٹو NEGATIVE ڈیولپ DEVELOP ہو رہا ہوگا۔

بالکل متضاد فطرتوں کے رموز شناسی اور بالکل برعکس جذبات کی مصوری ربندر ناتھ کا خاص حصہ ہے۔ اور ربندر ناتھ کی یہ خصوصیت ہم کو مدنظر رکھنی چاہیے جو لوگ کلام ٹیگور کا محض سرسری مطالعہ کر کے ان کے گرویدہ ہوگئے ہیں وہ ان خاص کیفیتوں میں سے محض چند کیفیتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ جن کو شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔ ٹیگور کے یہ شائقین اپنے تخیل کو محض ان چند کیفیات تک محدود کر دیتے ہیں اور اسی کو ٹیگور کی پیروی سمجھتے ہیں۔ مگر جب رمز ٹیگور سے کوئی بخوبی واقف ہو جاتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ شاید ٹیگور کی کوئی

اپنی شخصیت ہے ہی نہیں بلکہ جس عقد: کا نام ٹیگور ہے وہ جذبات انسانی کا ایک مجسم مجموعہ ہے. جس میں کسی ٹیگور کا نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے دل دھڑک رہے ہیں اور جس میں جذبات انسانی اظہار کے لیے بیتاب و پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس ہمہ کو ٹیگور کہتے ہیں وہ کوئی وادی ہے جس میں شیدا اور لا انتہا انسانی جذبات و کیفیات کی نہریں جاری ہیں۔ کیا عجب ہے اگر اہل مغرب ٹیگور کی ہمہ رخی اور جامعیت سے گھبرا جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ شعرا فلسفیوں کی طرح منطق میں اپنے کو محدود نہیں کر سکتے۔ ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ اپنے کمال اور تخیل کو منطق پر قربان کر دیں۔ قیود منطق سے کلام ٹیگور بالکل آزاد ہے ٹیگور آزادی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں اور ان کے کمال کی باہیئت جاننے کے لیے ان کی آزادی مدنظر رکھنی چاہیے صداقت اور اصلیت ان کے کلام میں کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ مگر وہ صداقت اور وہ اصلیت جوش حیات سے تڑپ رہی ہے اور محض منطقی اصولوں کی صورت میں یا کسی خاص مذہبی اعتقاد کی شکل میں پیش نہیں کی گئی ہے۔

کلام ٹیگور کو سمجھ کر پڑھنے سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ صداقت کی کسوٹی شاید منطق نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ صداقت اور اصلیت منطق سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ کلام ٹیگور کا رجحان حقیقت کی طرف ہے۔ سگ منطق بھونکتا رہتا ہے۔ لیکن ٹیگور کا مضمون اس طرح چلا جاتا ہے کہ جیسے جائے کوئی مست فیل بے زنجیر اور یہ عارفانہ تجاہل ہے جو منطق کا غرور محض اپنی بے رخی سے توڑ کر چور چور کر دیتا ہے۔ ربندر ناتھ کی منطق اپنی ثبوت آپ ہے۔ ان کی دلیلیں وہ جذبات انسانی ہیں جن کا احساس دلایل عقلی سے کہیں گہرا ہوتا ہے۔ ٹیگور کا کمال یہ ہے کہ وہ جذبات کو گویائی عطا کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور کلام ٹیگور محض اس خاموش اسٹیج کی طرح ہے۔ جس پر جذبات خود ایکٹ کرتے ہیں اور کیفیات انسانی بے ساختہ پردوں سے نکل آتے ہیں۔

ٹیگور صرف سین اور ڈراپ سین کی ترتیب دیتے رہتے ہیں اور پردہ اٹھانے اور گرانے میں محض یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ ہر ایک جذبہ اپنا قصہ صاف موثر اور پرجوش الفاظ میں بیان کر کے دوسرے جذبات کی سرگزشت بھی سن لے۔

اکثر شعرا کے برخلاف ربندر ناتھ نے قلم ہاتھ میں لینے کے قبل کسی خاص فلاسفی یا مذہبی اعتقاد کو کوئی راضی نامہ نہیں لکھا۔ اجلاس منطق یا اجلاس فلسفہ یا اجلاس مذہب کے روبرو کوئی حلف نہیں اٹھایا۔ اکثر شعرا بلا کوئی اصول قائم کیے کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ سیکسپیر تک حالانکہ وہ ڈرامہ نویس تھا اپنی شخصیت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا تھا اور اپنی میتی اپنے ہیروز اور ہیروئنس کی زبانوں سے کہلاتا تھا۔ مگر ٹیگور کا کلام ڈرامیٹک آرٹ کا اعلیٰ نمونہ ہے اور شاعرانہ بیگانگی کی بہترین

مثال ہے۔

یہ انتہا درجہ کی بیگانگی اور انتہا درجہ کی ہمدردی ٹیگور کی کامیابی کا راز ہے جس نے اُن کے کمال کو چار چاند لگا دیئے ہیں ایک معمولی مثال اس کی یہ ہے کہ مسئلہ تناسخ یا آواگون کو یا بُت پرستی کو جن میں عام ہندوؤں کو پورا اعتقاد ہے مگر جو ٹیگور کے ہم مذہب برہمو سماجی نہیں مانتے۔ رابندر ناتھ نے اپنی کئی نظموں میں نہایت ہمدردی سے پیش کیا ہے اور ہندوں کے ان جذبات کو نہایت پُرتاثیر الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔ دراصل رابندر ناتھ جذبات کے شاعر ہیں۔ ذوران کا کلام حیات روزمرہ کے جذبات اور اعلیٰ درجہ کے روحانی اثرات سے مالا مال ہے۔ ربندر ناتھ کو جہاں کہیں صداقت نظر آجاتی ہے وہیں ان کا سر جھک جاتا ہے۔ اسی لیے کبھی وہ دویت واد یا دوئی کا راگ الاپتے ہیں، کبھی وحدت وجود کا نغمہ چھیڑ دیتے ہیں اور کبھی ہمہ اوست کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

وحدت وجود یا ہمہ اوست یہ وہ ایسی بلندیاں ہیں کہ اولاً تو اہل مغرب ان پر چڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اور اگر کسی طرح دم بھر کو ان چٹانوں کی چوٹیوں پر پہونچ بھی گئے تو نیچے دیکھتے ہوئے ان کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور ان کا دل تھر تھرانے لگتا ہے۔ مگر ربندر ناتھ کی رگوں میں ہندو رشیوں کا خون موج زن ہے۔ اور وحدت کی بلندی پر ان کے سر میں چکر نہیں آتا۔ کلام ٹیگور کا فلسفہ جاننے کے لیے ربندر ناتھ کی ہندو نسلیت مدنظر رکھنی چاہیے۔ ان کی ہندو نسلیت کا اثر ان کے کلام پر ہونا ضروری ہے۔ ہندوں کا خاص مذہبی عقیدہ جو کچھ ہو مگر وحدت وجود وہمہ اوست ایسے اصول ہیں جو صدیوں سے ہندوں کے دلوں میں اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں۔ اور جو ان کی زندگی اور ان کے جذبات میں سرایت کر گئے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ربندر ناتھ کی حقانی نظموں میں وحدت اور ہمہ اوست کی آواز سنائی نہ دیجاتی۔

کلام ٹیگور سے کچھ حصہ اقتباس کر کے یہ بات اچھی طرح سے ثابت کی جاسکتی ہے۔ ان انتخابوں میں بالکل متضاد اور برعکس عقیدے و جذبات اور مختلف کیفیتیں قلم بند کی گئی ہیں جو اصول منطق اور فلسفہ کے خلاف ہیں مگر جو بلحاظ شاعری اپنی اپنی جگہ پر درست و زیبا ہیں۔ شاعر کا کام ہے کہ چیزوں کی ہستی میں اپنی ہستی مٹا دے نہ کہ نیک و بد صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ کسی جذبہ کا نمود اس کی صداقت کا خود ثبوت ہے۔ ٹیگور ہم کو ہر طرح کے جذبات سے لذت آشنا کرا کے اس سچی برادرانہ ہمدردی کا سبق سکھلاتے ہیں جو ہند و تہذیب کا مایۂ ناز ہے اور جس سے وہ مذاہب محروم ہیں جنھوں نے بہشت و نجات کا ٹھیکہ کسی خاص عقیدے یا کسی خاص انسان کو دیدیا ہے۔ یہ فخر صرف ہندو مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کے آغوش میں

بت پرستی سے لے کر اہم برہمہ (اناالحق) ایک صلح کل کے عالم میں چل رہے ہیں۔ اور متضاد فلسفے کھیل رہے ہیں۔ کلامِ ٹیگور اسی ہند و تہذیب و تربیت کا عکس ہے جس کا کام ہی کثرت میں وحدت کا تماشہ دکھلانا ہے۔ ہندو نقطۂ خیال سے مختلف فلسفے واقعی مختلف نہیں ہیں بلکہ صداقت اور حقیقت کی مختلف تفسیریں ہیں۔ متضاد عقائد یا مختلف عقائد ایک ہندو کے دل کو نہ صدمہ پہونچا سکتے ہیں نہ اس کو حیرت انگیز معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہی فلسفہ ہے کلامِ ٹیگور کا اور یہی راز ہے ان کی حیرت انگیز ہمہ گیری اور وسعت کا۔

مئی ۱۹۱۳ء کے نارتھ امریکن ریویو میں ایک لائق خاتون مس سنکلیر گیتانجلی پر تنقید لکھتے ہوئے فرماتی ہیں: "صرف چند مقاموں سے تت توم اسی (تم وہی ہو) کے تصوفانہ مقولہ کی صدا سنائی دے جاتی ہے۔ محض کہیں کہیں وہ سُریلے اور پر اثر نغمے بلند ہو جاتے ہیں جو وحدت وجود اور ہمہ اوست کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ تمام ہستیوں کا منزل مقصود وہی ایک ہستی ہے جس میں دنیا کی ہستیاں پنہاں ہو جائیں گی"۔ رابندر ناتھ نے بنگلہ گیتانجلی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے قصداً وحدانیت کی نظموں کو انتخاب کر لیا ہے۔ ورنہ وحدانیت کی آواز بہت دور تک بنگلہ گیتانجلی میں گونج رہی ہے۔ آگے چل کر مس سنکلیر نے یہ بھی لکھ دیا ہے "ٹیگور کی عظمت کا اندازہ محض اس قسم کی نظموں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کا کوئی خاص رنگ ہی نہیں، اور نہ وہ کسی خاص عقیدے کے پابند ہیں۔ وہ روح کی ہستی کا خدا کی ہستی میں فنا ہو جانا یا اس کا خدا سے الگ ہو کر بحیثیت عابد کے خدا کی پرستش کرنا دونوں رنگوں پر قادر ہیں۔ اور دونوں کیفیتوں کا لطف یکساں اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ گیتانجلی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے میرے مہر درخشاں میں موسمِ خزاں کے اس الگ ابر کی طرح ہوں جو بیکار ادھر اُدھر اڑتا پھرتا ہے۔ کرنوں نے مجھے چوم کر ابھی گلا نہیں دیا کہ میں فنا ہو کر تیرے نور میں ملجاؤں اگر تیری مرضی ہے اور اگر تجھے یہی انداز پسند ہے تو میری اس پریشان ہستی موہوم کو لے کر اس میں اپنی کرنوں کی رنگ آمیزی کر دے۔ اسے سنہرے رنگ سے چمکا دے اور آسمان پر مختلف اور پر لطف منظروں میں اسے پھیلا دے۔

اور جب تیری خوشی یہ ہو گی کہ رات کو یہ کرشمہ ختم ہو جائے تو میں شب کی تاریکی میں فنا ہو جاؤں گا۔ اور اگر تو چاہے گا تو صبح کی منور تر و تازگی میں پھر نمایاں ہو جاؤں گا۔"

یہاں روح کا ذات ایزدی میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنی ہستی کھو بیٹھنے کا منشا نہیں ہے بلکہ خدا میں پنہاں ہو کر پھر اپنی ہستی کو پا جانا مراد ہے۔ مگر مغربی منطق کی سمجھ میں یہ دونوں باتیں مشکل سے آئیں گی کیونکہ اہل مغرب مثلاً ہمہ موجودگی IMMANENCE کو اس کے محدود نتائج

تک پہنچانے میں ہچکچاتے اور پہلو تہی کرتے ہیں۔ ورنہ وحدت و کثرت کا ظاہرا اختلاف ان کو اتنا پریشان نہ کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ اکثر اہل تصوف خدا سے ذاتی تعلق کو زحبہ ہیں۔ اپنی ہستی خدا کی ہستی میں مفقود نہ ہو جائے بلکہ قائم رہتی ہوئی وہ مطلق کا نظارہ کرتی رہے۔ تصوف اور عشق کی جان سمجھتے ہیں مگر کیا یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہ سکتی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی کیفیت نہیں ہے۔ عاشق و معشوق کے تفرقہ کا احساس اور جذبہ عشق کا احساس بھی اکثر مٹ جاتا ہے۔ اور بقول غالب صوفی کی کبھی وہ عالت بھی ہو جاتی ہے کہ۔

دل میں ذوقِ وصل و یاد یار تک باقی نہیں۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

محض فلسفہ سے اپنی اور خدا کی ہستی کی یگانگت کو سمجھ لینا اور محض دلایل سے اس خیال کو تقویت دے لینا اور بات ہے۔ اصل چیز وہ روحانی احساس اور جذبہ ہے جو ہندو تہذیب کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا ہے۔ جب ہم اس سے جدائی کا پُر درد نغمہ گاتے ہیں تو ایک ایک الاپ ہم کو اس سے قریب تر کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ یکتائی کا احساس ہوتے ہوتے "من تو شدم تو من شدی" کا نعرہ بلند ہو جاتا ہے۔ کلام ٹیگور کو اس روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کا تضاد باہمی نظر نہ آئے گا۔ ہمارے شاعر کے کمال کے عالمگیر ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے طالب و مطلوب کی یگانگت کے مسئلہ کو اس قدر دلفریب و شیریں بنا دیا ہے کہ اہل مغرب کا دل بھی وجد کرنے لگتا ہے۔

گیتا نجلی کے مندرجہ ذیل گیت میں اس وصل اور جدائی کے مضامین کو اس خوش اسلوبی سے ایک ہی لڑی میں آویزاں کر دیا ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کہتے ہیں۔

> "اے میرے خدا میری زندگی کے لبالب ساغر سے تو کونسی مئے رنگین نوش کرے گا۔ اے میرے شاعر کیا تیرا دل اپنی خلقت کو میری آنکھوں سے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ اور کیا میرے کانوں پر بیٹھ کر اپنے وہی پردہ ساز کے نوا ہائے راز کو سننے کے لیے تو بیتاب ہو رہا ہے۔ میرے دماغ میں تیری آواز گونج کر الفاظ کی صورت پکڑ لی جاتی ہے اور تیرا نغمہ حقیقت اپنے سراغ میں بھرتا جاتا ہے اور ان الفاظ میں تیری جھنکار سنائی دیتی ہے کیا تو اسی کو سن رہا ہے۔ اے میرے خدا کیا تو اپنی ہستی میرے حوالے کر کے اپنے کو میرے آغوش میں دیکھ کر خوشی میں پھولا نہیں سما رہا ہے اور فرط مسرت سے جھوم رہا ہے۔ میرے خدا یہ کیا دلفریب کرشمہ ہے"۔

گیتا نجلی کی یہ نظم اونیشدوں کے چند حصوں پر روشنی ڈال رہی ہے اور صدہا صدیوں کی آواز اس گیت میں سنائی دے رہی ہے۔ اونیشدوں میں ایک جگہ آیا ہے کہ "جب اس نے (خدا نے) چاہا

کہ میں کیا ہو جاؤں تو ایک آن میں یہاں سے عالمِ صورت و کثرت نمودار ہو گیا اور اسی کثرت میں پھر اس کی وحدت سرایت کر گئی اور آئینہ خانہ جہاں میں اپنی صورت دیکھ کر اسے خود حیرت ہو گئی۔ ہم تماشا گاہ جہاں میں اس کا جلوہ دیکھنے کے لیے ابھی آنکھیں دوربینیں ایجاد کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں اپنا جلوہ دیکھنے کے لیے اور اپنا نغمۂ خاموشی سننے کے لیے بیتاب ہے۔ کیا زبردست اور بلند پروازِ تخیل ہے۔

مگر رابندر ناتھ کی شاعری ان بلندیوں پر بے تکلف چڑھ جاتی ہے۔

چونکہ خدا خود ہماری ہستیوں میں موجود ہو کر دنیا کے مزے اٹھانے کے لیے بیتاب ہے اسی وجہ سے ہم سب دنیا کے مزے اٹھانے کے لیے بیتاب ہیں۔ لہٰذا کلامِ ٹیگور میں کسرِ نفسی و ترکِ دنیا و عزلت پسندی کی ترغیب نہیں دی گئی ہے بلکہ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" تو ٹیگور کہتے ہیں کہ ہوس کو ہوس سمجھنا غلط فہمی اور بزدلی ہے۔ کیونکہ ہوس اس روحانی بے چینی کا نام ہے۔ جب ذاتِ مطلق تنہائی سے گھبرا کر کثرت کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ فقرا ترکِ دنیا کا وعظ تو ضرور کرتے ہیں مگر تخلیقِ جہاں میں مشیتِ ایزدی کیا تھی" اس کا وہ کیا جواب دیں گے۔ آخر دنیا کی لذتوں کو شیطان نے تو پیدا نہیں کیا۔ دنیا کے مزے اٹھانا عینِ عبادت ہے بشرطیکہ کوئی رازِ خلقت کو سمجھ جائے۔

داخل ہو تو در روقت بھی تشنہ یاس میں ۔ خوش ہو رہے ہیں ابر کو میخوار دیکھ کر

یا بقول سعدی

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار ۔ وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

ارتقا کا راز اس تخییل میں پنہاں ہے۔ ترقی کی جان بھی شورش ہے۔ جب شاعر کا دل پوچھتا ہے کہ میری زندگی کے لبالب پیالے سے کونسی شرابِ ارغوانی تو پیئے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا کیا کمال میں اپنی ذات میں بہم پہنچاؤں کہ تیری معبودیت کی داد دے سکوں کس پاکیزگی سے اپنی ذات کو بلند کر کے تیری پرستش کے قابل ہو جاؤں۔ جلوۂ قدرت کا عالم میں آشکارا ہو کر نشو و نما پانا فلسفۂ ارتقا و فلسفۂ عبادت کا اصلی مقصد ہے۔ بھگوت گیتا کی دسویں منزل میں اور پلیٹو کے ڈاکٹرن آف آئیڈیاز DOCTORINE OF IDEAS میں بھی یہی باتیں بتلائی گئی ہیں اس بات کے احساس نے ٹیگور کے تخیل کو منور اور پرزور بنا دیا ہے۔ اور ان کی ایک ایک نظم سورج کی شعاعوں کی طرح دنیا کی چیزوں کو جگمگا دیتی ہے اور زندہ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ٹیگور اس شورش کو اس روحانی بےچینی کو جو ترقی کی جان ہے سمجھ گئے ہیں۔ بقول استاد میر۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر ۔ میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

ممکن ہے کلامِ ٹیگور کے فلسفہ پر یہ باتیں قطعی طور پر درست نہ ہوں۔ ممکن ہے اور بھی کئی اجزا رابندر ناتھ کے تخیل میں داخل ہوتے رہے ہوں۔ کوئی چاہے تو اور طرح کے فلسفے بھی کلامِ ٹیگور سے اخذ

کرسکتا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے ہمہ گیر شاعر کو کسی مخصوص اعتقاد یا فلسفہ کا پابند کر دینا مناسب نہیں ہے۔ ٹیگور بھی ایسی تفسیروں کے روبرو ہمیشہ چپ رہتے ہیں۔ وہ اپنے معبود کو بلا کسی فلسفہ میں اس کی ذات کو مقید کیے ہوئے بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا گہرا روحانی احساس کسی فلسفہ کا محتاج نہیں۔ گیتانجلی میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

لوگوں میں میں نے یہ فخر کیا کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔ لوگ میرے کلام میں ہر جگہ تمہاری ہی تصویر دیکھتے ہیں اور مجھ سے آکر دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کون ہے میں نہیں جانتا انہیں کیا جواب دوں اور یہ کہہ دیتا ہوں کہ واقعی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ مجھ سے آزردہ اور خفا ہو کر چلے جاتے ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو۔

"میں نے تمہارے افسانے دلفریب الفاظ میں نظم کیے۔ تمہارا راز پنہاں بے اختیار ہو کر میرے دل سے نکل پڑتا ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں نہیں جانتا انہیں کیا جواب دوں اور یہ کہہ دیتا ہوں کون جانے ان اشعار کا کیا مطلب ہے۔ وہ طنز سے ہنس کر میری مذمت کرکے چلے جاتے ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو۔

بنگال کے ادبی دائروں میں اکثر ان کی چند نظموں اور دیگر کلام کے نفس مطلب پر نقادوں اور علما میں بحث ہوتی رہی ہے۔ مگر ٹیگور ہمیشہ خاموش رہے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرنے سے ہمیشہ بچتے رہے ہیں۔ مس سنکلر صاحبہ نے اپنے مضمون مذکور میں ایک بات اور کہی ہے جو قابل توجہ ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

"اپنشد اس روحانی خلش اور تشنگی کو جو محض ذات مطلق کے وصال کے احساس سے مٹ سکتی ہے (ہیجل کی فلاسفی سے کبھی بڑھ کر) دور کرتے ہیں اپنشد ہی اس کیفیت کو پیدا کر سکتے ہیں جس میں اپنی ہستی اور خدا کی ہستی میں واقعی وصل ہو جاتا ہے۔ اہل تصوف اس کیفیت کے ہمیشہ سے جویاں رہے ہیں اور جب وہ ٹیگور کو ویدانتی یا بدھسٹ یا کسی مخصوص فلسفہ میں باندھ نہیں سکتے تو ان کو ایک طرح کی مایوسی ہوتی ہے۔ جب ٹیگور یہ کہتے ہیں کہ "ہر زمانہ تجھ سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا گذر جاتا ہے" تو یہ لوگ برا مانتے ہیں یعنی اہل ہند کو اور وحدت وجود کے ماننے والوں کو کوئی حق نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کہیں جس میں خدا اور انسان میں ذاتی تعلق اس طرح سے بتلایا گیا ہو جس سے دونوں کی ذات میں تفرقہ کا اندیشہ ہو۔"

یہ خیال کہ اہل ہند یا وحدت وجود کے ماننے والوں کو کوئی حق خدا اور انسان میں ذاتی تعلق قائم کرنے کا نہیں ہے ان چالاک اور خود غرض عیسائیوں کی گڑھنت ہے جو ویدانت کی عظمت اور فلاسفی کو ضرر پہونچانے کے لیے عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ آخر اس ذاتی تعلق کا مفہوم کیا ہے۔ کیا ہندؤں سے بڑھ کر کوئی یگانگت یا ذاتی تعلق کا دلدادہ رہا ہے۔ ہر ایک

ہند میں وہ روحانی احساس ہے جس میں اپنی ہستی اور ہستیٔ مطلق سے خاص تعلق قائم رہتا ہے۔ واضح رہے کہ اہلِ ہند میں یکتائی کی ہوس محض فلسفیوں کی علمی اور دماغی حرص نہیں ہے جو محض اپنے خیال کو فلسفۂ وحدت وجود سے بذریعہ چند عقلی دلیلوں کے تقویت دے لیتے ہیں۔ ہندوؤں میں عقیدۂ وحدت وجود محض اعتقاد یا عقلی ریاضت کی صورت میں نہیں رہا ہے بلکہ ایک روحانی تجربہ اور کیفیت کی شکل میں قائم رہا ہے۔ ہندوستان میں مذہب فلسفہ کی جان اور فلسفہ مذہب کی عقلی دلیل رہا ہے۔ خشک عقلی مسائل سے ہندوؤں کو ہمیشہ وحشت رہی ہے۔ مذہب ہندوؤں کے لیے چند اعتقاد کا انبار نہیں بلکہ روحانی کیفیت کا مفہوم رہا ہے۔

یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ رابندر ناتھ کا کلام موجودہ فلسفوں میں سے کسی میں بھی محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ٹیگور کی شاعری کا سرچشمہ عقلی دلائل اور منطق نہیں ہے بلکہ وہ روحانی تجربے ہیں جو کسی خاص اعتقاد یا فلسفہ سے منسوب نہیں کیے جا سکتے۔ مروجہ قواعد کے مطابق کلامِ ٹیگور اختلافِ باہمی اور برعکس جذبات سے پر ہے۔ مگر اہلِ مذاق جانتے ہیں کہ در حقیقت کلامِ ٹیگور کے مختلف حصوں میں کوئی تناسب اور سلسلہ ضرور ہے جس کو کسی خاص نام سے منسوب نہیں کر سکتے۔ مثلاً جو لوگ اس بات پر ضد کرتے ہیں کہ رابندر ناتھ خدا کی ہستی کے قائل ہیں انہیں ٹیگور کے مندرجۂ ذیل الفاظ پر حیرت ہوگی۔

> "جب میں اور یہ دنیا ایک تھے جب میرے جسم پر سبزہ اگا ہوا تھا اور بادِ بہاری جھوم کر مجھ پر سے گذرتی تھی اور جب طلوعِ آفتاب کے وقت ان سبزوں سے جو مانند شگوفے کے میرے جسم پر اگ رہے تھے۔ ایک ٹھنڈی نکہت نکل کر سورج کی کرنوں کی طرح پھیل جایا کرتی تھی جب میری ہستی چرخِ چنبریں کے وسیع اور چمکدار خامیانے کے تلے پہاڑوں اور دریاؤں اور میدانوں پر ایک لاانتہا وسعت کی طرح پھیلی ہوئی تھی اس وقت ایک خاص مسرت اور لطف کا ہلکا ہلکا احساس میرے بے پایاں جسم میں گویا ایک غنودگی کی حالت میں ہوتا تھا، اور ایک خوابِ گذشتہ کی طرح اس کی یاد مجھے اب تک آتی ہے۔

ان الفاظ سے دہریت ٹپک رہی ہے۔ مگر ٹیگور کی شاعری وہ جادو ہے جو دہریت کے فلسفہ کو بھی خوشگوار اور پُر تاثیر بنا دیتا ہے۔ یہ الفاظ محض شاعرانہ جدت اور مبالغہ نہیں ہیں۔ بلکہ صدقِ دل سے محسوس کردہ جذبات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ جذبات بھی اسی روحانی بے چینی کا نتیجہ ہیں جس سے مایۂ حیاتِ کائنات (خدا) تنہائی سے گھبرا کر آغوشِ گیتی میں آکر اپنے اوپر مختلف کیفیات طاری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے سے "مری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشا ہے"۔ اسی کثرت میں جذبات دہریہ کے مزے بھی ہیں کہیں کہیں تو شاعر کو خود پتا نہیں ہے کہ چند جذبات اسکے اندر کس طرح پیدا ہو گئے، ایک جگہ کہتے ہیں۔

میں ایک زندہ پیانو یا باجا کی مانند ہوں ۔ میرے اندر تار و تک پودوں میں بے شمار تار اور پرزے اور کمانیاں ہیں ۔ معلوم نہیں کون آ کر مجھے بجانے لگتا ہے ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مختلف نغمے میرے اندر سے کیسے نکلتے ہیں ۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس وقت کونسی چیز بج رہی ہے اور آیا اسکی آواز پُر درد ہے یا مسرت آمیز ہے یا سُر اونچے ہیں یا نیچے یا نغمہ بے تال ہے یا ٹھیک ہے ۔

ربندر ناتھ درحقیقت ایک ہندو ہیں ۔ ان کی شاعری ایک پھول ہے جس کی نکہت و رنگ صدیوں کی ہندو تہذیب سے نشو و نما حاصل کر رہی ہے ۔ چاہے انہیں اس کی خود بھی خبر ہو یا نہو ۔ ان کو اپنے وطن ہندوستان سے گاڑھی محبت ہے وہ ہندوستان کی پرانی عظمت اور تواریخی کارنامے اور پر فضا مناظر پر دل و جان سے فدا ہیں ۔ ہندوستان کی بود و باش اور زندگی کو وہ کہیں اور کی بود و باش اور زندگی سے تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ۔ بول پور میں شانتی نکیتن نام کے مدرسے میں قدیم ہندو طریقہ پر طلباء کی تربیت کر رہے ہیں اور وہیں خود بھی تنہائی میں روحانی تصور میں غرق رہتے ہیں ۔ ان کے والد مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور بھی یہیں تنہائی میں نیچرل منظر کے آغوش میں سرگرم ریاضت رہا کرتے تھے ۔ ربندر ناتھ کا معمول ہے کہ ایک چھوٹی سی کشتی میں شام کو بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے دریائے گورائی کے مزے لیا کرتے ہیں ۔ آپ اس دل بہلاؤ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

میں ہر روز اپنے دل میں یہ پوچھتا رہتا ہوں کہ کیا میں اس سرزمین پر اس تاروں سے منور آسمان کے نیچے پیدا ہوں گا ۔ کیا میں بنگال کے اسی گوشہ میں پھر پیدا ہو کر دریائے گورائی کے مزے اپنی ننھی سی کشتی میں بیٹھ کر ہر شام کو لے سکوں گا جب ندی کی دھیمی دھیمی چال اور آہستہ خرام ہوا میرے بے تاب دل کو تسکین دیا کریں گی ۔ ممکن ہے آئندہ جنم میں مجھے یہ چیزیں نصیب نہوں ۔ کون جانے یہ منظر اس وقت کہاں چلے جائیں گے یا میں کس طرح کا دل و دماغ لے کر دنیا میں آؤں گا ۔ ممکن ہے مجھے ایسی شامیں کئی نصیب ہوں مگر کون جانے کہ اس وقت میں شام کی سیاہ زلفوں کو اپنے اوپر لہراتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوں گا یا وحشت زدہ ہو کر گھبرا جاؤں گا ۔ کیا میں پھر پیدا ہو کر وہی آدمی رہوں گا جو میں اب ہوں ۔ جو کچھ ہو مجھے سب سے بڑا ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں یورپ میں نہ پیدا ہو جاؤں "

ان الفاظ میں ربندر ناتھ نے اپنا باطن ہماری آنکھوں کے آگے کھول کر رکھ دیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی محبت میں ان کا دل دھڑک رہا ہے ۔

⁂ ⁂ ⁂

ہندوستان کا فن تصویر کشی

جگت موہن لال رواںؔ

زمانہ، جولائی ۱۹۱۹ء

مختلف ممالک کے فنون لطیفہ کی تاریخ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ضروریات استمداد زندگی کے رفع کرنے کے بعد انسان کو منجملہ اور جذبات و خواہشات کے ایک یہ لطیف خواہش بھی پیدا ہوئی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے جانداروں اور بے جان چیزوں کی شبیہیں بنائے۔ شاعری کی طرح تصویر نگاری بھی انسان کا نہایت ہی قدیم جذبہ ہے۔

ہندوستان میں تصویر کشی کی ابتداء پُران میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ایک برہمن کا لڑکا عین عالم شباب میں مر گیا تھا۔ اس نے برہما سے منت کی کہ اس کے لڑکے کو دوبارہ زندہ کر دیں۔ برہما نے جم سے کہا جو زندوں کے جسم سے جان نکالنے کے مہتمم ہیں کہ لڑکے کو معاف کیجئے۔ لیکن جم نے برہما کا ارشاد نہ مانا۔ مجبوراً برہما نے اپنے ہاتھ سے اس کی شبیہہ تیار کر کے اس میں روح پھونک دی برہما کو وشوکرمان کا بھی لقب دیا گیا ہے۔ اور وشوکرمان ہندوستان کے فنون لطیفہ کی روح رواں ہیں۔ ہندوستان کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ ہر بڑے خیال کی ابتداء دیوتاؤں سے ہوتی ہے چنانچہ فن تصویر کشی کی ابتدا خلاق عالم سری برہما جی سے بتلائی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے صورت نگاری کی بنیاد پڑی۔ اس کے ثبوت میں ایک دوسری مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ اُشا کا خواب اس قدر مشہور ہے کہ یقیناً جملہ ناظرین اس سے واقف ہوں گے۔ شہزادی اُشا نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان اس کے ساتھ باغ میں سرگرم خرام ہے۔ اُشا اس خلقت خیالی سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ اس کو اس حسین نوجوان کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی کچھ عرصہ تک شہزادی اس خیال کو اپنے دل میں چھپائے رہی لیکن جب جذبات نے بے چینی کی صورت اختیار کی تو اس نے اس راز کو اپنی کنیز چتر لیکھا سے کہا۔ اتفاق امر چترلیکھا کو تصویر کشی کا بے حد شوق تھا۔ اس نے شہزادی اُشا کی بے قراری رفع کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ وہ تمام دیوتاؤں اور شاہزادوں کی تصویریں کھینچ کر شہزادی کے سامنے یکے بعد دیگرے پیش کرے۔ ممکن ہے اس طرح شہزادی اشا کو اپنے محبوب کا پتہ مل جائے۔

غرض چترلیکھا نے اپنی مالکہ کے سامنے تمام شہزادوں کی تصویریں تیار کر کے پیش کیں۔ جب اُشا نے انرودھ کی تصویر دیکھی تو اس کو معلوم ہو گیا کہ جو تصویر خواب میں آئینہ دل پر نقش ہوئی وہ یہی ہے۔ اسی انرودھ سے بالآخر شہزادی اشا کی شادی ہوئی۔

اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تصویر کشی کی مشق نہایت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ ان حالات کو دیکھئے اور خیال کیجئے کہ چند ہی سال اس بابت اہل یورپ کا خیال تھا کہ فن تصویر کشی ہندوستان میں پرانے زمانے میں تھا ہی نہیں۔

پرانوں میں جو تذکرات ہیں ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتدا یہاں دیوار پر تصویر بنانے کی مشق زیادہ کی جاتی تھی۔ والمیکی راماین میں ایسے کمروں کا تذکرہ ہے جن کی دیواروں پر رنگارنگ نقش و نگار بنے تھے۔ بالی کے مردہ جسم کو جس تابوت میں ڈال کر اس کے ورثا دریا کے کنارے لے گئے تھے اس کا تذکرہ والمیک نے اس طرح کیا ہے۔

"اس کے رنگ نہایت خوبصورت تھے۔ پیدل سپاہی ہزاروں اس میں بنے تھے اور پرندوں اور درندوں کی تصاویر کھنچی تھیں"

ان تذکرات سے گذر کر وہ زمانہ آتا ہے جس کے فن تصویر کشی کے نمونے اب تک موجود ہیں ان میں سے مرزاپور اور رام گڈھ کے غاروں میں جو تصاویر پائی جاتی ہیں ان کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی قدیم زمانے کی ہیں۔ وسط ہند میں رام گڈھ کی پہاڑیوں میں جو گمارہ کے غاروں میں ہیں پرانے آثار فن تصویر کشی کے پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی ابتدائی ضروریات وہ تھیں جن سے اس کے امتداد زندگی کی صورت ہونگے۔ وہ جانوروں کا شکار کرنا اس کے لیے ضروری تھا یا جو اس کے ضروریات میں اس کے مدمقابل بن کر دشواریاں پیش کرتے تھے۔ ان کی جانب سب سے پہلے اس کا خیال مبذول ہوا ہوگا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مقامات میں زیادہ تر ان جانوروں کی تصویریں ہیں جن کا شکار کرنا یا اس کے لیے معمولی بات یا اس کی بہترین آرزو تھی۔ ان مقامات کی تصویروں پر ابھی نقادان فن نے کافی غور نہیں کیا ورنہ ان کی قدامت کا پتہ چل جاتا۔ بہرکیف یہ ثابت ہے کہ جس صنعت تصاویر کی تاریخیں مبصران تصویر نے معین کرلی ہیں۔ ان سے قدیم تر ہیں تصاویر کی سادگی۔ رنگوں کی پختگی۔ صورتوں کا انتخاب اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ تصویریں نہایت ہی قدیم زمانہ کی ہیں۔ چند ماہران فن ان تصاویر کے قدامت کے اس قدر قایل ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ موجودہ تصاویر جو مقامات مذکورہ بالا پر دیکھی جاتی ہیں نقوش ثانی ہیں۔ اور نقوش اول دست برد زمانہ سے بالکل فرسودہ ہو گئے ہیں اور یہ تصاویر نقوش محکوک کی ترجیع کی ناکامیاب کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ممکن ہے

کہ آیندہ شائقین فن کی کوششیں اس سے زیادہ بارآور ہوں۔ اور ان تصاویر کی تاریخیں بھی معین ہو جائیں۔

ہندوستان کے فنِ تصویر کی بابت ہمارے معلومات بودھوں سے پیشتر زمانہ کے متعلق مشکوک ہیں۔ البتہ بودھوں کے زمانہ کے بعد ہماری معلومات صاف اور نسبتاً سلجھی ہوئی ہیں۔

بودھوں کے زمانہ کے پہلے بھی فنِ تصویر ہندوستان کے فنونِ عرفی میں تھا اور اس کے اصول و موضوعات طالبان فن کے ذہن نشین تھے۔

تصویر کے چھ ارکان (سارانگ) کا تذکرہ وات سایَن جو تیسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اس کی تصنیف" موسوم کام سوتر" میں موجود ہے۔ اور خود وات سایَن مقر ہے کہ میں نے یہ اصول بہت قدیم کتابوں سے اخذ کئے ہیں۔

چھ ارکان یہ ہیں (۱) روپ بھید: یعنی اشیاء زیرِ نقش کی صورت ظاہری سے واقفیت مثلاً اس کی سطح کی کیفیت۔ اس کی صورت کی ساخت۔ عمارات کی تقطیع میدانوں کا نشیب و فراز وغیرہ۔

(۲) پرمانم۔ یعنی اشیاء زیرِ نقش کی جسامت و ساخت کی صحیح معلومات ان کی لمبائی چوڑائی۔ نیچائی اونچائی۔ موٹائی کا مساحت و پیمائش کے رو سے صحیح اندازہ۔

(۳) بھاؤ۔ یعنی احساسات و جذبات کا اثر اشکال ظاہری پر مثلاً مغموم انسان کے چہرہ کی حالت یا خوشی سے مسکراتے ہوئے بچے کی شگفتگی۔

(۴) لاونیہ جوجنم۔ یعنی ادا بندی۔ مثلاً کسی حسینہ کی گردن کا دوران تقریباً اس طرح خم ہو جانا کہ دیکھنے والے لوٹ جائیں۔ یا کسی محوِ خواب معشوقہ کا اپنا ہاتھ اس انداز سے گال کے نیچے رکھے ہونا کہ دیکھنے والا بے قرار ہو جائے۔

(۵) سدرشیام۔ یعنی واقعات کا ہوبہو نقش اتارنا۔ مثلاً کسی عمارت کا یا انسان کا ایسا صحیح نقش کاغذ پر اتارنا کہ دیکھنے والا اصل سمجھ لے۔

(۶) ورنکا بھنگا۔ یعنی تصویر کشی کے آلات کا صحیح اور صاف استعمال۔ نقش کی صحت۔ رنگوں کی مناسبت وغیرہ وغیرہ۔

ان موضوعات تصویر کشی کے علاوہ قدیم زمانہ کے تصاویر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باشندگان ہند کو مناسب اجزا میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مثلاً اگر بادشاہ کی تصویر کھینچتے ہیں تو ان کی قدوقامت۔ تراش۔ خراش۔ چال ڈھال سب معمولی انسانوں سے زیادہ دلکش اور دقیع ہے۔ اسی بادشاہ کے ساتھ خدام ہیں وہ امرائے عموماً اور بادشاہ سے خصوصاً چھوٹے ہیں۔ بادشاہ کے چہرے سے جلال اور احترام نمایاں ہے۔ خدام کے چہروں پر خوشامدانہ

پرپنانی اور فدویانہ انکسار پایا جاتا ہے۔ کسی بھی شکار کی تصویر کھینچتے ہیں تو اس کے چہرہ پر یاس اور درد کا رنگ چڑھا دیتے ہیں اور شکاری کا چہرہ فرط انبساط سے جو عملی کامیابی کا نتیجہ ہے۔ کھل جاتا ہے۔ ان تمام حالات سے یہ واضح ہے کہ بودھوں کے زمانے سے پیشتر فن تصویر کشی ہندوستان میں کافی ترقی کر چکا تھا اور لوگ اس کو مائیہ ناز سمجھتے تھے۔ شلپ شاستر اور چتر لکشن جیسی کتابوں کی موجودگی اس دعوی کے بیّن دلیل ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب گوتم بدھ کے قائم کیے ہوئے مذہب کے لوگ تصویر کشی کو مذہب کی جان سمجھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ تصویر کے ذریعے ہم اپنے مذہب اور اپنے ہادی دین کی ایسی یادگاریں قائم کر دیں گے جن کو زمانہ کا بے رحم ہاتھ بھی مشکل سے مٹا سکے گا۔ اس زمانہ کے مذہبی جوش اور واقعات گردوپیش کی امداد نے فن تصویر کشی کو معیار کمال پر پہونچایا۔ آج بھی نقادان فن اطراف وجوانب سے آتے ہیں اور ان مصوروں کے حسن کمال اور رفعت تخیل پر غور کر کے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ سیلون۔ چین۔ تبت۔ جاپان۔ نیپال۔ جہاں کہیں بودھ مذہب کی روشنی پہونچی تصویر کشی کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

بودھوں کا زمانہ ۔۔۔ سے ۔۔۔ تک سمجھنا چاہیئے۔ فی الحقیقت یہ ہندوستان کا زریں زمانہ تھا اور گوتم بدھ کے مذہب کے اصول اور واقعات فن تصویر کشی کے ترقی کے لیے خاص طور پر موزوں تھے۔

گوتم کا اصلی نام سدارتھ تھا۔ اس کی تلقین مذہب یہ تھی کہ دنیا رنج اور تکلیف کا مقام ہے انسان کی اولین اور بہترین کوشش اس امر کی ہونی چاہیئے کہ اعمال درست کرے تاکہ اس کو نروان یا نجات دوامی حاصل ہو کر تکالیف ہستی سے رستگاری نصیب ہو۔ صحیح نظر۔ صحیح رائے۔ راست گفتاری راست کرداری۔ بے لوث نیکی۔ راست خیالی اور استغراق حقیقت ہی سے انسان صعوبات ہستی سے نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے۔

بودھ مذہب کے حامیوں نے تلقین اصول کا بڑا رکن تصویر کو قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا دور دراز مقامات پر سفر کر کے انھوں نے شبیہ کے ذریعے اپنے پیمبر گوتم کے واقعات زندگی اور نصائح مذہبی کو نہ صرف زبان سے ادا کیا بلکہ سامنے مجسمہ دکھلا دیا۔ جس سے گوتم کا مذہب چار دانگ عالم میں نور آفتاب کی طرح پھیل گیا۔ اور آج صدیوں کے بعد بھی خلقت عالم کا ⅓ حصہ اسی مذہب کا پیرو ہے۔

اس وقت تک ان تصاویر کے تین خاص مرکز دریافت ہوئے ہیں۔

۱۔ اجنتا کے غار
۲۔ مقام سگریا واقع سیلون یا لنکا۔
۳۔ ریاست گوالیار میں مقام "باغ"

پہاڑی چٹانوں کو کاٹ کر ان کے خول کے اندر عمارات پیدا کی جاتی ہیں اور اس خول کو غار کہتے ہیں۔

اجنتا۔ یہ ایک مقام ہے جو حیدرآباد دکن کی ریاست میں مقام فردپور سے چار میل کے فاصلہ پر جانب جنوب و مغرب واقع ہے۔ فردپور جی آئی ریلوے اسٹیشن جلگاؤں سے ۵۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔

بودھ مذہب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیروان دین مناظر قدرت اور مشاہدات فطرت کے دلدادہ تھے۔ اجنتا جہاں بودھ مذہب کی بہترین تصاویر ہیں یا ایلورہ جہاں بودھ مذہب کی بہترین سنگتراشی کے نمونے ہیں ایسے مقامات پر واقع ہیں جہاں قدرت کی گلکاریاں رنگارنگ نظر آتی ہیں۔

بودھ مذہب کے پیروں نے تصاویر سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک اپنے مذہب کے پھیلانے کا کام بکثرت لیا۔ ان کے جھنڈوں پر گرد گوتم کے زندگی کے سبق آموز حالات کی بے شمار تصویریں ہوتی ہیں اور اسی طرح مختلف مفید روایات کا بھی خاکہ تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔

اجنتا میں کل ۲۹ غار ہیں۔ سب سے پہلے ان کا پتہ نقادان مغرب کو سنہ ۱۸۱۹ء میں لگا یہ غار مختلف اوقات میں آراستہ کیے گئے۔ مثلاً غار نمبر ۹ اور ۱۰ سنہ ۱ء میں بنائے گئے تھے۔ اور غار نمبر ۱۶ و ۱۷ ار سنہ ۵ء میں بنائے گئے تھے غار نمبر ۱ و ۲ سنہ ۶۲۵ء سے سنہ ۶۴۲ء میں بنائے گئے تھے۔ ابتداً ان تمام غاروں میں فن تصویر کے بیش بہا اور لاثانی نمونے ہوں گے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۰ء میں صرف ۱ و ۲ و ۹ و ۱۰ و ۱۶ و ۱۷ میں تصاویر باقی تھیں۔ باقی تمام غاروں کی تصاویر دستبرد زمانہ سے ملیامیٹ ہو گئیں۔

یہ تصاویر دو حصص میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اول وہ جو اس زمانہ کے تواریخی واقعات کا چربہ ہیں۔ دوم وہ جو گوتم بدھ کے مختلف اوتاروں کے حالات کا نقشہ ہیں۔

مصوروں کا ہمہ گیر تخیل۔ اجزائے تصویر کی غیر معمولی لمبائی چوڑائی طرز تکمیل کی سادگی اور مختلف تصاویر کے مجموعہ میں باہم ربط اور تصویر کامل کی اثر اندازی رنگوں کی خوشگوار اور لطیف آمیزش اور افراد تصاویر کی عظمت و شوکت یہ چند باتیں ہیں جن سے اجنتا کی تصاویر مایہ ناز ہیں۔ لیکن ان تمام اوصاف سے بالاتر مصوروں کی مشق خاکہ کشی اور خطاطی ہے۔ خط پر بودھ مصور کو وہ قدرت حاصل ہے اور اس کے فراز و نشیب سے وہ جو کچھ کر دکھاتا ہے۔ وہ مصوران مغرب باوجود اپنے عظیم الشان اور کثیر الیوان تصاویر کے نہیں کر سکتے۔

دوسری بڑی خصوصیت جو قابل ذکر ہے ہاتھوں کا انداز ہے۔ محض کلائی۔ ہاتھ کی انگلیوں اور انکی پیچ وخم سے جذبات کا اظہار کرنا بودھ تصاویر کی ایک لاجواب صنعت ہے۔ تصاویر بول نہیں سکتیں لیکن خیالات کا اظہار مختلف حالتوں سے کرتی ہیں اور مصور کی تابیں داد کامیابی یہ ہے کہ ناظرین بے زبانوں کی زبان بے کم وکاست سمجھ لے۔

سگریا کی تصاویر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ تصویریں دو غاروں میں ہیں۔ تصویر بڑی اور نہایت صاف ہیں قریب قریب دو درجن عورتوں کی تصویریں ہیں جن میں جذبات کا اظہار گردن کے خم۔ ہاتھوں اور انگلیوں کی کشش اور جھکاؤ بڑھاؤ سے کیا گیا ہے تصویروں کی دلکشی اور ادا قابل داد ہے۔

ماہران فن کا اندازہ ہے کہ سگریا کی تصویریں اور اجنتا کے بعض غاروں کی تصویریں ایک ہی زمانہ کی ہیں۔ بلکہ بعض بودھوں کا خیال ہے کہ وہ راجہ کا سیاپ کی رانیوں کی ہو بہو تصویریں ہیں۔

جس طرح اجنتا یا سگریا کی تصویروں کے زمانے معین کئے گئے اس طرح "باغ" کے تصاویر کا زمانہ معین نہیں کیا جا سکا۔ یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس بادشاہ کے وقت کی بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کا مقصد اعلیٰ کیا ہے۔ بظاہر وہ تصاویر مذہبی قسم کی نہیں معلوم ہوتیں۔ لیکن بودھ مذہب کا اثر ان پر بیّن طور سے نمایاں ہے۔

اب تک یہ تصویریں بودھ مذہب کی یاد دل میں تازہ کرتی ہیں۔ فاہین۔ اور ہین سانگ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھوں کے زمانہ میں ہندوستان میں بہت سے اور تصویرخانے بھی تھے جواب باقی نہیں ہیں۔ شاید یہ چند یادگاریں بھی غارتگری سے محفوظ نہ رہتیں اگر وہ پامال راستوں سے ہٹ کر واقع نہ ہوتیں۔

بودھوں کے فن تصویر پر تارانا تھ مورخ ایک دوسرے نقطۂ خیال سے روشنی ڈالتا ہے تارانا تھ لکھتا ہے کہ ابتدًا بودھوں کے فن تصویر کشی کے تین خاص اصناف تھے۔

اول۔ دیو۔ یعنی وہ طرز تصویر کشی جو مگدھ دیس میں رائج تھا۔ اور جس کا زمانہ سنہ عیسوی سے ۳۰۰ سے ۶۰۰ سال پہلے تک ہے۔

دوم۔ یاکش۔ یعنی وہ انداز جو شاہ اشوک کے وقت میں رائج تھا۔

سوم۔ ناگا یعنی یکم صدی عیسوی سے تیسری صدی عیسوی تک۔

کسی قدر ضعیف الاعتقادی کے ساتھ تارانا تھ اول الذکر دو اصناف کو مافوق العادت طاقتوں کا نتیجہ بتلاتا ہے۔

بدھوں کے زوال کے بعد ایک بہت عرصے تک ہندوستان میں مصوروں کا قحط سا ہو گیا اجنتا کے آخری دور تصویروں کے بعد ہم اکبر کے زمانے تک کوئی قابل الذکر تصویریں نہیں پاتے سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں البتہ مصوری کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہوا سنہ ۱۳۹۹ء میں تیمور کا حملہ ہندوستان پر ہوا۔ تیمور کے بعد خاندان تیموریہ کے زیر سایہ فن تصویر کشی نے معراج کمال حاصل کیا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں سلطان حسین خراسانی کے دور میں بہزاد نے اس فن کو اس کمال تک پہونچایا جو آج بھی دنیا کے کاملان فن کے رشک کا باعث ہے۔

مغل بادشاہوں کو تصویریت خاص مذاق تھا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل اکثر مصوروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ عبدالصمد شیرازی۔ میر سید علی تبریزی۔ فرخ کلماتی وغیرہ وغیرہ۔ جہانگیر کے زمانہ میں سمرقند کے مصور دربار میں حاضر تھے۔ اس زمانہ میں بھی اہل ہند غیر ہندی صنعت مصوری کے تحصیل کمال میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ دربار اکبری کے مصوروں میں بساون۔ دسونت کیشو داس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حتیٰ کہ اکبر نے نظامی کے تصنیفات کو باتصویر بنانے کی خدمت ہندو مصوروں کے سپرد کی تھی۔۔

چونکہ اس زمانہ کے فن تصویر کی نشو و نما بادشاہوں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اس لیے تصویریں یا تو بادشاہوں کے تفنن طبع کے لیے یا ان کے کارناموں کی یادگار میں کھینچی جاتی تھیں نہ اس زمانہ کی تصویروں کو مذہب سے زیادہ لگاؤ ہے نہ حرم سرا کے واقعات سے زیادہ بجسف لہو لعب کی تصادیر پیش کرنا اس دور کے مصوروں کا فخر تھا۔ واقعات درباری کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچنے میں مصوروں کا کمال صرف ہوتا تھا اور اس زمانہ کی یادگاریں ایسی ہی تصویریں ہیں۔

ایرانی قلم جس سے دور مغلیہ کی ابتدائی مصوری سے مراد ہے اس کی حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

۱۔ یہ کہ مصور زمین تصویر کو بیل بوٹوں اور فطرتی کیفیات سے مزین کرتا ہے۔

۲۔ طلائی جدولوں اور زرنگار رنگ حاشیوں کا استعمال۔

۳۔ پوشاک اور دیگر آرائشات تصویر میں سونے کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔

۴۔ خاکے نہایت صاف اور روشن ہوتے ہیں۔

۵۔ تصویروں کے دامن میں مصور کا نام ضرور ثبت ہوتا ہے۔

علاوہ اس انداز کے کشمیری قلم۔ پٹنہ قلم۔ اصناف مصوری میں مرجح و ممتاز ہیں۔

تمام شاہان مغلیہ میں سے جہانگیر تصویر کا خاص طور پر دلدادہ تھا۔ اور اسی کے زمانہ میں مصوری اعلیٰ ترین منازل ترقی پر پہونچی۔ شاہجہاں کے وقت میں اس فن کا بدیہی زوال نظر آتا ہے۔ تصویری

کی جگہ اس بادشاہ کے دور میں سنگتراشی اور تعمیرات نے لی۔ اور اورنگ زیب کے عہد میں اس اکبری اعزاز اور جہانگیری افتخار کو میّت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد مغل انداز تصویر کشی یا مفقود ہو گیا یا ایسی حالت میں باقی رہا جس کا ہونا نہ ہونے سے بدتر ہے۔ کچھ شاہی نظرِ عنایت کی بے رخی کے باعث پیروانِ فن کے دل ٹوٹ گئے۔ کچھ مغرب کی موج ہند آشوب نے جہاں اور مشرقی چیزوں پہ پانی پھیر دیا مصوری کو بھی بہالے گئی۔

راجپوتوں کے فن تصویر کے عروج کا زمانہ مغلیہ فن مصوری کے زمانہ سے ہم قدم ہے فرق یہ ہے کہ اس کی روح ہندی ہے اور اس کی روح غیر ہندی۔ راجپوتوں میں بودھوں کی سی مذہبی عقیدتمندی باقی نہ تھی لیکن مذہب سے ان کو مس ضرور تھا۔ اس انداز مصوری کی خصوصیات میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ نہ مغلوں کی طرح راجپوتوں کی نقاشی محض صورت نگاری اور حالات دربار و سیر و شکار ہی تک محدود تھی اور نہ بودھوں کی طرح مذہب سے ہٹ کر مشق کرنے سے ان کو انکار تھا۔ ان کا دائرہ عمل ان دونوں کی ترکیب ہے۔

۲۔ عام دلچسپیوں کی چیزوں کی تصویریں راجپوتوں کو بے حد عزیز تھیں۔ بازار سڑک۔ میلے خوشی کی محفل۔ ماتم کا جماؤ۔ ایسی تصویروں نے زمین تصویر کشی میں ایک بے بہا اضافہ کر دیا۔

اس دور کے اصناف تصویر مختلف مقامات کے نام سے موسوم ہیں۔ مثلاً کانگڑا قلم جے پور قلم۔ دکنی قلم۔

بودھوں کے زوال کے بعد ایک بار پھر برہمنوں کا ستارہ چمکا۔ پھر بت پرستی ترقی پر ہوئی اور صورت پرست ہندوں کو محض تصویروں سے تسکین نہ ہوئی۔ بلکہ پتھر کی مورتوں کی خواہش ہونے لگی۔ امتداد زمانہ نے نتیجہ یہ دکھلایا کہ صورت نگاری کو زوال ہوا اور صورت تراشی کو ترقی نصیب ہوئی۔

راجپوتوں کے زمانہ کے مختلف قلموں کی بنیاد ان میں جز مذہب کی کمی یا زیادتی پر ہوئی۔ کہیں کہیں اثر اور مقامی خصوصیات سے بھی نام پڑ گئے۔

ان مصوروں میں کوئی جدت یا تخیل کی بلند پروازی نہیں پائی جاتی۔ ہاں خاکہ اور خط کشی میں انکو خاص مشق ہے۔ غرضکہ دور راجپوتوں میں جہاں روحانیت کا رنگ ہے وہاں روزمرہ واقعات کا بھی فوٹو کھینچا جاتا ہے۔ سونار۔ لوہار۔ جولاہا۔ گاڑی ہانکنے والا۔ ہل جوتنے والا کسان۔ وغیرہ وغیرہ راجپوتوں کی مصورانہ توجہ کے مستحق قرار پائے۔ دور شاہجہانی اور راجپوتی کے بعد موجودہ زمانہ تک کوئی خاص ترقی اس فن نے نہیں کی کہیں کہیں راجپوت یا مسلمان مصوروں کے چند خاندان باقی تھے۔ جو کس مپرسی کے عالم میں اپنے اجداد کے پیشہ کے انتخاب اور اپنی ناگفتنی حالت کو رو رہے تھے۔ میسور یا تنجور میں چند مصور اس فن کی مشق قائم رکھتے تھے لیکن ان کی تصویریں مشرقی اور مغربی اثرات کی ترکیب سے نقادان تصویر

کی نگاہوں میں کھٹکتی تھیں۔ ان مصوروں نے ہاتھی دانت پر تصویر بنانا شروع کیا لیکن وہ قابل قدر ترقی نہ کر سکے۔ انجام یہ ہوا ۱۸۶۰ء کے قریب یہ چند خاندان بھی فنا ہو گئے۔

اتفاقات زمانہ کہیے یا قوم کی قسمت سمجھئے جس مغربی اثر نے ہندوستان کے فن تصویر کو تخریب اور تباہی کے عالم میں ڈال رکھا تھا اسی مغربی اثر نے ہندی فن تصویر کے جسم مردہ میں تازہ روح پھونک دی۔ پہلے سے زیادہ پاک اور پہلے سے زیادہ ممتاز۔

کوئی پندرہ سولہ سال ہوئے کلکتہ کے فنون لطیفہ کے پرنسپل اے۔ بی۔ ہیول نے اپنے چیدہ ہونہار شاگردوں کو یہ مربیانہ نصیحت کی کہ ہندوستان کے قدیم فن مصوری کی اگر تجدید کی جائے اور گذشتہ زمانہ سے موجودہ وقت تک روحانی اور طبعی ترقی قدیم معلومات کے ساتھ شامل کر دیجائے تو ہندوستان کا فن تصویر پھر قابل قدر ہو جائے۔ جس طرح زرخیز زمین میں ہونہار دانہ کو صرف ذرا سی نمی کا انتظار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہیول صاحب کے شاگرد بھی گویا اس نیک رائے ہی کے منتظر تھے۔ منجملہ ان شاگردوں کے ابانندر ناتھ ٹیگور بھی تھے جو سرا بندر ناتھ کے بھتیجے ہیں اور جو اب اپنے استاد ہیول کے جانشین پرنسپل ہیں۔

ابانندر ناتھ ٹیگور کی کوشش سے بنگال میں ایک طبقہ نوجوان طباع اور جوشیلے بنگالیوں کا ایسا پیدا ہو گیا جس نے مغربی خصوصیات تصویر کو نسبتاً برطرف کرکے ہندوستانی اصول و موضوعات ملحوظ رکھ کر تصاویر کھینچنا شروع کیا۔ ہر زمانہ کے لوگوں کو دور ماضی کی معلومات وراثتاً ملتی ہیں اور ہر دور کے لوگ اس میں اپنے طور پر کچھ کمی بیشی کرکے نسل آیندہ کے لیے بطور ترکہ چھوڑ جاتے ہیں۔

مغرب کی فوٹوگرافی واقعات پیش نظر کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہے اور ہندوستان کے اس انداز کے مصور راجہ روی ورمانے کرتا دنظر سیلاب کی آنکھوں کو مدتوں سے خیرہ کر رکھا تھا۔ لیکن دور جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ مصور اشیاء افراد زیر نقش کی غلامانہ نقل نہیں کرتے بلکہ تصویر میں اپنے دل۔ اپنے جذبات اپنے احساسات کی روح پھونک دیتے ہیں۔ ان کی کامیاب کوشش یہ ہے کہ نقش کے ساتھ نقاش بھی نظر آئے۔ نقاش کاغذ کے ساتھ ساتھ اسی کی محسوس نقاش ازل کو نقش میں دکھلاتے ہیں۔

مناظر فطرت کی صحت۔ سفیدی سیاہی کا تناسب۔ رنگوں کی شگفتگی اور دلکشی سب کچھ جو اگلے مصوروں میں تھا یہاں موجود ہے۔ اسی فرق سے کہ اگلے زمانہ کے مصور مناظر قدرت پر نظر ڈال کر رہجاتے تھے اور ٹیگور اسکول کے مصور مناظر فطرت کے مشاہدوں میں فاطر ہستی کا احساس کرتے ہیں اور اسکو اپنے تصویروں میں دکھادیتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر ناظر تصویر اس اثر سے فیضیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ ہندوستان کے نوجوان مصوروں کے ہم خیال ہو کر تصویر پر نظر ڈالنے کے عادی نہیں ہیں

دور جدید کے مصور بھی اگلے ماہران فن کی طرح اکثر ہندوستان کی قدیم کتابوں سے مضمون تصویر کا انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن ان کا انتخاب یہیں تک محدود نہیں ہے۔

ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل کمال زیادہ تر انسانی زندگی کے روشن حصے کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ان کا خیال تاریک رخ کی جانب کم جاتا ہے یہ ماہران فن جذبات خاموش کے ممتاز مصور ہیں۔

اس دور کے آئندہ ترقی کی بابت صحت کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی البتہ اگر جاپان کے ناقابل قبول اثرات اور نقادان مغرب کی گمراہ کرنے والی تعریفوں کے خطرے اس زمانہ کے مصور محفوظ رہ سکے اور عوام الناس کے مذاق تصویر شناسی نے بھی ترقی کی تو امید ہے کہ ایک عرصۂ دراز کی کس مپرسی اور زاویہ نشینی کے بعد پھر ہندوستان فن تصویر آسمان کمال پر پہونچے گا اور اس آسمان ترقی پر ابانندر ناتھ ٹیگور کا نام آفتاب ہو کر چمکے گا۔

⁂ ⁂ ⁂

حضرت داغ دہلوی مطبوعہ زمانہ جولائی سنہ ۱۹۰۵ء

کے ابتدائی حصہ میں شاعری کے مفہوم پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اس کے جذبات دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں اور چونکہ شاعر کے کانوں کی فضا میں سلاست زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ ان میں علاوہ عالم تصویر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اس کے جذبات دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اس کی زبان سے نکلتے ہیں غرضکہ جذبات شاعری کی روح رواں ہیں اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہے لہذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہوگا وہ اسی قسم کے جذبات سامع کے دل میں بھی جوش لائے گا مگر ان جذبات و خیالات وغیرہ کی دو قسمیں ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ جذبات و خیالات سے بحیثیت مجموعی فطرت انسانی کا روحانی حصہ مراد لیا جاتا ہے اور ادنیٰ جذبات و خیالات سے حیوانی حصہ۔ جس شاعر کی فطرت میں اعلیٰ جذبات و خیالات ترقی پر ہوتے ہیں وہ پاکیزہ نظری اور بلند خیالی کی ہوا میں اڑتا ہے اور اس کا کلام دوسروں کے دل میں بھی اعلیٰ جذبات کو جوش میں لاتا ہے۔ برعکس اس کے جس شاعر کی فطرت میں ادنیٰ جذبات و خیالات کا دریا موجزن ہوتا ہے اس کے اعلیٰ جذبات و خیالات ریگ تہ نشیں کی طرح پامال رہتے ہیں اور اس کی شاعری سننے والے کے دل میں بھی ادنیٰ جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔"

برج نرائن چکبست

رفتارِ خیال

نیاز فتحپوری

زمانہ جنوری ۱۹۲۱ء

گرمیوں کی وہ راتیں، جب طلوع قمر کے ساتھ ہی ساری کائنات کھِل کھلا کر ہنس پڑتی ہے، جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے چاندنی برف کی طرح پگھل پگھل کر تمام وادی کو رقیق چاندی سے لبریز کر دیتی ہے، جب اس روشن سکون میں نوامیسِ فطرت کے فرشتے اپنی خاموشی پہ دادِ وارفتگی دیتے پھرتے ہیں، مجھے کیوں اچھی معلوم ہوتی ہیں؟ ان کی ملیح روشنی کیوں مجھے وارفتہ بنا دیتی ہے۔

میں ایک سنسان ساحل پر بیٹھا ہوا اسی خیال میں مستغرق ہوتا ہوں کہ چاند کامل چاند، یعنی حسینِ فطرت کا پورا چہرہ، "اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا" دور کے افق سے نکل کر اپنی تشنہ کرنوں کی پیاس پھیلے ہوئے سمندر سے بجھاتا ہوا، نمودار ہوتا ہے اور میرا خیال، خیالِ حال کو مغلوب بنا لیتا ہے۔

ساری دنیا پر پڑا ہوا یہ تاریک پردہ کس نے سمیٹ لیا؟ یہ تمام کائنات پر پھیلی ہوئی سیاہی چشم زدن میں کیونکر دھل گئی؟ خلاءِ عالم میں وہ کونسی وسیع جگہ ہے جہاں یہ بسیط ظلمت پناہ گزیں ہو گئی؟ میں ہر چاندنی رات میں ان مسائل پر غور کرتا ہوں، میں ہر کامیاب روشنی کو دیکھ کر مغلوب و مفتوح تاریکی کی جستجو کیا کرتا ہوں، لیکن اپنی کوشش میں اس سے زیادہ نکو نہیں ہوتا کہ دفعتہ آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے، دماغ ایک کرہ کی طرح گردش کرنے لگتا ہے اور میں آنکھ بند کئے اسی پھیلی ہوئی روشنی میں ہزیمت خوردہ تاریکی کو اپنے پپوٹوں کے اندر دعوت دیتا ہوں اور پھر گھبرا کر آنکھ کھول دیتا ہوں۔

آج بھی میں نے یہی کیا۔ اس وقت بھی تھوڑی دیر تک روشن کرنوں پر اپنی نگاہوں کو دوڑا کر میں اسی خیال میں مستغرق ہو گیا۔ یہاں تک کہ سمندر کی لہریں میں جوش یعنی پانی کے رقیق ساز میں آہنگ خروش پیدا ہونے لگا اور وہ کیفیت جس سے اس وقت تک صرف میری آنکھیں آشنا تھیں میرے سامعہ تک بھی پہونچی اور میرے لیے سخت دشوار ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کس کی لذت پہ اپنے حواس کو قربان کر دوں۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ میں نے دو مختلف حس سے متعلق ہو کے ...

دو مختلف کیفیتوں کے امتیاز میں دشواری محسوس کی ہو۔

نور و ضیاء کی یہ فراوانی اور صرف ایک میری نگاہ سازِ فطرت کی یہ نغمہ سامانی! اور صرف ایک میرا ساموا! قدرت کے یہ انعامات اور اعترافِ کرم میں صرف ایک میرا دھڑکنے والا دل! یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمین، شجر و حجر، کوہ و ہامون، خزان و بہار، شمس و قمر، بحر و بر اور جو کچھ اس عالم میں نظر آتا ہے، شاید میرے ہی لیے عالمِ وجود میں آیا ہے اور جس وقت میں نہ ہوں گا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اب میں مابعد الطبیعت کی بھول بھلیاں میں پھنس گیا۔

"جب میں نہ ہوں گا" یعنی میں مر جاؤں گا! یہ خیال بھی کس قدر عجیب و غریب ہے۔ باوجود اس یقین کے کہ ایک دن مجھے دنیا سے رخصت ہونا ہے، یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ واقعی یہ امر وقوع میں بھی آ جائے گا۔ اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ کس طرح سمجھ میں آتا کہ دنیا کا نظام کیونکر میرے فقدان کو برداشت کرے گا۔

میرے مکان کے پاس کل ایک شخص مر گیا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آج بھی آفتاب اسی طرح طلوع ہوا جس طرح اس کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ آج بھی اسی انداز کے ساتھ شام رونما ہوئی جسے وہ دیکھا کرتا تھا۔ یہ تاروں کا چمکنا، یہ دریا کی روانی، یہ شور و ہنگامہ، یہ شفق، تفریح، یہ غروبِ آفتاب کے بعد دور سے مندروں کا اپنے گھنٹوں کے دلکش آواز کو ہوا میں منتشر کرنا، یہ شام کے وقت چڑیوں کا درختوں پر بیٹھ کر بسیرا لیتے ہوئے دنیا کو اپنی آخری موسیقی سنانا، یہ نسیمِ سحر کا گلوں کے آغوش میں مچل کر انھیں گدگدا کر ہنسا دینا، یہ پہاڑوں کی پُر فضا بلندی، یہ وادیوں کا دلکش عمق، یہ دنیا اور دنیا کا سارا انتظام، یہ تمام آبادی اور اس کے جملہ ہنگامہ آرائیاں آج بھی اسی طرح نظر آتی ہیں جس طرح کل مرنے والے کے سامنے۔ اس لیے مجھے سمجھنا چاہیے کہ میرے بعد بھی یہ سب کچھ اسی طرح رہے گا۔ اور جس طرح ایک حباب کے پھوٹ جانے سے فوارہ کی روانی، پانی کا تموج اور حبابوں کی نمود بند نہیں ہوتی۔ اسی طرح دنیا اپنی کسی ادا کو، زمین اپنی کسی گردش کو میرے نہ ہونے سے کبھی نہ بدلے گی۔

آہ! فطرت بھی کیسی ظالم چیز ہے

یہ سوچتے ہوئے میرے اندر ایک جذبۂ انتقام پیدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں نفرت و تکدر کی کیفیت رونما ہوتی ہے، کہ دفعتاً چکور کا جوڑا میرے سر کے اوپر سے گذرتا ہوا ہوا میں، روشن ہوا میں، چاندنی کے پھیلے ہوئے سمندر میں بلند ہوتا ہے اور اپنی آواز سناتا ہوا گویا مجھے تنبیہ کرتا ہے کہ اپنی شاہراہ حیات اس کے نشانِ پرواز پر قائم کروں۔ میں چند منٹ تک دیکھتا رہتا ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ کاش میں بھی طائر ہوتا اور نہایت آزادی سے جہاں چاہتا

اڑتا پھرتا۔ اس خیال کے زیر اثر میں دنیا کے ایک ایک طائر کا جائزہ لیتا ہوں کبھی گرمی میں ایک گھنے املی کے درخت پر بولنے والی فاختہ پہ مجھے رشک آتا ہے۔ اور کبھی لب جو تیرنے والے سرخاب پر کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ کاش میں کبوتر ہوتا۔ اور کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ قمری بن جاتا۔ کسی وقت کوئی گانے والی چڑیا بننے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اور کسی وقت کوئی طائر خاموش۔ میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ یہ طیور و حیوانات بھی کوئی نفس، کوئی قوت شعور رکھتے ہوں گے یا نہیں اور وہ بھی کیا دنیا کو اسی ہیئت و صورت اسی آب و رنگ میں دیکھتے ہوں گے جس طرح میں دیکھ رہا ہوں۔ جس طرح میں سمجھ رہا ہوں۔ میں ہنوز اس خیال کے آخری حد تک نہیں پہونچتا کہ سامنے سے ایک برہمن کی لڑکی۔ تنہائی میں چراغ رکھے ہوئے سمندر کی لہروں پر تیرانے کے لیے آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور قریب آکر مجھ سے اپنی نازنین آواز میں پوچھتی ہے کہ "یہاں پانی گہرا تو نہیں ہے" میں یہ سنتا ہوں: در میری روح میرا خیال میرا تمام کارگاہ تصور و قیاس کسی ایسے عمیق سمندر میں ڈوب جاتا ہے، جہاں سے ابھر کر میں اپنی گذشتہ زندگی کو بالکل اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے روشنی کا مینار بیچ سمندر سے دور ساحل کی روشنیوں کو دیکھا کرتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

"میں دولت کی زیادتی کو دولتمندی نہیں کہتا اور دولت کی کمی کو بھی مفلسی نہیں کہتا۔ یہ دراصل ان دونوں کی حالتوں کا نام ہے جس کے دل میں ان قابلیتوں کی کمی ہے جو واقعی زندگی کا سکھ عطا کرتی ہیں۔ میں اس کو مفلسی مانتا ہوں یہ سچ ہے کہ روپے پیسے کی کمی مصیبت کا سامنا ہے۔ پیٹ کا دکھ بڑا دکھ ہوتا ہے لیکن مجھے افلاس کی اصلی صورت وہاں نظر آتی ہے جہاں دل کے سچے جذبات کو ابھرنے اور دنیوی مناظر سے خوش ہونے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ ایشور نے تمھیں دنیا میں پیدا کیا۔ سورج چاند ستارے سب کے سب تمھارے غلام ہیں۔ دریا اور پہاڑ کے دامن تمھیں اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھا رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کان ناک آنکھ جیسے اعضا ہیں۔ دل و دماغ عطا ہوئے ہیں مگر تم ان کے جائز استعمال سے قاصر ہو۔ ممکن ہے بنک میں تمھارے کروڑوں روپے جمع ہوں لیکن اگر تم کو شانتی نصیب نہیں تو تم دولتمند نہیں مفلس ہو تمھاری حالت قابل رحم ہے۔ سچی دولت وہ ہے جو دل کی قابلیتوں کو بڑھاتی جائے علم و عقل کو وسعت دے حلم محبت، جوش اور ہمدردی تمھارے حصے میں آئیں، انسانیت کا مقصد پورا ہو۔

مہرشی شیوبرت لال ورمن

ادب الکاتب

نواب حیدر یار جنگ طباطبائی

زمانہ، جنوری ۱۹۰۶ء

زبان کیونکر بنتی ہے اور کون بناتا ہے۔ اس مسئلہ کو تاریخ نہیں حل کر سکتی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ زبان کو قوم بناتی ہے۔ شخص نہیں بنا سکتا۔ قوم اسی طرح زبان کو بنالیتی ہے جس طرح بھڑیں اپنا چھتہ یا چیونٹیاں ریگ تودہ بنالیتی ہیں۔ جس قوم نے جو زبان بنائی ہے اسی کے افراد اس زبان کے اہل زبان ہیں ان کے ہمسایہ لوگوں نے انھیں سے ان کی زبان کو سیکھا ہے۔ وہ بے شک ان کے مقلد ہیں۔ اس زمانہ کے آزاد خیال تقلید کو ناجائز سمجھتے ہیں اس بات پر غور نہیں فرماتے کہ تقلید اگر امور عقلیہ میں ہو تو آزادی کے خلاف ہو سکتی ہے زبان تو بالکل سمع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں تقلید سے چارہ نہیں۔ ایک ہندی عمر بھر عربی فارسی انگریزی پڑھتا رہے تو کیا وہ محاورہ عرب و فارس و انگلستان کی تقلید سے آزاد ہو سکتا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا ہندی اپنی زبان کا مالک ہوگا۔ سیکھی ہوئی زبان اس کی فطری زبان نہیں ہو سکتی مرزا بیدل اہل بہار میں سے ایسا نازک خیال شاعر پیدا ہوا جس کا مثل ایران میں نہیں نکل سکتا۔ مگر ان کی قابلیت فارسی اعتبار سے ساقط سمجھی گئی ہے۔ حالی مرحوم کے یہ الفاظ ہیں کہیں کہیں بیدل کی ٹھسک نکل جاتی ہے۔ بیدل نے فارسی ترکیبیں بنانے میں مالکانہ تصرف کیا ہے جسے ایران کے شعرا نہیں مانتے۔ لیکن بیدل پھر بیدل تھا۔ اس کی تقلید میں اردو کہنے والے بہت ہی بگڑے۔ یہ سمجھ گئے کہ فارسی زبان میں ہم نے عمر صرف کی ہے۔ کیا اب بھی ہم اس میں تقلید کیے جائیں اب جو ہمارے قلم سے نکلے غلط نہیں ہو سکتا۔ بے زبان اردو پر پہلے یہ آفت نازل ہوئی۔ اس کے بعد کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوان نے قلم اٹھایا۔ ان کے پاس مضامین کا ذخیرہ بے انتہا ہے۔ لیکن زبان سے بیگانہ ہیں۔ انہوں نے انگریزی کا تحت اللفظ ترجمہ کرکے اردو کی صورت کو بگاڑ دیا۔ اور نہایت ہی غلط ترکیبیں فارسی و عربی کی بھی اردو میں شامل کیں۔ مثلاً احمد، محمود اور خالد اے اول الذکر نے یہ کیا۔ ثانی الذکر نے یہ اور آخر الذکر نے یہ "دو اشخاص دو امور اور دو کتب" جان توڑ کوشش ان تھک محنت اور ناقابل برداشت مصیبت" اس طرح کا اور انگریزی زبان

سے مخصوص ہے اردو کی نحو میں حرف عطف کا لانا اور ترک کرنا سب کچھ جائز ہے۔

اول الذکر و آخر الذکر بالکل غلط ترکیبیں ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ زید اور عمرو آئے اسنے یہ کیا اس نے وہ یا زید نے یہ کام کیا عمرو نے وہ۔ دو اشخاص کی جگہ دو شخص کہنے میں آپ کو یہ تردد ہوا کہ شخص تو مفرد ہے۔ مگر اس بات کو بھول گئے کہ اردو میں مذکر کا مفرد و جمع ایک ہی ہے آپ سنتے ہیں دو شخص آئے تو شخص کو مفرد نہیں سمجھتے۔ جان توڑ اور رات تہک ہندی دو لفظ بنائے ہیں لیکن بنانے کی ترکیب نحو و فارسی سے لی ہے۔ یعنی بنانے والے کو یہ امتیاز نہیں کہ ہم فارسی کی نحو کو ہندی کے الفاظ میں جاری کر رہے ہیں۔ ناقابل برداشت یعنی ناگوارا۔

"مادری زبان" بہت مشہور لفظ ہو گیا ہے۔ جن بزرگ نے انگریزی سے اس کا ترجمہ کیا انھیں یہ خیال نہ آیا کہ (مدر ٹنگ) میں لفظ مدر اور ہی معنی رکھتا ہے۔ جیسے ... (مدر چرچ) میں مدر کے معنی ہیں ایسے ہی مدر ٹنگ میں بھی ہیں آپ نے مادری زبان کا ترجمہ کر دیا یہ نہ دیکھا کہ اس کے کیا معنی ہوئے۔ آخر باپ دادا کی تمام بزرگوں کی تمام خاندان کی وہی زبان ہے نہ پھر مادری کہنا کیا معنی۔

اوقات بسر ہوئی نہایت صحیح و بے غش اردو ہے۔ اس کے تصرفات جو اس زمانہ کے اہل قلم نے کئے ہیں عجیب و غریب ہیں۔ بسر اوقات۔ اوقات بسری۔ قوت بسری یہ تین صورتیں غلط ہیں۔ احمد محمود سے لڑا۔ برسرپیکار ہوا۔ نبرد آزما ہوا۔ اس مضمون کو یہ حضرات اس طرح ادا فرماتے ہیں "احمد نے محمود کے خلاف جنگ کی" ہرگز یہ اردو نہیں ہے۔

اس نے نفی میں جواب دیا" انگریزی میں۔ یہ طرز بیان محاورہ میں ہو تو ہو۔ اردو میں تو ایک طفل مکتب کی شوخی معلوم ہوتی ہے۔ زبان میں نفی و اثبات کہاں اس نے نہ مانا۔ اس نے کہا میں نہیں جانتا۔ بس یہ نفی میں جواب ہوا۔ اگر وہ کہتا میں جانتا ہوں تو اثبات میں جواب ہو جاتا۔

"اس حال پر روشنی پڑی" یعنی یہ حال روشن ہو گیا۔ روشنی ڈالی یعنی روشن کر دیا۔

"اس بات کو زور سے کہا" یعنی اس بات پر زور دیا۔

"عملی دلچسپی لی" یعنی سرگرمی یا مستعدی کی۔

"عملی جامہ پہنایا" یعنی عمل میں لایا۔

"ملکی بے چینی" ملک کی بے اطمینانی اہل ملک کی تشویش۔

"مالی امداد کی" مال سے امداد کی۔ مقتضائے محاورہ۔

"جنگ میں حصہ لیا" یعنی شریک ہوا۔

"کافی بدنام ہوا" یعنی بدنام ہونے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔

"حیات و موت کا سوال" جان جوکھوں کا معاملہ۔

"دوران ملاقات" "دوران گفتگو" یعنی اثنائے گفتگو۔ دوران سر، دوران فلک اور اس کے علاوہ جہاں جہاں لفظ دوران محاورہ میں ہے۔ غلط نہیں ہے۔ مگر دوران ملاقات میں یہ لفظ اپنے محل سے سرکا ہوا ہے۔

"مستقبل تاریک ہے"۔ یہ استعارہ انگلش کے کسی بڑے انشا پرداز کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان کا گریجویٹ طبقہ اسے اپنا مال سمجھتا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ بھی اپنی عبارت میں یہ نہ لکھیں گے کہ نجانے اب کیا ہوگا۔ یہی لکھیں گے کہ مستقبل تاریک ہے۔ خیر حرج نہیں ہے۔

"یہ میرا واحد مقصد ہے" یعنی بس یہی تو میرا مقصد ہے۔

"کمانڈر فوج" کمانڈر کا ہندیا مفرس بنا لیا ہے مضائقہ نہیں لیکن زیر کمان کہنا تو ستم ہے

"بیس ہزار سپاہی لاپتہ تھے" یعنی پتہ نہ لگا کہ کیا ہو گئے۔ لاپتہ غلط ہے۔

غرض مجھے جن اہل قلم سے سابقہ پڑا ہے ان کے ترجموں میں یہ رنگ عام ہے دوسری بحث علمی اصطلاحات کی ہے۔ حکمائے یورپ نے لاطینی و یونانی سے علمی اصطلاحات گڑھ لیے۔ ہر ہر فن میں سیکڑوں لفظ ایسے بنائے کہ نہ وہ لاطینی ہیں اپنے معنی کے اعتبار سے نہ یونانی نہ انگریزی اور یہ ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ غریب لفظ مخل فصاحت ہوتا ہے غرض اہل ادب نے یہ غرابت دیکھ کر فن بلاغت کی کتابوں میں یہ وصیت کی کہ ان اصطلاحات کا استعمال کرنا اہل ادب کو جائز نہیں۔ یورپ کے اس واقعہ پر جن لوگوں کو متنبہ ہوا انکی یہ رائے ہے کہ علمی اصطلاحات بامعنی الفاظ میں ہونے چاہیے مثلاً شریان بصر۔ محدود شبکیہ۔ کن بھری۔ میانہ پسلی۔ مرکزہ (منوکلیس) عدسی مرکزہ۔ دم دار مرکزہ۔ مرکزہ دار جھلی خلیہ۔ رسیل اہرامی خلیہ۔ مخروطی خلایا۔ مادہ اولی (پروٹوپلازم) وغیرہ۔ لیکن ہماری جماعت کے بعض احباب یہ رائے رکھتے ہیں جیسے بکرید میں بکری کی ی اور عید کا عین گرا کر لفظ بنا لیا اسی طرح اصطلاحات کو بنانا چاہیے۔ مثلاً (میٹازوا) نخستین حیوات (پروٹوپلازم کی دوسری ارتقائی صورت اور حیوان کی پہلی صورت) اس کی لیے یہ لفظ بنایا گیا۔ نخسیوان۔ گو عربی میں عبدالشمس والوں کو عبشمی عبدالدار والوں کو عبدری کہتے ہیں۔ لاشی سے متلاشی بلا کیف سے بلکفہ بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح کے غتربود سے یہ الفاظ بنائے گئے ہیں لیکن قوم نے اسے بنایا ہے شخص نے نہیں بنایا میں نخسیوان کو مہمل ہی کہوں گا۔ مگر غلبہ آرا سے یہاں کام چل رہا ہے اگر ایک شخص نے اختلاف کیا تو کیا۔

منطق تو قدیم فن ہے اور ہم لوگ ہزار برس سے اسے پڑھتے آئے ہیں اور آج تک پرانے ہی اصطلاحات سے کام چل رہا ہے۔ اب منطق میں بھی نئے اصطلاحات گڑھ لیے گئے۔ مثلاً تغیوقہ وطاطیس۔ ان الفاظ سے یہ حضرات اردو کو مکمل کرنا چاہتے ہیں اور ڈکشنری کو ضخیم لیکن اس اہم چیز کی پیشین گوئی اس باب میں ضرور پوری ہونے والی ہے کہ یہ سب زحمت ہبار منثور

ہونے والی ہے۔ اردو کو اس سے تو ضرر نہیں پہونچے گا۔ ہاں پہلی صورت سے بہت ضرر پہنچ رہا ہے۔ اس وقت مجھے جتنی مثالیں یاد آئیں لکھ دی ہیں مجھے امید ہے کہ کوئی اردو کا ہوا خواہ ایسا اٹھ کھڑا ہوگا کہ اس کام کو تمام کر دے گا۔

∴　　∴　　∴

مہرشی شیو برت لال صاحب ورمن زمانہ جون ۱۹۳۹ء کے چند پیراگراف:۔

فخر قوم مہرشی شیو برت لال صاحب ورمن ایم۔ اے کی ذات بابرکات سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی واقف ہے۔ ہندوستان میں عموماً اور پنجاب اور یو۔ پی میں خصوصاً شاید ہی کوئی ایسا ضلع ہو جہاں آپ کے لٹریچر کے شائقین موجود نہ ہوں۔

آپ قوم کے کائستھ تھے۔ آپ کا وطن مالوف موضع پورہ قانون گویاں ہے جو راج بنارس میں کونڑہ روڈ اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلے پر جانب مغرب واقع ہے۔ شروع شروع میں آپ چنار اور بریلی آریہ سماج اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ منشی بلدیو پرشاد صاحب بریلوی اور پنڈت کامتا پرشاد صاحب ترویدی (پنڈت رگھوناتھ پرشاد صاحب ترویدی سابق سول جج گورکھپور کے والد بزرگوار) آپ کے ہمعصر تھے۔ آپ نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے اس زمانہ میں کام کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کا مزاج آزادی پسند تھا اور قدرت نے آپ کو کسی خاص کام کے لیے مخصوص کیا تھا چنانچہ ملازمت میں رہتے ہوئے بھی آپ نے "دبدبۂ قیصری" نامی اخبار بریلی سے نکالا جو تھوڑے ہی دنوں تک مقبول خاص و عام رہا۔ زمانہ کا اجرا بھی جو اب مکرمی منشی دیا نرائن نگم کی زیر ایڈیٹری نکل رہا ہے آپ ہی کا رہین منت ہے۔ فروری لغایت اکتوبر ۱۹۰۳ء یہ آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں آپ نے اُسے منشی صاحب کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد جب "آریہ گزٹ" لاہور کی ایڈیٹری کے لیے ایک قابل شخص کی ضرورت محسوس ہوئی تو سماج کے برگزیدہ اصحاب کی نگاہیں آپ ہی پر پڑیں۔ چنانچہ آپ نے جس خوبی و کامیابی کے ساتھ "آریہ گزٹ" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دئے وہ محتاج بیان نہیں۔ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے مرحوم، فدائے قوم مہاتما ہنس راج جی شہید وطن سوامی شردھانند جی آپ کے سچے مداح اور قدردان تھے۔ (موتی لال مختار۔ ایڈیٹر سنگت گورکھپور)

اسلافِ ہند کے تمدنی کارنامے

ڈاکٹر جے۔ آر۔ دت

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

اسلافِ ہند قدیم اور ان کے موجودات جانشینوں میں بعد المشرقین ہے۔ مدت ہوگئی ہمارے بلند ہمت اولو العزم بزرگوں کے اوصافِ حمیدہ ہم سے رخصت ہو گئے بلکہ ان کے برعکس زمانۂ حال کے ہندوؤں میں ایسی مذموم عادتیں اور رذیل خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں جو ان کے واجب الاحترام اسلاف کے سو کوس بھی قریب نہ پھٹکی تھیں۔ یہ بےمثیل امتیاز اسلافِ ہند ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے ملک گیری کے مقبول عام دستور العمل سے دانستہ انحراف کر کے اپنے ہمجنسوں کی لوٹ مار روا نہ رکھی۔ بلکہ ان کی تمدنی ترقی کے خیال ہی کو مدنظر رکھا۔ اور دنیا میں اپنی اولو العزمیوں کے غیر فانی نشانات چھوڑ گئے۔ جو زمانہ کی دستبرد سے اب تک نیست و نابود نہیں ہو سکے۔

زمانہ قدیم کے بلند نظر ہندوؤں نے بلا شبہہ غیر ملکوں پر پرامن چڑھائیاں کیں مگر دوسروں کے زر و مال سے مستفید ہونے کے مقصد سے نہیں۔ انسانی خون سے زمین رنگنے کے ارادہ سے نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کے اخلاقی اور تمدنی حالت درست کرنے کے خیال سے انھوں نے ترکِ وطن کیا اور تمدن سے ناآشنا قوموں کے درمیان بستیاں بنائیں جو ترقی کرتے کرتے شاندار سلطنتیں بن گئیں انھوں نے متعدد ممالک میں اپنا دھرم رائج کیا۔ لوگوں کو اپنے علوم و فنون سکھائے اور رفتہ رفتہ مختلف ممالک کے باشندوں کو لوازمِ تہذیب سے کماحقہٗ روشناس کرا دیا۔

اشاعتِ تمدن اور اقتصادی ترقی اسلافِ ہند کا دستور العمل اور ان کی معاشرتی حکمتِ عمل کا اولیں اصول تھا۔ جس کی بدولت ہند تمام دنیا کا محور ہو گیا تھا۔ یہ محض دعوے اور میرا قیاس ہی نہیں ہے بلکہ تاریخِ عالم کا ایک زبردست واقعہ ہے۔ جس سے کوئی صاحبِ فہم (جسے تاریخی واقعات کی تحقیقات سے سطحی دلچسپی ہو) کسی طرح انکار نہیں کر سکتا ہے۔ سنہ عیسوی کے آغاز سے تھوڑا عرصہ پہلے یا پیچھے بلند ہمت ہندو اپنے ملک سے روانہ ہو کر ساحلِ جاوا پر وارد ہوئے۔ اسی طرح اولو العزم آبادکاروں کا ایک دستہ مشرق میں ہند چینی کی طرف بڑھا۔

اور کمبوڈیہ میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی۔ اور ایک دستہ اسی زمانہ میں وسطی ایشیا کی طرف گیا۔ جس کے قدیم کے نشانات ابھی تک صحرائے ختن میں تین سو میل تک ریت کے تودوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں سنہ عیسوی سے ڈیڑھ دو سو سال پیشتر قنوج کے دو شہزادوں نے ایک زبردست بستی آرمینیا میں قائم کی تھی جو کئی سو برس تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ برقرار رہی۔ وادی دجلہ فرات اور نیز وادی نیل میں ہندو تمدن کے نشانات برآمد ہوئے ہیں مگر ان کی نسبت صرف استدلال تمثیلی سے مماثلت قائم کی گئی ہے وہاں پر ہند و تہذیب کی ایسی شاندار یادگاریں نظر نہیں آتی ہیں جیسی جاوا اور کمبوڈیا میں سیاحان مغرب کی حیرت و تحسین کی مرکز بنی ہوئی ہیں۔

تمدن ہند کی قدامت و عظمت

ہندوؤں کو یہ فخر ہے کہ وہ سب سے پرانی قوم ہیں۔ انھوں نے اپنے معصر قوموں کی عظمت شوکت آسمان تک پہنچتے ہوئے دیکھی اور پھر اسے شہاب ثاقب کی مانند نیستی میں نیست ہوتے بھی دیکھا ان کے سامنے قومیں بنیں اور بگڑیں۔ بلکہ نینی راس (آسوریہ کی مردانہ صفت حملہ آور) کی یورش اور سیس طرس اعظم (شاہ مصر) کی لیغار بھی دیکھی۔ اسیر ہنی بال اور بنو کد نصیر کے مقوم اور نیز محکوم جہان سے مٹ چکے ہیں اور اب ان کے کارنامے محض افسانہ ہیں دارا اور سکندر کی نسل پردۂ نیستی میں مستور ہو گئی ہے۔ حضرت ابراہیم کی اولاد زندہ ہے۔ مگر من حیثیت قوم نہیں۔ غرض ہزارہا تاریخی انقلابات ہوئے۔ قومیں ہستی سے نیستی میں نہاں ہو چکی ہیں مگر یہ خود تاریخ جدید کے تغیر و تبدل دیکھنے کو اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو لوگ ابھی زمانہ حال تک ہندوؤں کی قدامت کے دعوے کو شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ بھی اب ان روایات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں درحقیقت اس دعوی کی تائید و تصدیق میں جو ثبوت بہم پہونچے ہیں۔ ان سے علمی دنیا میں عظیم تہلکہ برپا ہو گیا ہے۔ اور مغربی محققین اپنے نصف صدی کے مفروضات کے ترمیم و تنسیخ پر مجبور ہو گئے ہیں اور جو مسائل برسوں سے ارباب فکر کی دماغ سوزی کے موضوع بنے ہوئے تھے۔ اب خود بخود حل ہو گئے ہیں۔ ہڑپہ (ضلع منٹگمری) اور ماہن جو دارو (لڑکانہ سندھ) کے حیرت انگیز کھنڈروں نے جن کی کھدائی کا کام جو ۱۹۲۲ء سے جاری ہے۔ محکمہ اثریات (آرکیالوجی) کے ڈائرکٹر۔ سر جان مارشل اور دیگر مغربی محققوں کو اس صداقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ہڑپہ اور ماہن جو دارو کے درمیانی علاقہ کے باشندے اس تمدن کے مخترع اور موجد ہیں جس کے قابل قدر نشانات وادی دجلہ اور فرات مغربی ایشیا۔ وسطی ایشیا۔ اور جزیرۂ کریٹ تک پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر سیس ماہر آثار قدیمہ آسوریہ

اور مسٹر لیون اسمتھ نے جو عجائب خانہ لندن کے شعبہ آثار باقیات کے مہتمم ہیں۔ ہڑپہ اور ماہنجوداڑو کے آثار قدامت کی بنا پر تمدن ہند کی قدامت چھ ہزار سال قرار دی ہے۔ سر جان مارشل موصوف کی بھی یہ رائے ہے کہ ہڑپہ اور وادی سندھ کے قدیم زمانہ باشندے عمدہ شہروں میں رہتے تھے۔ ان کا تمدن نسبتاً نہایت بلند پایہ تھا۔ ان کی صنعت و حرفت درجۂ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اور ان کا رسم الخط بھی اعلیٰ درجے کا مکمل تھا۔ ان کھنڈروں میں پختہ مندر اور اچھے اچھے مکانات پائے گئے ہیں۔ نالیوں پر رنگ مرمر کے تختے جڑے ہوئے ہیں۔ بدروؤں کا نہایت عمدہ انتظام معلوم ہوتا ہے۔ بہت سکے بھی نکلے ہیں جو دنیا میں بے نظیر اور سب سے پرانے قرار دیئے گئے ہیں غرض ان دونوں مقاموں سے سیکڑوں چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن سے ہزار سال کے تمدن ہند پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کی رائے ہیں وادی سندھ کے اسلاف ہند بلوچستان نیز براستہ بحر سو پوطامیہ میں پہنچے اور وہاں بھی اپنی بستیاں قائم کرتے ہوئے ایشیائے کوچک تک چلے گئے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ہند قدیم ہی سے اغیار کے درمیان تمدن پھیلانے کا مستحسن کام کرتے رہے ہیں۔ اب سے تین چار ہزار سال پہلے وادی دجلہ و فرات کے درمیان تمدن ہند کی اشاعت استدلال تمثیلی یعنی آثار قدیم کی باہمی مشابہت سے ثابت ہے اور اب سے دو ہزار سال پہلے ہندوؤں نے جو بستیاں غیر ممالک میں بسائی تھیں ان کے کوہ پیکر نشانات اس وقت بھی باقی ہیں اور زبان حال سے ہند و تمدن کی عظمت کی لازوال داستان بیان کر رہے ہیں۔

غیر ملکوں میں ہندو بستیاں

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے وادی بابت دجلہ و فرات اور نیل میں ہندو نوآبادیوں کے ثبوت صرف تمدنی آثار میں پائے جاتے ہیں۔ مگر جنوب مشرقی ایشیا کی ہندو بستیوں کے شاندار نشانات اب بھی سنگلاخ عمارتوں اور کتبوں کی شکل میں موجود ہیں۔ وہاں کے لٹریچر اور معاشرت پر بھی ہندو طرز بود و باش کا نہ مٹنے والا اثر نمایاں ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جاوا اور ساترا اور بلی کی ہندو بستیوں کا ذکر ہوگا پھر ہند چینی اور ترکستان کی ہندو آبادیوں پر بحث کی جائے گی۔

جاوا میں ہندو تمدن کے آثار

کرنیل ٹاڈ صاحب نے اپنی "راجستان" میں لکھا ہے کہ

"مجمع الجزائر ہند سورج بنسیوں نے آباد کیا تھا جن کے کارنامے اور دیوبر تانت وہاں کے کہنہ سال عمارتوں پر منقش اور کتابوں میں قلم بند ہیں" مشہور مورخ الفنسٹن صاحب بھی رقم طراز ہیں کہ "تاریخ جاوا سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کالنگ دیش کے ہندو سے تارکان وطن جزیرہ جاوا میں وارد ہوئے۔ اور وہاں کے باشندوں کو ہندو تمدن کا سبق سکھایا اور اپنا سن جاری کیا

جواب تک رائج ہے" جاوا کے انگریز گورنر اور مورخ سر اسٹامفرڈ رفلز کی رائے ہے (جس سے پروفیسر ہیرن نے بھی اتفاق کیا ہے) کہ جاوا کے مشرقی ساحلوں کو برہمنوں نے آباد کیا تھا۔ سیول صاحب مسٹر فرگیوسن کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سنہ ۶۰۳ء میں ایک راجہ گجرات سے پانچ ہزار مہاجروں کے ساتھ جاوا میں وارد ہوا اور ماتہ رام میں ایک بستی قائم کی اس قسم کی رائیں دیگر مغربی عالموں نے بھی اب سے چالیس پچاس سال پہلے ظاہر کی تھیں اور گذشتہ چوتھائی صدی کی اثری تحقیقات سے ان خیالات کی صحت ثابت ہوگئی ہے۔ غرض جاوا اولوالعزم ہندو آباد کاروں کی شاندار نو آبادی اور زمانہ بعد کی پُر شوکت ہندو سلطنت تھا۔

جزائر مجمع الہند میں جاوا سب سے بڑا اور نہایت گنجان ہے۔ اس کا رقبہ معہ جزیرہ مدورا پچاس ہزار چار سو مربع میل اور آبادی تین کروڑ سے متجاوز ہے۔ تقریباً سو سال سے ڈچ حکومت ہے آج کل اہل جاوا کا مذہب اسلام ہے۔ گو روزانہ زندگی پر اب بھی قدیم ہندو خیالات اور رسم و رواج کا تسلط ہے۔ جاوا کا سنسکرت نام یاودیپ ہے۔ جس کے معنی "جو اور منڈوے کا ملک" ہے۔ جنوبی ہند کے شہر مدورا کے نام پر جاوا کے پاس بھی ایک جزیرہ کا نام مدورا رکھا گیا ہے جاوا کے جغرافیائی نام سنسکرت سے مستعار ہیں۔ وہاں کے مشہور آتش فشاں پہاڑ کا نام سمیرو ہے۔ کہ جس کا ذکر اکثر پرانوں میں آیا ہے۔ چنڈی ارجنو۔ چنڈی بھیم یعنی ارجن اور بھیم کی یادگاریں۔ سکھ بومی (سکھ بھومی) "سرزمین راحت" پرم بن وغیرہ بھی سنسکرت ہی کے نام ہیں۔ اہل جاوا کی زبان میں بھی سنسکرت الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور جاوا کا ادبیات ہندو لٹریچر کا عکس ہے۔ مثلاً بارت یُد (بھارت یدھ یعنی مہا بھارت) "ارجن پورہ" وغیرہ۔ مہا بھارت اور گیتا کا بڑا رواج ہے۔ اکثر تقریبوں پر اب بھی انھیں کی تلاوت کی جاتی ہے۔ دار المصدر بٹاویہ سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں راجہ پورن ورمن کی بہت تعریف لکھی ہوئی ہے۔ دیگر کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی ہندو آباد کار وشنو مت کے پیرو تھے۔ بعد کی تاریخ نہیں ملتی جب ہندو وسطی اور مشرقی حصوں میں آباد ہوگئے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وشنو مت کی جگہ شیو پوجا نے لی سنہ ۴۱۳ء میں چینی سیاح فاہیان جاوا میں گیا۔ وہ ہندو آباد کاروں کے عروج اور خوش حالی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ہندوؤں کو اس جزیرہ کے اصلی باشندوں کے درمیان اپنا مذہب رائج کرنے میں حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی ہے اور انھوں نے اپنے نئے وطن کو اپنی بے نظیر صنعت اور شائستگی کے دائمی نشانات سے مزین کر دیا ہے۔ وہانگ اور اہانگ کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ

لہ قبل مسیح

مغربی اور وسطی حصوں کے ہندو مت باہم دگر پیوست تھے۔ اور ان کا زور ۹۲۸ء تک رہا۔ ۱۱۶۸ء کے کتبوں سے جو کشن اور جے جے کرشنا سے برآمد ہوئے ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ مت اور شیومت آپس میں شیر و شکر ہوگئے تھے

یہاں پر مغربی عالموں کے "تازہ ترین رایوں" کا اقتباس خالی از لطف نہ ہوگا۔

جاوا میں ہندو اقتدار پانچویں صدی سے شروع ہوا تھا اس جزیرہ کے مذہب اور لٹریچر طریقہ حکومت اور زبان رسم الخط اور فنون پر ہند و عظمت کا دائمی اثر نمایاں ہے ہندو آباد کاروں کی مساعی حسنہ سے شاندار سلطنتیں معرض وجود میں آئیں۔ جاوا کے ہندو تمدن کی شوکت کا اثر سماٹرا۔ بورنیو۔ اور جزائر ملایا تک پہونچا۔ بعض عالموں کی رائے میں ہندو اقتدار کا اثر پاپوا اور آسٹریلیا تک نمایاں پایا گیا ہے (ماخوذ از نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۴)

ذیل کا اقتباس انسائیکلوپیڈیا برطانیکا (گیارہواں اڈیشن جلد ۱۵ صفحہ ۲۵۲) سے دیا جاتا ہے۔

> تاریخ جاوا کا سب سے پہلا باب ہندو شوکت سے شروع ہوتا ہے جو تین زمانوں پر منقسم ہے۔ اول بودھ مت کا عہد۔ دوم شیو پرستی کے غلبہ کا زمانہ سوم ان دونوں کے باہمی ملاپ کا قرن ہے۔ جاوا میں جتنی ہندو سلطنتیں قائم ہوئی ہیں ان میں سب سے زبردست اور مشہور وہ ہے جو پندرہویں صدی تک رہی۔ اور کئی حکومتیں بھی اس کی باجگذار تھیں اور اسی کی شوکت کا اثر دور افتادہ جزائر تک بھی پہونچا تھا جہاں ہندوؤں کی بہت سی عظیم الشان یادگاریں ابھی تک پائی جاتی ہیں۔ ان کی تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ محرابوں اور ستونوں کے بنانے میں چونہ سے کام نہیں لیا گیا۔ وسطی خطہ کے مندر آٹھویں اور دسویں صدی کے ہیں۔

ہندو سلطنت کی عظمت ساتویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک رہی۔ اس کے بعد پندرہویں صدی میں جاوا میں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ جاوا اور بالی کی موجودہ حالت کیا ہے؟ اس دلچسپ سوال کے جواب میں ملک الشعراء ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے خیالات کا خلاصہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا۔

جولائی ۱۹۲۷ء میں آپ دو چار اور بنگالی احباب کے ساتھ جاوا۔ بالی۔ ملایا سنگاپور اور سیام کی سیاحت کو گئے تھے۔ جہاں سے آخر اکتوبر گذشتہ میں آپ واپس آئے۔ چنانچہ

ڈاکٹر موصوف نے اخبار "اسٹیٹسمین" کلکتہ کے ایک نمائندہ سے دوران مکالمہ میں یہ فرمایا کہ "ہند و فلسفہ اور ہندو خیالات کا جیسا خوشنما اظہار جزائر جاوا اور بلی میں ہوا ہے دیسا ہم نے اور کہیں نہیں دیکھا خصوصاً اہل بلی کی معاشرت پر تو ہند و تہذیب و تمدن کا ابھی تک سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ مہا بھارت اور راماین کا تو وہاں کے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں بہت بڑا اثر ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوستان میں مہا بھارت و راماین عوام کے زندگی پر اس طرح متسلط نہیں ہیں جیسے کہ جاوا اور بلی میں ہیں وہاں کی صناعی اور موسیقی ناچ رنگ اور نقاشی کو ان دونوں کتابوں سے تحریک حاصل ہوئی ہے۔ غرض جو مقبولیت سنسکرت کی رزمیہ شاعری کو وہاں حاصل ہوئی ہے وہ ہندو فلسفہ کو کبھی نصیب نہیں ہو سکی"۔

جاوا میں ہندو تسلط کی غیر فانی یادگار بورو بدر کا وہ ہیکل مندر ہے جو سطح مرتفع وہانگ پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند ہے اور اس کے اوپر آنے جانے کے لیے عمدہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ جس کے دو ہزار سات سو زینے ہیں۔ اوپر کے پانی کے اخراج کے لیے جو نہر بنی ہوئی ہے وہ اگلے زمانے کے ہندوؤں کی صناعی کا قابل تعریف نمونہ ہے۔ اسی خطہ میں مندر واقع ہے اور اس کی بلندی اردگرد کے میدان سے ڈیڑھ سو فٹ ہے۔ اس کی چار منزلیں ہیں اس کے بیرونی حصہ میں لاوے کے سنگلاخ ڈھیلے صاف کرکے پیوست کئے گئے ہیں جو بہت بڑے اور وزنی ہیں۔ سنگ تراشی کی نازک اور دلفریب صنعت کاریوں سے اس مقدس مندر کو آراستہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ اعلیٰ ترین دستکاری کے ہزارہا نمونے در و دیوار فرش اور چھت اور پہلوؤں میں موجود ہیں۔ صدہا آرائشی مورتیاں اور زیبائشی بیل بوٹے۔ انسانی اور حیوانی نباتاتی شکلیں منقش ہیں ماہرین کا یہ اندازہ ہے کہ اگر ان تمام مورتیوں کو پہلو بہ پہلو آراستہ کیا جائے تو ان کے لیے تین میل لمبا میدان درکار ہوگا۔ ان کا کل شمار دو ہزار ایک سو اکتالیس ہے۔ بورو بدر کی ابتدائی منزل کا ہر ایک ضلع چار سو ستانوے فٹ اور بلندی پچاس فٹ ہے۔ سب کے اوپر ایک بڑا گنبد ہے جس کا قطر باون فٹ ہے۔ اس کے اردگرد اور سولہ گنبد ہیں جو سب کے سب بڑے گھنٹے کی مانند ہیں۔ برم بن کے مندر بھی گذشتہ ہندو عظمت کی زندہ یادگار ہیں۔

جاوا اور بلی کے باشندوں کے طور و طریقے ہندوانہ ہیں۔ چنانچہ جزیرۂ بلی میں اب تک ستی کا رواج ہے۔ وہاں کے لوگ اسلام کے دائرہ میں نہیں آئے ہیں دونوں جزیروں کے لوگ ہندو رسم و رواج کے پابند اور ہندو تیوہاروں کے معتقد ہیں۔ مسجدوں میں نماز خاص موقع ہی پر پڑھی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اہل جاوا صرف نام کے مسلمان ہیں۔

کمبوڈیہ میں قدیم ہندو شوکت کے نشانات

سنہ عیسوی سے کچھ عرصہ پیشتر ہندوستان کے مشرقی ساحل، غالباً ساحل بنگال سے کئی مقتدر روسا اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ کہ جنمیں براہمن کشتری ۔ ونش وغیرہ قوموں کے افراد تھے ۔ ہند چینی کو گئے اور ایک بستی قائم کر لی ۔ کہ جس سے کمبوڈیہ میں رفتہ رفتہ ہندو سلطنت قائم ہو گئی ۔ اُس ملک کی روایات کے روسے ابتدائی ہندو آبادکاروں کا سردار مہاراجہ دنی کار چکبار پریہ سنگھ تھا ۔ اور ناگ ان کا خاص قومی نشان تھا ۔ اسی وجہ سے ان کے مندروں اور قلعوں اور دیگر عظیم الشان عمارتوں پر سانپ کی مورت بنی ہوتی تھی ۔ جو اب تک کمبوڈیہ کی تاریخی عمارتوں پر پائی جاتی ہے ۔ کمبوڈیہ کے پرانے باشندے تہذیب سے بالکل بیگانہ تھے ۔ اس لیے انھوں نے مذہب اور ہندو تمدن کو قبول کر لیا ۔ جدید اثری تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں یہاں پر ہندو دھرم کا عام رواج تھا ۔ اور ہندو ادبیات نے یہاں کے اصلی باشندوں کو بناگر دیدہ بنایا دیگر علوم و فنون بھی مقبول عام ہو گئے تھے ۔ پرانے باشندے اپنی قومی روایات کو فراموش کر کے ہندو مذہب اور دیگر باتوں پر دل و جان سے قربان تھے ۔ شتر و ورمن کے زیر کمان ہندو آبادکاروں کو بڑا عروج حاصل ہوا ۔ مگر ساتویں صدی میں شترو ورمن کے شاہی خاندان کا نام مٹ گیا ۔ اور ہندو سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی ۔ اور دو حکمران حکومت کرتے تھے ۔ نویں صدی کے آغاز میں ان دونوں خاندانوں میں پھر اتفاق و اتحاد ہو گیا ۔ اور جے ورمن سوم کے شاہی خاندان کی حکومت شروع ہوئی کہ جس کے دوران میں ہندو تہذیب کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا ۔ اسی مبارک عہد میں وہ شاندار عمارتیں تعمیر ہوئی کہ جو اب تک ہندو صنعت کی بہترین یادگاریں سمجھی جاتی ہیں ۔ انگ کر راجدھانی قرار پایا جس کی تعمیر کی تکمیل جسثو ورمن نے سنہ ۹۰۰ء میں کی تھی جب ہندو سلطنت کا اقبال بلند ہوا تو ہندو دھرم راج دھرم قرار پایا اور دسویں صدی تک مروج رہا پھر بودھ مت پھیلنا شروع ہوا تھا انگ ورکا مشہور مندر بارہویں صدی کے پہلے حصہ میں تعمیر ہوا تھا پنڈت دیوکر مہاراجہ کا میر عمارت اور کار مختار تھا کہ جس کے زیر ہدایت یہ عظیم الشان مندر تعمیر ہوا وہ اپنے زمانہ کے تمام ہندو حکمرانوں کا منظور نظر تھا ۔ اُس زمانہ میں چمپہ کا راج کو چین چائنا اور جنوبی انام پر حاوی تھا ۔ کہ جو جے ورمن ہشتم کے عہد میں بارہویں صدی کے اخیر میں مفتوح ہو کر کمبوڈیہ کی ہندو سلطنت میں شامل ہو گیا موجودہ سیام اور چین کے جنوبی صوبے بھی ہندو راج کے زیر نگیں تھے ۔ یہ سلطنت ایک وقت میں موجودہ ہند چینی پر مسلط تھی ۔

موجودالوقت کمبوڈیہ میں انھیں پرانے ہندوؤں کی اولاد اب بھی بستی ہے ۔ راجہ بھی ہندو

نسل سے ہے جو کئی برس سے فرانس کے زیر سایہ راج کرتا ہے۔ ہندو دان آشرم صدہا سال سے وہاں پر قائم چلا آتا ہے۔ گو لوگوں کا عام دھرم بودھ مت ہے۔ مگر رسم و رواج اور خیالات اور ادبیات اور دیگر فنون پر ہند و تمدن کا استمراری اثر منقش ہے۔ براہمنوں کا زور ہے۔ ہند و توہمات بھی عام ہیں زبان پر بھی سنسکرت الفاظ کا تصرف ہے۔ راج دربار کے فرائض براہمنوں کی اولاد انجام دیتی ہے۔ شاہی نسل کے لوگ بڑونش" کہلاتے ہیں۔ ولیعہد" اپ راج" کہلاتا ہے۔ دریا کو اہل کمبوڈیہ "مگان" کہتے ہیں جس کے معنی گنگا ماتا کے ہیں شہر کو وہ نگر کہتے تھے۔ جو بگڑ کر اب انگور رہ گیا ہے۔ ملک کا نام کمبوڈیہ کمبوج سنسکرت سے مستعار ہے جس کا ذکر مہابھارت اور پورانوں میں آیا ہے۔ غالباً اس ملک کا پہلا فرمانروا کمبو تھا جس کی وجہ سے اس کا نام قرار پایا۔ کمبوڈیہ میں ہندو عظمت کی سب سے بڑی یادگار انگوروت کا عظیم الشان مندر ہے جو جنوبی ہند کے مندروں کے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی دیواروں پر سینکڑوں نفیس مورتیاں اور نقش و نگار کندہ ہیں۔ جنہیں کرشن جی۔ رامچندر جی۔ راون اور گرڑ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں " امنت مرب " کی مورتی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اور سینکڑوں دیویاں دیوتے بھی ہر جگہ کندہ کئے گئے ہیں۔ مندر کا وسطی گنبد ایک سو اسی فٹ بلند ہے اور اس کی پرکرما کا ایک پہلو نصف میل لمبائی میں ہے اس سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مندر کی چار دیواری سنگلاخ ہے اور ہر طرف دو دو میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ دیواریں بیس اور تیس فٹ بلند ہیں اس کے اندر جانے کے لیے پانچ عظیم الشان دروازے ہیں۔ شاہی محلات اور مندروں کی اسی وسیع احاطہ کے اندر واقع ہیں مندر کے پچاس بڑے بڑے میناروں پر برہما کی چومکھی مورتیاں ہیں جو ہندو صناعی کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

کمبوڈیہ کے میدانوں جنگلوں اور پہاڑوں میں اب تک پرانے شہروں مندروں اور قلعوں کے نشانات پائے جاتے ہیں علاوہ بریں پرانے ہندو آبادکاروں نے آمد و رفت کی عمدہ سڑکیں بنوائی ہیں دریاؤں اور ندی نالوں پر پختہ اور مستحکم پل بنوائے تھے جن کے کھنڈر اب تک پائے جاتے ہیں۔ سلسلۂ انہار بھی قائم کیا تھا۔ جو ہندو انجینیروں کی ہنرمندی پر دال ہے۔ ابھی یہ نہیں معلوم ہوا ہے کہ ہند چینی میں ہند و شوکت کو کیونکر زوال لاحق ہوا۔ لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کوئی آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ زلزلہ یا پلیگ وغیرہ۔ جس سے چشم زدن میں ساری عظمت ہندو نابود ہو گئی۔ فرانس کا محکمۂ آثار قدیمہ بھی تحقیقات اور پرانی عمارتوں کی شان بحال کرنے میں مصروف ہے۔

وسطی ایشیا میں ہندو تمدن کے آثار

پچاس ساٹھ سال سے مغربی عالموں کا یہ خیال ہے کہ وسطی ایشیا یعنی ترکستان و ختن میں بھی

ہندو آبادیاں تھیں۔ ٹاڈ صاحب اپنی "راجستان" میں لکھتے ہیں: "عبدالغازی تمک کا ذکر کرتا ہے کہ جو ترک کا بیٹا تھا پورانوں میں اسے ترشکا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی اولاد نے اس ملک کو تورک استھان یعنی ترکستان کا نام دیا تھا۔ میکس مولر کی رائے ہے کہ ترک اور اس کی اولاد جو تورانیوں کی نمائندہ ہے۔ زمانہ قدیم کی رزمیہ کتابوں میں مذکور ہے۔ اسے طوران لکھا ہے جو اپنے ورثہ سے محروم ہونے سے ترک وطن کرنے کو مجبور ہو گئی تھی۔ ایک مسلمان مورخ بقول ہندو سپریارٹی راوی ہے۔ "ملک ختا کو ابتدا میں ہندو آبادکاروں نے آباد کیا تھا۔" یہ امر موجب مسرت ہے کہ نصف صدی پہلے کے خیالات اور پورانوں اور مہابھارت کے حوالوں کی تائید و تصدیق سرآرل سٹائن اور کرین ہیڈن کی تحقیقات سے بھی بخوبی ہوتی ہے کہ جو موجودہ صدی کے آغاز سے ہوتی چلی آئی ہے اور اس بارے میں سرآرل موصوف نے ہندیہ جو احسان کیا ہے اس سے سبکدوش ہونا امر محال ہے۔

ترکستان کے مشرقی حصہ میں ہندوؤں کی جو بستی تھی اس کے نشانات صحرائے ختن میں پائے گئے ہیں۔ کتبے۔ سکے، مسودے اور بیسیوں چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ جن سے ہندو آبادکاروں کے تمدنی ترقی پر متعدد روشنی پڑتی ہے۔ رنگ سنگتراشی کے نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جو ہندو صناعی کا قابل قدر نمونہ ہیں۔ سرآرل اسٹائن نے سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء میں صحرائے ختن کے مدفون کھنڈروں کی کھدائی کی تو سینکڑوں پرانی چیزیں برآمد ہوئیں۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی نقاشی اور کار چوبی کے نمونے ہاتھ آئے ہیں تحریریں ہندی رسم الخط میں ہیں۔ بعض سنسکرت میں اور پراکرت بھاشا میں بھی ہیں۔ اسی راستہ سے بودھ مت چین میں پہنچا تھا۔ سرآرل اسٹائن کا اندازہ ہے کہ مشرق سے مغرب تک تین سو میل کی لمبائی میں اڑتی ریت کے نیچے مدفون شہروں کے کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ غرض موصوف کی رائے میں "ہر چیز پر ہندی تمدن کا نقش نظر آتا ہے"۔

چوبی لوحوں اور چرمی پرزوں پر صدہا تحریریں دریائے تیہ کے آگے کی سرزمین سے ہاتھ آئی ہیں جو خروشتی حروف میں ہیں ایک تختی پر پراکرت پائی گئی ہے کہ جس سے بظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تیسری صدی عیسوی میں پنجاب سے لے کر ختن تک یہی ہندوؤں کی عام بولی تھی۔ پروفیسر راپ سن کا خیال یہ ہے کہ خط تو خروشتی مگر زبان پراکرت تھی۔ جس میں سرکاری احکام نافذ ہوتے تھے۔ ختن کے ملک کو ٹکسلا کے ہندوؤں نے سن عیسوی سے دو سال پہلے فتح کیا تھا۔ سرآرل موصوف اس امر کی نسبت حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ روزمرہ کی معاشرت کے حالات ہندوستانی زبان میں قلم بند پائے جاتے ہیں بہرحال ان واقعات سے واضح ہو گیا ہے کہ ترکستان میں بھی ہندو آبادکاروں نے اپنا دھرم اور تمدن رائج کیا اور پھر حکومت قائم کر دی۔

❖ ❖ ❖

چھوٹی لین

رام سرن نگم ۔ ایم۔ ایس۔ سی

زمانہ فروری ۱۹۲۶ء

جناب میرا مطلب، ریلوے کی چھوٹی لین سے ہے، جس کو انگریزی میں METER GAUGE کہتے ہیں۔ خدا رکھے اس چھوٹی لین میں بہت سی خوبیاں ہیں پولیس کی طرح اس میں گورنمنٹ کے تلنگے نہیں ڈھلتے نہ بڑی لین کی طرح روپیہ کمایا جاتا ہے اس کا اصلی مقصد صرف خلق اللہ کو آرام پہونچانا ہے۔ مثل مشہور ہے "کم کھانا و غم کھانا" یہی اس کا مدعا ہے۔

یوں تو ہر شخص کے چار دوست چار دشمن ہوتے ہیں مگر سچ پوچھئے تو چھوٹی لین کا دل سے کوئی بدخواہ نہیں ہے۔ آپ اس پر نہ جائیے کہ اخباروں میں آئے دن لوگ اس کے دکھڑے رویا کرتے ہیں۔ یہ تو آج کل کے اخباروں کی معمولی شعبدہ بازیاں ہیں۔ اور نامہ نگار اصحاب کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ جب کبھی کونسلوں کی کارروائیوں، ممبروں کے سوال و جواب، ملکی، قومی صوبہ داری و پیشہ وری کانفرنسوں کی رُوداد اور متعدد یونیورسٹیوں کے امتحانات کے نتائج سے جگہ بچی تو بیچارے ایڈیٹران اخبارات کے لیے اس کے سوائے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ معاملات کو بڑھا گھٹا کر اپنے ناظرین کے تفننِ طبع کا سامان مہیا کریں۔ جھوٹے قصے فرضی افسانے چھاپیں۔ من گھڑت کہانیاں اور مصنوعی شکایتیں شائع کریں۔ بیچاری چھوٹی لائن بھی اسی خوئے بد کا شکار ہے۔ اور جب اخباروں کو اور کچھ چھاپنے کو نہیں ملتا ہے تو اس غریب ریل کے متعلق گمنام شکایتی خطوط چھاپنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ذرا غور فرمائیے اگر یہ خطوط اصلی نامہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہوں یا ان کے شکایتیں سچ اور درست ہوں تو پھر نامہ نگاروں کو اپنے نام پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آئے اور یہ تحریریں یتیم خانہ کے بچوں کی طرح گمنام کیوں رہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان خطوط کے اوپر صاف اور واضح طور پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ اڈیٹر اخبار نامہ نگاروں کی رائیوں کا ذمہ دار نہیں میں پوچھتا ہوں کہ مراسلہ گمنام اور اس کے شائع کرنے والے صاحب بری الذمہ پھر ان

تحریروں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ آخر ریلوے کمپنی کیوں ان کا لحاظ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحبان ان تحریرات پر مطلق دھیان نہیں دیتے اور اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے آخر بڑے بڑے بادشاہوں تک کے مخالف ہوا کرتے ہیں۔ بغض و حسد رنج و کینہ کا جواب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ جواب جاہلاں باشد خموشی یہی طرزِ عمل چھوٹی لین کے افسران کا ہے۔ آپ خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ الخاموشی نیم رضا اور کمپنی کے سکوت سے کہیں یہ قیاس نہ کر لیجیے گا کہ حکام چھوٹی لین نے کبھی کسی معاملے میں اپنا قصور تسلیم کر لیا ہے۔ نہ جناب یہ نہ ہوگا۔ اول تو چھوٹی لین میں کوئی نقص ہی نہیں ہو سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی قصور بھی ہو تو افسران اس کی طرف توجہ دیکر کب تک بات کا بتنگڑ بنانے لگے۔ لیکن سچ پوچھیے تو آج تک جتنی شکایتیں ہوئی ہیں سب غلط اور بے بنیاد اسی لیے میں بے زبان و معصوم ریلوے کی حمایت کے لیے مستعد ہوں۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کسی وجہ سے کسی دفتر کا کوئی ملازم برخاست کر دیا جاتا ہے تو اس کے متعلق بیسیوں گمنام خطوط اخباروں میں نکلنے لگتے ہیں مگر یہ سب خطوط اسی برخاست شدہ ملازم کے لکھے ہوتے ہیں اسی سے ان کی وقعت نہیں ہوتی اور ہونا بھی نہ چاہیے۔ اسی طرح ایک صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس ریل کی بے توجہی موجودہ تہذیب کے لیے باعثِ شرم ہے۔ مگر میں اس شرمیلے نامہ نگار سے صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ اس کا یہ لکھنا سراسر فضول ہے۔ کمپنی اب بھی بے توجہ ہے اور رہے گی۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ اس طرح دھمکانے سے کمپنی مرعوب ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے خیال کے مطابق اس کو ترقی پر مائل کر سکے گا۔ تو وہ صریحًا غلطی پر ہے۔ جس کو آپ "ترقی" یا "ریفارم" سمجھتے ہیں وہ کمپنی کے نزدیک تنزل ہے۔ آپ ان خیالاتِ خام کو دل سے نکال دیجیے۔ چھوٹی لین میں شروع ہی میں انتہائی ترقی ہو چکی ہے اور اب اس میں کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں ہے۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ آفریں ہے کمپنی کی بلند ہمتی اور مستقل مزاجی پر کہ وہ ان بزدلانہ حملوں کا مطلق خیال نہیں کرتی بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایک لطف اور ہے۔ شکایتیں تو ہندوستان کے اخباروں میں نکلتی ہیں مگر ڈائرکٹران سات سمندر پار انگلستان میں رہتے ہیں۔ درحقیقت وہ اس شرط سے منتخب کیے جاتے ہیں کہ کبھی کوئی ہندوستانی اخبار نہ دیکھیں گے اب رہے ملازمان وہ اس بارے میں کوئی خط و کتابت نہیں کر سکتے۔ غرض یہ تمام فضول شکایتیں یوں ہی رہ جاتی ہیں۔ کوئی قضیہ ہوتا ہے۔ نہ قصہ جس طرح شبِ ہجر کے فرضی مصائب کی معشوق کو خبر نہیں ہوتی ہے اسی طرح ڈائرکٹران کمپنی بیکار باتوں پر کان نہیں دیتے ہیں۔

بعض اصحاب کو یہ شکایت ہے کہ چھوٹی لین کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں نکلتا۔ لیکن ذرا

غور فرمائیے تو آپ اس اعتراض کو غلط بلکہ سراسر غلط پائیں گے۔ ہر اسٹیشن پر اردو ہندی میں نہ سہی انگریزی میں ضرور کسی نہ کسی وقت ٹائم شیٹ آویزاں کیا گیا ہے۔ پھر بتلائیے ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟ چھوٹی لین کو آئے دن کی تبدیلیوں سے نفرت ہے اس کے اوقات مستقل ہیں جو کافی غور و فکر کے بعد ہمیشہ کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور ہر شخص کو ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ورنہ لاعلمی کا علاج تو قانون کے پاس بھی نہیں ہے۔ خیر کچھ ہو چھوٹی لین شروع سے اخیر تک ایک وضع پر قائم ہے۔ وہ دوسری ریلوں کی طرح لوگوں کا روپیہ فضول برباد کرنا گناہ سمجھتی ہے۔ آخر بار بار نئے نئے ٹائم ٹیبل چھاپنے سے سوائے اس کے اور کیا فائدہ ہے کہ وقتاً فوقتاً آپ کے ردی کی ٹوکری کے لیے سامان مہیا ہوتا رہے۔ یہ فعل عبث ہے اور چھوٹی لین کے افسران فضول نمود و نمائش کے خلاف ہیں۔ وہ پبلک کو لوٹنا نہیں چاہتے اور نہ تلون طبع واقع ہوئے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ان کا رویہ بالکل درست ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر جنتریوں اور پتروں میں طلوع و غروب آفتاب کے اوقات درج رہتے ہیں مگر آپ نے کبھی کسی شخص کو ان معلومات سے فائدہ اٹھاتے بھی دیکھا؟ لوگوں کو معلوم ہے کہ سرکاری کارڈ آدھ آنہ اور لفافہ ایک آنہ کو ملتا ہے بلا ٹکٹ خطوط بیرنگ ہو جاتے ہیں اور ان کا دوچند محصول ڈاک دینا پڑتا ہے بیس روپیہ سے زائد روپیہ کے رادوسند پر ایک آنہ کا ٹکٹ لگانا ضروری ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ ان معلومات کے واسطے کتنے لوگ پوسٹل گائیڈ یا اسٹامپ ایکٹ کی ورق گردانی کرتے ہیں پھر چھوٹی لین سے ٹائم ٹیبل کی اشاعت کا لوگ کیوں مطالبہ کرتے ہیں؟

اس کمپنی کے اغراض و مقاصد اشتہاری نہیں ہیں اور روپیہ کمانے کی ادنےٰ تدبیریں اس کو بالکل پسند نہیں جس طرح اور بہت سے مقررہ پیمانے ہیں اسی طرح چھوٹی لین کے اوقات آمد و رفت بھی سمجھ بوجھ کر معین ہو چکے ہیں جب ان میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہوتی تو پھر ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟

ایک شکایت یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ جنکشنوں میں چھوٹی لین کا دوسری ٹرینوں کے وقت سے میلان نہیں ہوتا ہے۔ خوب! یہ الزام بیچاری چھوٹی لین کے سر فضول لگایا جاتا ہے۔ درحقیقت مسافروں کو جنکشن تک پہونچا دینے کے بعد چھوٹی لین کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اب یہ اور کمپنیوں کا کام ہے کہ اپنے مسافروں کے آرام و آسائش کا لحاظ رکھیں وہاں تو ہر ماہ وقت تبدیل ہوا کرتے ہیں جس طرح چاہیں اپنے ریلوں کے اوقات درست کر لیں اور مسافروں کو ناحق پریشان نہ کریں۔ مگر غور کیجئے تو اس میں بھی ایک مصلحت مضمر ہے لوگ اسی طرح کان پور۔ لکھنؤ وغیرہ کی سیر اور کاشی پراگ وغیرہ کے اشنان کر سکتے ہیں۔ دوسرے اس سے یکہ تانگہ والوں کی بھی پرورش ہو جاتی ہے۔

اگر مختلف ریلوں کے اوقات ملا دیئے جائیں تو اسٹیشن پر مسافروں کا ہجوم ہی نہ ہونے پائے اور صدہا دوکاندار و خوانچہ والے جن کی معاش کا دارومدار صرف مسافروں کے توسل پر ہے بھوکوں مرجائیں۔

کبھی کبھی اخباروں میں یہ بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ چھوٹی لین کو بڑا کر دیا جائے مگر مجھ کو اس بیجا مطالبے پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ یہ کوئی سرکاری پوسٹ کارڈ یا لفافہ نہیں ہے کہ کل چھوٹا تھا آج بڑا ہو گیا آپ پہلے گنگا جمنا کے پاٹ کو ذرا کم و بیش کر دیجئے۔ یا گیندے یا تلسی کے پودے کو پیپل کے درخت کے برابر اونچا کر دیجیے۔ یہ ناممکن ہو تو اتنا ہی کر دکھائیے کہ روپیہ کے سولہ آنہ کے بجائے بیس آنے ملنے لگیں اس کے بعد چھوٹی لین کے توسیع و ترقی کا مطالبہ کیجئے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کبھی ہماری چھوٹی لین کو بڑی لین بننا پڑے۔ تو پھر دیکھئے گا لوگ چھوٹی لین کا نام لے کر خون کے آنسو روئیں گے۔ آپ چھوٹی لین کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ جائیے پھر دیکھئے آپ کو اپنے مکانوں کا لطف آئے گا۔ مجھے تو اس بات کا دلی افسوس ہے کہ معترضین اس لین کے محاسن پر غور نہیں کرتے ہیں۔ قد و قامت کی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔

بوٹا سا قد تو شاعروں کو بھی پسند ہوتا ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ لوگ اس لین کا قد و قامت بڑھانے کے کیوں درپے ہیں یہ تو بیگماتی ریل یا فیمنی ریل ہے۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ یہ چھوٹی لین ہے۔

بعض لوگوں کا ایک اور اعتراض ہے کہ اس کی رفتار سست ہے مگر یہ اس کی وضعداری ہے کہ اب تک آہستہ خرام بلکہ مخرام کی قائل ہے اور اس کی رفتار بال بچوں بڈھوں بیماروں سب کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ آخر جلدی کیا ہے اس میں بیٹھ کر سفر کر کے آپ گرد رفتہ نظاروں کی مفت میں سیر کر سکتے ہیں۔ یہ رئیسوں کی سواری ہے اس طرح چلتی ہے کہ پیٹ کا پانی بھی ہلنے نہیں پاتا ہے۔ جناب یہ کوئی آندھی روگ نہیں ہے۔ چھوٹی لین ہے اور میں تو طوفان میل کی تیز رفتاری کا سخت مخالف ہوں۔ اس کے رفتاری کی بدولت آپ محض کیمرہ سے چلتی ہوئی ٹرین کا فوٹو بھی لے سکتے ہیں۔ اور اگر آپ کو واقعی تیز رفتار سواری کی ضرورت ہے تو ریل کا سفر ہی ترک کیجئے اور موٹر کے خطروں کا مقابلہ کیجئے ہوائی جہاز پر سیر و تفریح کا بندوبست کیجئے اور ہفتہ میں دو بار ولایت کیا بہشت بریں کی سیر کر آئیے۔ آخر یہ چھوٹی لین ہے۔ کوئی گھوڑدوڑ کی گھوڑی نہیں ہے اور یہ بھی تو سوچیے کہ اس بیچاری ریل کی روزانہ کتنا طول و طویل سفر کرنا پڑتا ہے تھوڑا فاصلہ ہو تو بلا سے اپنی رفتار تیز ہی کر دے۔ دوسری ریلوں میں دیکھئے کہ مسافروں پر ہر وقت رعشہ طاری رہتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کر سکتے ریل کا ہے کو ہے زلزلہ ہے آپ گھڑی کے پنڈولم کی طرح اِدھر اُدھر جھوم رہے ہیں۔ چھوٹی لین کو دیکھیے کہ مسافروں کو حرکت

کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اسی وجہ سے سالگذشتہ کے جلسہ ڈائرکٹران میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جب کبھی چھوٹی لین ٹھہرے تو ہر درجہ میں مسافروں کو اس کی اطلاع دینے کے لیے ایک بجلی کی گھنٹی بجا کرے تاکہ لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ گاڑی واقعی کھڑی ہے چلتی نہیں۔

بہر حال یہ بات تو چھوٹی لین ہی کو نصیب ہے کہ مسافر چاہیں تو چلتی ہوئی گاڑی پر آسانی سے چڑھ اتر سکتے ہیں اسی لیے اس کے پائیدان خاص طور پر نیچے بنائے گئے ہیں۔ اور پختہ سڑک کے کنارے کنارے تار وغیرہ کی حدبندی کے بغیر اس کی ریل دوڑائی گئی ہے۔ گویا لائن بھر میں اس کا پلیٹ فارم موجود ہے یہ رعایتیں اور ریلوں میں کہاں میسر ہیں؟

دنیا میں ناشکروں کی کمی نہیں ہے چنانچہ یہ شکایت بھی سننے میں آتی ہے کہ چھوٹی لین اکثر لیٹ ہو جاتی ہے مگر اس میں کسی کا کیا قصور ہے۔ یہ شکایت سخت بیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس معاملے میں اس نے ہندوستانی طرز عمل کو مدنظر رکھا ہے۔ وقت کی پابندی نہ رئیسوں سے ہو سکتی ہے اور نہ غریب دیہاتیوں سے ممکن ہے۔ پھر تھوڑی سی تاخیر تو شانِ امارت میں داخل ہے۔ بہر حال اس سے عوام کی آرام و آسائش ہی مقصود ہے اور جو لوگ وقت پر یا وقت کے پہلے آئیں وہ شوق سے مسافر خانے اور ویٹنگ روم میں آرام کریں کمپنی اس کے لیے ان سے کوئی کرایہ طلب نہیں کرتی۔ اگر آپ کو اسٹیشن آنے میں دیر ہو جائے تو آپ دو چار میل دوڑ کر بھی چھوٹی لین پر بیٹھ سکتے ہیں۔

چھوٹی لین میں حفظان صحت کا خیال رکھا ہے کون نہیں جانتا کہ چلتی ہوئی سواری میں پڑھنا آنکھوں کے لیے مضر ہے۔ اسی وجہ سے یہ اپنے گاڑیوں میں رات کے وقت بہت مدھم روشنی کرتی ہے تاکہ مسافر فضول کتب بینی سے اپنی آنکھیں خراب نہ کریں۔

کمپنی ایک اور معاملے میں بھی پبلک کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ اس کے گودام ایسے ہیں جہاں عرصہ تک آپ کا مال بلا کرایہ رکھا جاتا ہے یہ بات اور کسی ریل میں ممکن نہیں کہ آپ کچے پھل بھیجیں اور وہ مقام مقصود پر پختہ ہو کر پہونچیں۔ اس پر لطف یہ کہ اس کے ملازمین چکھ کر یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ پھل خراب تو نہیں ہو گئے ہیں۔

غرض اس غریب پرور لین کی کہاں تک تعریف کی جائے اس کی وضعداری دیکھئے اب تک ایک ہی رنگ پر قائم ہے۔ یہ نہیں کہ اور ریلوں کی طرح آج سرخ رنگ رنگ لیا۔ کل سبز رنگ چھوٹی لین کو اس تصنع سے سخت نفرت ہے۔ اس کو اپنی یک رنگی پر ناز ہے۔ اور لوگ کچھ کہیں یہ اسی رنگ پر قائم رہے گی۔

رسم الخط

مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔اے۔ایل۔ایل بی جوڈیشل سکریٹری صوبہ متحدہ

زمانہ ستمبر ۱۹۳۰ء

ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء کے زمانہ میں ہندوستانی زبان کے رسم الخط کے متعلق رائے طلب فرما کر ایک ایسے مسئلہ کی جانب قوم و ملک کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ جس پر مستقبل قریب میں ہندوستانیوں کو ایک ممکن العمل رائے قائم کرنا ضروری ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بدقسمتی سے یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل کے ہے جن کی بابت ہندوستانیوں میں شدید اختلاف ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اتحاد و اخوت کی وہ لہر جو واقعات حاضرہ کی باعث ہندوستانیوں کے دلوں میں موجزن ہے اس مسئلہ میں اس قسم کی حرارت نہ پیدا ہونے دے جیسی کہ گزشتہ مباحث کے مواقع پر رونما ہوئی تھی۔

ایک قوم کے لیے ایک زبان کا ہونا ضروری ہے۔ زبان درحقیقت گزشتہ تمدن اور طرز بود و باش کا نتیجہ ہے۔ قانونِ قدرت نے زبان و تمدن کو کچھ ایسے طریقے سے آمیز کیا ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اس سے کسی اہل نظر کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مشترکہ زبان مشترکہ تمدن و مشترکہ خیالات کی گود میں پرورش پاتی ہے اور پھولنے پھلنے پر مشترکہ تمدن کی بالیدگی کا ذریعہ بنتی ہے۔

جہاں تک کسی زبان کا تعلق ہے اس کا نشو و نما ماحول اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے یہ ایک خودرو شے ہے اور کوئی فرد یا قوم حتیٰ کہ گورنمنٹ تک کسی زبان کو کسی ملک میں حکماً رائج نہیں کر سکتی۔ گورنمنٹ اور حکومت کو بھی ایک خاص زبان رائج کرنے کے واسطے ایسے ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی جس میں وہ سرسبز ہو سکے۔ حالات گردو پیش میں یہ کیفیت پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ ہمارے اور چند دیگر صوبہ جات میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے جس کا نام اردو ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے رسم الخط دو ہیں یعنی عربی طرز اور ہندی طرز اول الذکر میں عربی اور آخر الذکر میں سنسکرت حروف ہی مستعمل ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حروف محض آواز کے زیر و بم کے نام ہیں جو انسان کے منھ سے نکلتی ہے

آواز کے مختلف اجزاء کو ضابطۂ تحریر میں لانے کی غرض سے مختلف ناموں سے منسوب کر دیا ہے جو حروف تہجی کہلاتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری دنیا کی مروجہ زبانیں دو اقسام پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

اول وہ جن میں حروف سے اور ان کے مفہوم سے مناسبت ہے یعنی اجزاء آواز کا نام وہی رکھا گیا ہے جو زبان سے نکلتی ہے۔ ان زبانوں کی بناء علم الاصوات پر قائم کی گئی ہے لاطینی حروف اور ایک حد تک ہندی حروف اس کی مثالیں ہیں۔

دوم وہ زبانیں جن میں حروف کے ناموں سے اور ان کی آواز سے کوئی مناسبت نہیں ہے مثلاً عربی، انگریزی۔ فارسی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ روسی وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کی تعلیم کی بہ نسبت آخر الذکر میں کسی قدر وقت و زحمت رونما ہوتی ہے اور اسی وجہ سے ماہرین فن تعلیم کے دل میں وقتاً فوقتاً یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ آخر الذکر قسم کی زبانوں کے طرز تحریر میں تبدیلی کر دی جائے۔ اور وہ بھی علم الاصوات پر مبنی کر دیئے جائیں۔

قبل اس کے کہ کسی زبان کے رسم الخط میں تغیر کیا جائے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا اس تبدیلی سے زبان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں یا نہیں، اگر رسم الخط کی تبدیلی سے زبان کی ضروریات نہ پوری ہو سکتی ہوں تو ایسی تبدیلی سخت مصیبت انگیز ہوگی۔ اور رسم الخط کی تبدیلی کے معنی زبان اور تمدن کی تبدیلی ہوگی۔ لہٰذا قبل اس کے کہ ہم اردو رسم الخط کی تبدیلی کا خیال کریں اس امر پر غور کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ آیا اس تبدیلی سے ہماری ضروریات پورے طور پر رفع ہو سکیں گی یا نہیں۔ محض دقت و آسانی کی بنا پر ہم طرز تحریر کی تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے

مسئلہ زیر غور کو بحث کی سہولت کی غرض سے ہم دو اجزاء پر تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ آیا اردو زبان کو لاطینی۔ رومن یا ہندی رسم الخط میں تبدیل کرنے سے ہماری ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔

۲۔ آیا اردو۔ طرز تحریر میں ایسے نقائص ہیں جن سے تعلیم میں بہت ہرج واقع ہوتا ہے اور یہ نقائص کسی اور تدبیر سے باستثنا ر تبدیلی رسم الخط رفع نہیں ہو سکتے؟

پہلے مسئلہ کے متعلق یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ لفظ اردو کے معنی لشکر کے ہیں، شاہان مغلیہ کے زمانہ میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے باشندے جن کی زبانیں مختلف ہوتی تھیں فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کو ایک ہی مقام پر رہنا پڑتا تھا باہمی ارتباط بغیر ایک عام زبان کے مشکل تھا۔ اس دقت کو رفع کرنے کی غرض سے قوانین قدرت کے تحت میں اردو زبان کا وجود رونما ہوا انہیں کے ذریعہ سے مختلف صوبوں اور قوموں کے افراد ایک

دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے۔ اس لشکری زبان نے ترقی کرنا شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ ایسی رائج ہوئی کہ ہندوستان خاص یعنی صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ پنجاب دکن میں علی الخصوص اور ہندوستان میں علی العموم ذریعہ گفت و شنید قرار پائی۔

ہمارے ملک میں اردو زبان کم و بیش ہر گوشہ میں سمجھی جا سکتی ہے۔ برخلاف اس کے دیگر زبانیں جو دوسرے صوبوں میں رائج ہیں۔ سارے ملک میں ذریعہ ارتباط و تبادلۂ خیالات نہیں ہو سکتیں۔ ایسی صورت میں وہ تمام ائیان قوم جو سارے ہندوستان کو قومیت کے ایک سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اس مشترکہ زبان کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیں

چونکہ اردو زبان کی نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ ہندوستانی تمدن نے عربی اور فارسی تہذیب سے ملکر ایک خاص صورت اختیار کر لی تھی اور فارسی عدالتی زبان بھی اسلئے اس نے عربی و فارسی طرز تحریر کا جامہ اختیار کیا۔ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو میں عموماً اور علمی اردو میں خصوصاً عربی اور فارسی کے الفاظ بہ نسبت دیگر زبانوں ــــــــــ کے زیادہ ہیں اور سارا علم ادب فارسی لٹریچر کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اب کچھ دنوں سے انگریزی، برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ بھی وسیع پیمانہ پر استعمال ہونے لگے ہیں۔ اردو کی ترتیب کچھ ایسے طریقہ پر ہوئی ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے آغوش میں لینے کی قدرتی قابلیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں کہ یہ جملہ الفاظ بھی اردو کے اجزا قرار پائیں۔ اس امر کی تصریح کی ضرورت نہیں کہ عربی اور فارسی الفاظ کا کسی دوسری زبان میں تحریر کرنا محض دشوار ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ ث۔ س۔ ص۔ ز۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ میں جو فرق ہے وہ دوسری زبانوں کے حروف سے ادا نہیں ہو سکتا۔ چند حروف ایسے ہیں جو دوسری زبانوں میں پائے نہیں جاتے مثلاً غ۔ ق۔ وغیرہ علاوہ بریں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ان کے مادہ اور املا سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ مادہ اور املا کا فرق رسم الخط کی تبدیلی سے مفقود ہو جائے گا۔ اور مفہوم تک پہونچنے میں دقت ہوگی، اس لیے ہندی حروف میں نقطے یا دو تین حروف کا ادغام یا اور دیگر حروف کا اضافہ کرنے سے اردو زبان کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔

شاید بعض ناظرین کو معلوم ہو کہ ایک مرتبہ نہایت شدید دقت بھوپال میں اس قسم کے تصرف سے پیدا ہوئی تھی کلکتہ سے کسی صاحب نے انگریزی میں تحریر فرمایا کہ KHAZI-NA TOLA GHAT. فوراً بھیج دو۔ کسی شخص کے سمجھ میں نہ آیا۔ بہت دقت کے بعد معلوم ہوا کہ خزینۃ اللغات مطلوب ہے،

لٹریچر درحقیقت ایک خاص قسم کے تمدن کی ترجمانی کرتا ہے، اور ہر زبان کے الفاظ و محاورات، خیالات و احساسات کی ایک دنیا اپنے ماحول میں وابستہ رکھتے ہیں۔ جو صدیوں

میں ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان الفاظ و محاورات کو دوسری زبان کا لباس پہنانا دراصل ان کو ماحول سے الگ کرنا۔ لٹریچر کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دینا اور علم انشا کو تباہ کر دینا ہے۔ شائستہ زندگی میں لٹریچر کے غائب ہو جانے کے بعد کیا باقی رہتا ہے؟ اس کو اہلِ نظر خود فیصلہ کریں گے۔

یہ امر محتاجِ دلائل و ثبوت نہیں کہ اردو زبان کی ضروریات رومن۔ ہندی۔ یا لاطینی طرز تحریر سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اخباروں کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے اپنے یہاں رسم الخط تبدیل کر کے لاطینی طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ اس تبدیلی کی تفصیل سے ہم نا واقف ہیں۔ ان جملہ امور کے جانے ہوئے بغیر ہمارے لیے ان کے اس فیصلہ کے متعلق کسی قسم کی رائے قائم کرنا غلطی ہے علاوہ ہمیں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ترک ایک خود مختار قوم ہے ان کے اوپر کوئی غیر قوم حکمراں نہیں۔ ان کا رہنما ایک ایسا شخص ہے جو اس وقت ساری دنیا میں معزز و ممتاز، اور اپنے ملک میں اس درجہ ہر دلعزیز ہے کہ جس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ اس کے احسانات سے قوم اتنی گراں بار ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ بنائے مخاصمت نہیں بن سکتا۔ ترکوں نے ہر خیال یعنی مذہب و ملت تک کو حب الوطنی اور استحکام قومیت کے خیال پر قربان کر دیا ہے برخلاف اسکے ہمارے یہاں کا کیا حال ہے؟ ہنود و دیگر اہل مذاہب میں جو ہر لمحہ رسوم و رواج کی بنا پر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں سیاسی امور میں جتنے کارکن ہیں سب کے سب لیڈر ہیں اور لیڈر بھی مختلف مذاہب کے جن کے دلوں میں حب الوطنی کے خیال نے ابھی تک اتنا گھر نہیں کیا کہ وہ اہم مذہب کے مقابلہ میں ملک کے سیاسی مفاد کو مدنظر رکھ سکیں ایسی فضا میں قائد اعظم مصطفےٰ کمال پاشا کے احکامات کا اتباع ہم پر کسی طرح لازم نہیں ہو سکتا قبل اس کے کہ ترکی کے طرز عمل کی پیروی کریں وہاں کا سا ماحول پیدا کر لینا ضروری ہے۔ تاکہ تبدیلی مزید اعتراضات کا باعث نہ ہو۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک جو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ یعنی انگلستان امریکہ، فرانس۔ جرمن۔ روس۔ وغیرہ وغیرہ نے اب تک موروثی رسم الخط کو تبدیل کرنے کا خیال نہیں کیا ان سب ممالک میں حروف تہجی علم الاصوات پر مبنی نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم میں اس کے باعث جو دقتیں رونما ہوتی تھیں اس کا انھیں پورا احساس تھا۔ چنانچہ بجائے رسم الخط کی تبدیلی اور صدیوں کے اندوختہ لٹریچر کو برباد کرنے کے انھوں نے دقتوں کے خیال کو پیش نظر رکھ کر ایسے طریقے ایجاد کیے ہیں کہ جن کی امداد سے جملہ مشکلیں رفع ہو گئیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دیگر تدابیر سے ہماری زبان کی تعلیمی دقتیں رفع ہو سکتیں ہیں یا نہیں۔

۳۔ اردو طرز تعلیم اب تک پرانے اور بوسیدہ طریقہ پر رائج ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک کوئی علمی اور سائنٹیفک کوشش سہولت پیدا کرنے کی نہیں کی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ حروف تہجی کی تعلیم دو طریقوں پر ہو سکتی ہے یعنی ترکیبی SYNTHETICAL اور دوسرا تحلیلی ANALYTICAL ترکیبی طریقہ تعلیم

وہ یہی طریقہ ہے جو ابتدائے تاریخ تعلیم سے اب تک جاری رہا۔

اس طریقہ میں تعلیم کا آغاز حروف تہجی کے سکھلانے سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بچہ یا طالب علم کو حروف یاد کرائے جاتے ہیں حروف کی صورت اور ان کے مفہوم کے یاد ہو جانے کے بعد دو یا زیادہ حروف ملائے جاتے ہیں اور انکی آواز ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد الفاظ تک نوبت آتی ہے۔ الفاظ کے بعد جملے اور اسکے بعد عبارت کا پڑھنا سکھلایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طریقہ فلسفی سائینٹفک اور فطرتی اصول کے خلاف ہے۔ انسان کا سارا علم تجربات پر مبنی ہے۔ جو واقعہ اس کے احساسات کے روبرو آتا ہے اس کا نقش صفحہ شعور پر ثبت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو نیا واقعہ پیش آتا ہے انسانی فطرت گذشتہ تجربات سے چند مقررہ اصول کے تحت میں اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور بعدۂ صفحہ شعور پر اس کا بھی اندراج ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر ایک تجربہ جو صفحہ شعور پر موجود ہے دیگر آئندہ تجربات کے حل کرنے اور اس کے اندراج میں مدد کرتا ہے اور اس طریقہ پر انسانی علم کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر نامعلوم شے یا واقعہ کا علم معلوم شدہ واقعات و اشیا کی بنا پر انسانی صفحہ شعور پر قائم ہو جاتا ہے اور ایک نئی اور نامعلوم شے یا واقعہ معلوم شدہ واقعات و اشیا سے حل ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا طریقہ تعلیم اس کے برعکس ہے۔ یعنی نامعلوم شے کے ذریعے جانی ہوئی شے سکھائی جاتی ہے۔ بچہ کو جس وقت حروف تہجی سکھائے جاتے ہیں وہ ان سے بالکل غیر مانوس اور ان کے مفہوم سے ناواقف ہوتا ہے چنانچہ الف۔ الف۔ اے۔ کے معنی بے۔ بیٹا۔ بی کے معنی ب۔ اسکے سمجھ میں نہیں آتے اور طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ گذشتہ تجربات اور موجودہ علم سے اس کو مدد نہیں ملتی جس کی وجہ سے دلچسپی کا جزو جو توجہ مبذول کرانے کا واحد ذریعہ ہے مفقود ہوتا ہے۔ بچہ محض مشین کی طرح حروف رٹ کر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی باعث اس کی قوت تحقیقات پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کے توضیح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ توجہ کے ذریعے سے تو اسے دماغی نشوونما ہوتا ہے۔ کوئی طریقہ تعلیم جس میں توجہ کے ماؤف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ انسان کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ زندہ اقوام یورپ اور امریکہ نے ان دقتوں کو محسوس کر کے مختلف طریقے جاری کئے جو اس مشکل کو رفع کرتے ہیں۔

مختلف تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر حروف تہجی سے شروع کرنے کے بجائے الفاظ یا جملوں سے جن سے طالب علم واقف ہوتا ہے تعلیم کی ابتدا کی جائے تو اس قسم کی کوئی دقت جس کا تذکرہ کیا گیا ہے باقی نہیں رہتی۔ جملوں سے تعلیم کو شروع کرنا اور پھر ان کو تشریح کر کے الفاظ اور حروف تک پہونچنا ہمارے ملک کی تعلیمی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت مشکل ہے۔

یہاں ماہرینِ فن کے امکان میں ہے جنھوں نے عمر کا معتدبہ حصہ علمِ تعلیم کے حاصل کرنے اور بچوں کے دماغی حالات کی تحقیقات میں صرف کیا ہے۔ ایسے آدمی ہمارے ملک میں معدوم ہیں۔ علاوہ برین ٹوٹے ہوئے حروف کے سکھانے اور ان کی تشریح میں بھی دِقت ہوگی۔

راقم الحروف ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ عرض کر سکتا ہے کہ اگر تعلیم کی ابتدا الفاظ سے کی جائے تو یہ دِقت رفع ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے دو چھوٹے بچوں اور ایک ملازم کی تعلیم اسی طرح شروع کی اور تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ جن دقتوں کی بنا پر رسم الخط کی تبدیلی کا خیال کیا جاتا ہے وہ بغیر تبدیلی کے آسانی سے رفع ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ طریقۂ تعلیم میں تبدیلی کر دی جائے۔ میرے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ساڑھے چار سال کا بچہ اردو با آسانی لکھ پڑھ سکتا ہے اور ایک نو عمر ہندوستانی کو اردو سکھلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ دو تین ہفتہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

چونکہ اس طریقۂ تعلیم کی تشریح ہمارے موضوع سے باہر ہے، لہٰذا نظر انداز کی جاتی ہے۔

❖ ❖ ❖

مثنوی کا پرانا اور نیا انداز زمانہ جولائی ۱۹۳۹ء کا ایک پیراگراف۔

مثنوی کے لیے واقعہ نگاری بھی ایک بڑا وصف ہے جس کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے جس طرح ایک ماہرِ فن کرتا ہے یعنی اس کی تمام اصلی خصوصیتیں بیان کی جائیں۔ اکثر شعرا جب دو پہلوانوں کی لڑائی باندھتے ہیں تو زمین اور آسمان کو ہلا دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بیان کرتے کہ دونوں کس طرح بڑھے، کیونکر وار کیا اور کیا کیا داؤں پیچ کیے۔ تلوار کے کیا کیا ہاتھ نکالے، نیزے کے بند کیونکر باندھے، کمان کیونکر چڑھائی، تیر کس طرح جوڑا، ڈھال کیونکر سر پر لی وغیرہ وغیرہ۔ شاعر جب کسی بات کو واقعہ کی حیثیت سے لکھے تو اگرچہ وہ فرضی ہو لیکن اس کا فرض ہے کہ بیان میں کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے۔ یہ نقص مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے حقیقتاً ناممکن ہوتا ہے مثلاً یہ واقعہ کہ جب رستم چلتا تھا تو گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتا تھا۔ کسی خاص موقع پر ایسا ہونا ناممکن نہ ہو لیکن قوت کی زیادتی اور ندرت کی وجہ سے ناممکن معلوم ہوتا ہے یا مثلاً یہ واقعہ کہ کیکاؤس نے عقابوں کے ذریعہ آسمان پر چڑھنا چاہا۔ کیکاؤس کے جو حالات اور واقعات مذکور ہیں ان سے وہ اس قدر احمق ثابت نہیں ہوتا کہ ایسی بیہودہ کوشش کا ارادہ کرتا۔ غرض واقعہ نگار کا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ واقعے کو اس صورت میں ظاہر کرے کہ دل میں اتر جائے۔

احسن مارہروی

شاعری اور خود ستائی

حامد اللہ افسر ایم اے

زمانہ نومبر ۱۹۳۰

شاعری میں خود ستائی کا رواج اس قدر عام ہے کہ اخلاقیات کے احاطہ میں کبھی اسکو معائب کی فہرست میں داخل نہیں سمجھا جاتا اور فنِ شعر کے دربار میں تو اس کا شمار محاسن میں ہونے لگا ہے۔ شعرا کی خود ستائی اصل میں شعر کی قدر اور شعرا کی عزت و حرمت سے شروع ہوئی، اچھے شعر پر خاص و عام کا متاثر ہونا اور صاحبِ شعر کی تعریف و توصیف کرنا رفتہ رفتہ اس حد کو پہنچ گیا کہ شاعر محض اس لیے کہ وہ شاعر ہیں خود کو تعریف و توصیف کا مستحق سمجھنے لگے اور جب ان کے نزدیک ان کے اشعار کی کماحقہ داد نہ ملی تو انھوں نے یہ فرض بطور خود انجام دینا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ دوسرے معاصر شعرا سے مقابلہ کشی شعرا کی "تعلّی" کا بڑا سبب ہوا۔ یہ امر شبہہ سے خالی نہیں کہ حریف کا مقابلہ فنونِ لطیفہ میں یا حقیقی تخلیقی ادب کی پیدا وار میں کچھ مفید ثابت ہوا ہے۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اشعار میں تعلّی کا اظہار ایک بڑی حد تک حریفانہ تقابل کا ممنونِ منت ہے۔

مبالغہ ایشیائی شاعری کا زیور ہے تعلّی کے خد و خال کو بھی دل کھول کر اس زیور سے سجایا گیا اور پھر ایسا ایسا سجایا گیا کہ دیکھنے والے مبہوت رہ گئے۔

عرفی کہتا ہے:

منم آں سحر بیان کز مددِ طبع سلیم نبرد ناطقہ نامِ سخنم بے تعظیم
منم آں بحر لباب ز معانی کہ بود قطرۂ آب ز شرمِ سخنم دُرِّ یتیم
گر بہ بادِ سخنم عود بر آتش مانند حشر اصوات شود ہر طرف از نشرِ شمیم
موجِ فوج است معانی بدلم در پرواز ہمچو مرغانِ اولی اجنحہ در باغِ نعیم
غنچہ از نسبتِ سحباں بہ سخن عار کند گر کنم طرزِ سخن بادِ صبا را تعلیم

فیضی اپنی مشہور مثنوی "نل دمن" میں کہتا ہے:

باز آمدم از رہِ شب تار [illegible] خفتہ کرد بیدار
گر بد [illegible] طعن معنی ز [illegible] لعن
کالم [illegible] نامی طغرا کشِ [illegible] الکلامی

فخر الحکما خط جبینم ختم الشعراء گل نگینم
بکشود کلید آسمانی در فکرت من در معانی
طرز دگراں وداع کردم طرز دگر اختراع کردم
زگنبد چرخ برصدا ایم ششش مجلس کون بر نوایم
ایں نغمہ فسون ہر زباں نیست ایں زمزمہ سحر ہر بیاں نیست
زیں نکتہ کہ دلپذیر دارم صد بتکدہ در ضمیر دارم

ناصر علی سرہندی اپنی مثنوی میں اس قدر آگے نکل گئے کہ شاید مولویوں کا طبقہ تو انھیں کبھی معاف نہ کرے گا۔

سخن راآفریدم جان و میدم بہ اقرار خدائی بر گزیدم
الست سرزد از من او بلیٰ گفت منم یا عبدا و یاربنا گفت

تخیل کی اس بے لگام روش کا ایک سبب خود اپنی شاعری پر ضرورت سے زیادہ ایمان اور اعتقاد بھی ہے، تخیل اور جذبہ جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے اس قدر غیر محدود اور غیر معین ہے کہ اس کے کسی جزو کا غیر مکمل طور پر بھی الفاظ میں ادا ہو جانا ایک ایسی کامیابی ہے جس پر فخر کرنا ایک حد تک خلاف فطرت نہیں ہے، انسان اگر کوئی ایسی مہم سر کرلے جس پر قابو طلب ہونا اس کے نزدیک اس کے دوسرے ہم جنسوں کے لیے مشکل ہو تو اس کا فخر کرنا حق بجانب ہے بشرطیکہ اس کا اثر اسکے عام اخلاق پر نہ پڑے، لیکن اس امر کا فیصلہ کہ شاعر حقیقت میں کسی اچھوتے خیال کو مؤثر طریقہ پر الفاظ میں ادا کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں خود شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جس خیال کو وہ اچھوتا اور نادر سمجھ رہا ہو وہ پامال ہو اور جس طرز ادا کو وہ ایک خاص وقت میں کسی خاص کیفیت کے زیر اثر بہت مؤثر سمجھتا ہو وہ دوسروں کے لیے اپنے اندر کوئی کشش یا کوئی جذب اور کوئی اثر نہ رکھتا ہو، یا ممکن ہے کہ خیال بھی نادر ہو اور نظم بھی اچھی طرح ہوا ہو لیکن پھر بھی شعر عام احساسات سے متعلق نہ ہو اور سوائے شاعر کے بہت ہی کم لوگ اس سے کیف اندوز ہوتے ہوں، اس حالت میں اگر شاعر کو اپنے اس شعر پر فخر ہے تو اس فخر کا وہ مستحق نہیں ہے اور کیونکہ زیادہ یہی صورت نمایاں ہوتی ہے اس لیے اس کا اثر اخلاقی حیثیت سے اچھا نہیں پڑتا۔

اردو زبان کے شعرا میں اپنے کلام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمی کا امکان اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمارے یہاں تنقید بہ حیثیت فن کے قریب قریب معدوم رہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خود شعرا اپنے کلام کے معائب و محاسن سے آگاہ ہو سکے اور نہ پبلک ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکی اور جب بے لاگ اور صحیح تنقید کا عام طور پر چرچا ہی نہیں ہے تو شعر کی خوبی کا

انحصار تمام تر مشاعرے کی واہ واہ پر رہ گیا جو عموماً "تحسین ناشناس" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس حالت میں اگر شاعر کے کسی ایسے شعر پر جو اس کے لیے مایۂ ناز تھا لیکن حقیقت میں اس قابل نہ تھا داد نہیں ملی ہے تو وہ اسے سامعین کی عدم توجہی یا عدم استطاعت سے تعبیر کر سکتا ہے۔ بس اس شعر پر اس کا افتخار گو حقیقت میں بلا استحقاق ہے لیکن خلاف عقل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی غلط فہمی ہنوز باقی ہے۔

ہماری زبان کے شعرا میں تعلّی اور خودستائی کے رواج کا ایک ذریعہ ہمارے مشاعرے بھی ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ مشاعروں کی داد سے اچھے خاصے صائب الرائے اصحاب غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شعر کے محاسن کا صحیح اندازہ عموماً مشاعروں میں نہیں ہوتا، اگر شعر واقعی موثر ہو تو مشاعرے کی داد سے شاعر کے احساس افتخار میں جو اضافہ ہوگا وہ گو بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سہی لیکن حق بجانب ہوگا۔ لیکن اگر شعر اس قابل نہیں ہے (اور عموماً نہیں ہوتا) تو اس شعر پر شاعر کا فخر، جو ممکن ہے محض مشاعرے کی داد سے ظہور میں آیا جو غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کا اثر اس کے اخلاق پر ہرگز اچھا نہ پڑے گا۔

مشاعرے کی دلچسپی اور رونق کا دارومدار جس قدر اشعار پر ہے اسی قدر "داد" پر بھی ہے اگر مشاعرہ میں اشعار پر داد نہ دی جائے تو وہ مشاعرہ نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے۔ شعر کا اثر قبول کرنے کے بعد بے اختیار زبان سے کلمات تعریف و تحسین نکل جاتے ہیں یہی داد ہے لیکن ہمارے بعض شعرا کی خود پرستی سامعین کے اس آزادانہ اظہار تحسین کو بھی جبر کے حدود میں کھینچ لائی، شاعر کا بار بار اس طرح داد کا مطالبہ کرنا جیسے کوئی قرضخواہ قرضدار سے اپنا روپیہ طلب کرتا ہے اس درجہ عام ہو گیا ہے کہ باوجود عجیب ہونے کے ہمارے کانوں کو برا نہیں معلوم ہوتا، میں نے تو ایک مشاعرے میں ایک معمر شاعر صاحب کو دوسرے شاعر سے یہاں تک کہتے سنا ہے کہ "بھائی داد لو اور داد دو" "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کی اس سے زیادہ اور کیا عملی تفسیر ہو سکتی ہے، ایک صاحب جو افسوس کہ اب بقید حیات نہیں ہیں سامعین کو قسمیں دلا دلا کر "داد" وصول کیا کرتے تھے، ہماری زبان کے شعرا میں بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی کثرت ہے جن کی علمی قابلیت نہ ہونے کے برابر ہے، ایسے لوگوں پر مشاعرے کی داد کا اور بھی زیادہ برا اثر پڑتا ہے اور انھیں اپنی قابلیت کے متعلق خطرناک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی خودستائی جو ہمیشہ مغالطہ کا نتیجہ ہوتی ہے ان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔

خودستائی اخلاقی حیثیت سے ہمیشہ مذموم ہے اور اس کا شمار بری خصلتوں میں ہوتا ہے شعرا میں مبالغے کے ساتھ شامل ہو کر اس کا برا اثر اور زیادہ ہو جاتا ہے لیکن جو شعرا علم کی دولت سے

سرمایہ دار ہیں اور جنھیں خدا نے کشادہ طبعی اور فراخ حوصلگی کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ اسے جائز حدود سے نہیں بڑھنے دیتے، لیکن جو ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں ان کے اخلاق و عادات پر اور ان کی روزانہ زندگی پر اس کا نہایت مذموم اثر پڑتا ہے، وہ بدخلق ہو جاتے ہیں، مہذب لوگوں کی صحبت کے قابل نہیں رہتے، مغرور ہو جاتے ہیں، تمکنت اور خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے، ہر شخص سے اپنی تعریف کے متمنی رہتے ہیں اور زندگی کے معمولی معاملات اور واقعات میں تصنع سے خود کو نہیں بچا سکتے۔ شعر کا اصلی مقصد روح کی جلا ہے، جذبات میں لطافت اور حسن پیدا کرنا ہے، دل و دماغ کی کیفیات سے لبریز کر دینا ہے۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ خلق کی بلندی، اطوار و خصائل کی خوبی اور ہمدردی ہے، گویا حقیقی شعر شاعر کو انسانیت کا اعلیٰ نمونہ بنا دینے کا ایک ذریعہ ہونا چاہیئے نہ یہ کہ اس کے اندر بہیمیت پیدا کر دے اور اسے اس قابل نہ رکھے کہ لفظ "انسان" کا اس پر اطلاق ہو سکے۔

* * *

لکھنؤ اسکول کی شاعری مطبوعہ زمانہ اگست ۱۹۴۱ء کا ایک پیراگراف۔

اصلاحِ معاشرت اور شاعری:۔ جب سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شاعری کا کام صرف دل کو بہلانا نہیں بلکہ نوع انسانی کے لیے فائدہ پہونچانا بھی ہے۔ اس وقت سے کئی شاعروں نے معاشرتی اصلاح پر دھیان دینا بھی شروع کیا ہے۔ معاشرت کی اصلاح اسی حد تک کی جا سکتی ہے جو سوسائٹی کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو۔ اگر معاشرت میں اصلاح کی جگہ انقلاب پیش نظر ہو تو شاعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سماج کے مروج فلسفہ کی پابندی کرے۔ وہ آزاد ہے کہ جس فلسفہ کی چاہے تلقین کرے۔ ہندوستانی شعرا میں عام طور سے یہ ہمت مفقود رہی ہے۔ ادھر سات آٹھ برس سے البتہ زمانہ کی بدلی ہوئی ہوا نے انھیں کچھ جری بنا دیا ہے مگر اب بھی ان میں پوری طور پر جرأت نہیں آئی ہے۔ دو ایک مستثنیات ضرور رہیں مگر اس سے کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکتا۔

معاشرتی اصلاح کا بیڑا سب سے پہلے حالی اور آزاد نے شعر کے ذریعہ اٹھایا تھا۔ ان کا میدان عمل بہت تنگ تھا۔ رفتہ رفتہ شاعرین اس دائرہ کو وسیع کرتے گئے اور چکبست کے زمانے تک گویا رُت ہی بدل چکی تھی۔

سید علی جواد زیدی

شیخ و برہمن

ڈاکٹر اعظم کریوی سابق مدیر الکسبہ الہ آباد

(زمانہ، اگست سنہ ۱۹[illegible]ء)

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کی دوستی صرف ان کے گاؤں کٹھنا ہی میں نہیں بلکہ دور دور تک مشہور تھی۔ شیخ جی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تو پنڈت جی کے دل پر چوٹ لگتی اور اگر پنڈت جی کو کوئی تکلیف ہوتی تو شیخ جی بے چین ہو جاتے۔ جب تک دونوں آپس میں مشورہ نہ کر لیتے کسی کام میں ہاتھ نہ لگاتے۔ پنڈت جی کے یہاں جب ستیہ نرائن کی کتھا ہوتی تو شیخ منیر ہی کے ہاتھ سارا انتظام رہتا اور شیخ منیر کے یہاں میلاد شریف کی مجلس ہوتی تو پنڈت جی انتظام کرتے۔ گھر بھی دونوں کا ملا ہوا تھا۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا اسی کے نیچے چبوترہ پر دونوں کی نشست رہا کرتی۔ رات کو گاؤں کے دو چار کسان وہاں آ جاتے اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ صبح کے وقت گاؤں کے اکھاڑے میں پہونچ جاتے۔ دونوں اکھاڑے کے خلیفہ تھے۔ جوانی میں بڑی بڑی کشتیاں ماری تھیں لیکن اب ضعیفی کا عالم تھا، شاگردوں کو کشتیاں لڑاتے اور داؤں پیچ بتاتے تھے۔ کبھی دل میں آ جاتا تو زور بھی کرا دیتے۔ جب کہیں دنگل ہوتا تو شاگردوں کے ساتھ ضرور جاتے۔ ان کے دم قدم کی برکت سے کٹھنا کے پہلوان جس دنگل میں گئے فتح مند واپس آئے۔ شیخ جی اور پنڈت جی کا شمار گاؤں کے بڑے کاشتکاروں میں تھا۔ دونوں کے پاس اتنی موروثی کاشتکاری تھی کہ بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ مختلف مذاہب کے پیرو ہوتے ہوئے بھی ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ دونوں پریم کے پجاری تھے۔ محبت نے ان کے دلوں سے شیخ و برہمن کی تفریق دور کر دی تھی۔ ظاہر میں وہ دو تھے لیکن باطن میں ایک تھے۔ اسے اتفاق سمجھئے یا خدا کی قدرت کہ دونوں کی صرف ایک ایک ہی اولاد ہوئی۔ شیخ جمن اور رجا شنکر بھی اپنے والدین کی طرح آپس میں لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی اٹھتے، بیٹھتے، کھیلتے کودتے۔ شیخ جمن کی شادی میں پنڈت دیا شنکر اور رجا شنکر کے بیاہ میں شیخ منیر گواہ بنے تھے۔ غرض جب تک پنڈت جی اور شیخ جی زندہ رہے ایک جان اور دو قالب بنے رہے اور مرے بھی تو اتفاق سے ایک ہی ماہ میں۔ پہلے پنڈت جی سرگباش ہوئے ان کے پیچھے شیخ جی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

(۲)

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کے مرنے کے بعد ایک سال تک دونوں گھروں کے تعلقات بدستور رہے۔ لیکن جب پنڈت دیا شنکر کی برسی ہوئی اور رجا شنکر نے خلاف معمول شیخ جمن سے کوئی مشورہ

نہ لیا تو اس کو بہت ناگوار گذرا۔ برسی میں جو ست نرائن کی کتھا ہوئی اس میں بھی جٹا شنکر نے شہر سے کسی نئے پرچارک کو بلایا۔ پرچارک جی بزعم خود جوشیلے اور قوم پرست واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے کتھا کے بعد بات چیت میں سنگھٹن پر خاص طور پر زور دیا اور دانستہ یا نادانستہ کچھ مسلمانوں کے خلاف بھی کہہ ڈالا شیخ جمن کتھا میں موجود تھے۔ ان کے لیے یہ نئی بات تھی۔ بچپن ہی سے ان کے تعلقات ہندؤں سے خصوصاً جٹا شنکر سے برادرانہ تھے۔ اگر سنگھٹن کے علاوہ پرچارک جی مسلمانوں کے خلاف کچھ نہ کہتے تو کوئی اعتراض کا موقع نہ تھا۔ جمن پڑھا نہ لکھا اجڈ گنوار تھا، اس نے سمجھا کہ یہ سب جٹا شنکر ہی کے اشارہ سے ہوا ہے ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب ست نرائن کی کتھا ختم ہو جاتی تو جمن بھی پرشاد لے کر اپنے گھر جایا کرتا تھے۔ لیکن اس مرتبہ کتھا ختم ہوتے ہی پرشاد لیے بغیر شیخ جمن منہ لٹکائے گھر واپس ہوئے۔ ان کو واپس جاتے دیکھ کر جٹا شنکر کی ماں نے کہا "بیٹا! ایسی جلدی کیا ہے ابھی بیٹھو پرشاد لے کر جانا۔

"موسی! مجھے آج گھر پر بہت ضروری کام ہے۔ پرشاد میں لے چکا۔" یہ کہتے ہوئے شیخ جمن نکل گئے اگر جٹا شنکر ان کو روکتے تو ممکن تھا کہ شیخ جمن ٹھہر جاتے، لیکن اس کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ جٹا شنکر کسی کام میں مشغول تھے اور انھوں نے شیخ جمن کو جاتے نہیں دیکھا۔

اساڑھ کا مہینہ تھا دونگرہ (پہلی بارش) پڑ چکا تھا۔ جتائی شروع ہو چکی تھی، شام کا وقت تھا کہ شیخ جمن اپنے کندھے پر ہل رکھے ہوئے بیلوں کو ہانکتے اپنے کھیت سے گھر واپس آ رہے تھے۔ راہ میں ان کی ملاقات اپنے ایک دوست گھسیٹے خاں سے ہوئی۔ گھسیٹے خاں نے کہا "کہو شیخ جی کل تو تم نے ہندوؤں سے مسلمانوں کو خوب گالیاں دلوائیں"

میں اور مسلمانوں کو گالیاں دلواؤں گا۔ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ ہاں کل جٹا شنکر کے یہاں کتھا تھی میں وہاں گیا ضرور تھا۔ وہاں جو کچھ بات چیت ہوئی اس میں میری کیا خطا تھی"

"تمام گاؤں کے مسلمان اس کا الزام تم ہی پر رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے سامنے مسلمانوں کو گالیاں دی گئیں اور تم چپ چاپ سنتے رہے۔ خدا کی قسم میں اگر وہاں موجود ہوتا تو خون کی ندی بہا دیتا۔ لیکن میں ایسی جگہ جانے ہی کیوں لگا۔ ہندوؤں کی کتھا اور ان کی دوستی تمہیں کو مبارک ہو۔ ابھی کیا ہوا ہے اگر جٹا شنکر تمہارا دیوالہ نہ نکال دے تو بات ہی نہیں۔

شیخ جمن خود تو جٹا شنکر سے ناراض تھے، لیکن اس وقت تک ان میں اتنی عقل رکھتے تھے کہ کسی غیر کی زبان سے جٹا شنکر کی برائی سن نہیں سکتے تھے۔ جل کر بولے، میں خود جٹا شنکر سے سمجھ لوں گا کسی غیر کو میرے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں"

گھسیٹے خاں نے دیکھا کہ شکار قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔ کہنے لگے "ہاں بھئی جٹا شنکر تمہارا سب کچھ

ہے۔ میں تو غیر ٹھہرا میں نے بھر پایا اب تم سے کبھی کچھ نہ کہوں گا۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے گاؤں کے قریب پہونچ چکے تھے۔ راہ میں ملا کمال مل گئے۔ ملاجی نے پوچھا "کہو یارو! کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

گھسیٹے خاں کو سہارا مل گیا کہنے لگے "کل جٹا شنکر کے یہاں مسلمانوں کو خوب گالیاں دی گئیں۔ شیخ جی وہاں موجود تھے، لیکن چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اسی پر میں نے جو ان سے کہا تو الٹے مجھ ہی سے خفا ہونے لگے۔"

ملاجی بولے "اس میں بگڑنے کی کون سی بات تھی۔ جمن کو خدا جانے جٹا شنکر نے کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ یہ اسی کی غلامی میں لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ جٹا شنکر سے کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ کیوں گھسیٹے میں سچ کہتا ہوں نا؟"

شیخ جمن کے جواب سے گھسیٹے خاں کچھ مایوس ہو چکے تھے مگر ملاجی کے ساتھ دینے سے ان کا دل بڑھ گیا۔ بولے "اجی ان کے سامنے جٹا شنکر کوئی چیز نہیں، یہ ہر بات میں اس سے بڑھ کر ہیں مگر ان کو سمجھائے کون۔ جب گاؤں کا کوئی مسلمان کتھا میں شریک نہیں تھا تو ان کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ جو مسلمان ہندوؤں کی کتھا سنتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کیوں ملاجی یہ سچ ہے نا؟"

ملاجی کی دوڑ گاؤں کی مسجد ہی تک تھی، اردو کی پہلی کتاب کبھی ختم نہیں کی تھی کہ ملاجی بن گئے کلام پاک کی دو چار آیتیں طوطے کی طرح رٹ رکھی تھیں جس سے وہ خود کو زبردست عالم سمجھنے لگے تھے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ گھسیٹے خاں نے ان سے فتویٰ مانگا تو دل میں خوش ہو کر فرمانے لگے "ہاں حدیث کی بڑی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو کافروں سے میل جول رکھتا ہے وہ بھی کافر ہو جاتا ہے۔"

شیخ جمن کا کلیجہ کانپ اٹھا، آہ مجھے یہ پہلے سے کیوں نہ معلوم تھا، میں نے دھوکا کھایا۔ اس نے بڑی حسرت سے ملاجی سے پوچھا "کیوں ملاجی جو مسلمان پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں وہ بھی ہندوؤں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے کافر ہو جائیں گے؟"

ملاجی نے منھ بنا کر کہا "شرعی معاملات میں دلیل و حجت کی ضرورت نہیں جو کچھ حدیث میں لکھا ہے میں نے بتا دیا آگے تم جانو تمہارا کام۔"

اب سب شیخ جمن کے دروازہ پر پہنچ چکے تھے۔ شیخ جمن نے ہل کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا گھسیٹے خاں اور ملاجی کے لیے چارپائی بچھا دی۔ گھسیٹے خاں نے شیخ جمن سے ہمدردی کرتے ہوئے ملاجی سے پوچھا "بیچارے شیخ جی کو کیا معلوم تھا کہ کتھا سننے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب کوئی ایسی ترکیب بتائیے جس سے یہ پھر پکے مسلمان ہو جائیں۔"

ملاجی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا " ہاں توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، کیوں جمن تم اپنے باپ کی برسی کب کروگے ؟"

" آج ، کے آٹھویں دن برسی ہوگی "

" برسی میں میلاد شریف کی محفل بڑی شان سے کرو اور وعظ کے لیے شہر سے کوئی مولوی بلاؤ کہنے کو تو میں بھی وعظ کہہ سکتا ہوں لیکن، بھائی گاؤں کا معاملہ ہے میں دخل نہیں دینا چاہتا شہر سے جو مولوی صاحب بلائے جائیں وہ بھی اپنے وعظ میں ہندوؤں کی خوب خبر لیں۔ اس طرح سے تم جٹا شنکر سے بدلہ لے لوگے ۔ پندرہ بیس روپے کا خرچ ہے لیکن تمہارے لیے یہ معمولی بات ہے "

شیخ جمن نے کہا " خیر روپے کی کوئی فکر نہیں ، لیکن میں تو شہر کے کسی مولوی صاحب کو نہیں جانتا "

ملاجی بولے " اس سے تم بے فکر رہو میں سب انتظام کر لوں گا ۔

شیخ جمن جال میں پھنس گئے ۔ ملاجی نے انھیں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا ۔ چنانچہ جب شیخ جمن کے یہاں محفل میلاد شریف منعقد ہوئی تو شہر سے ملاجی کسی بڑے مولانا کو بلا لائے ۔ انھوں نے اپنے وعظ میں فتویٰ دیدیا کہ ہندوؤں سے ملنا جلنا یا ان سے کسی قسم کا تعلق رکھنا کفر ہے ۔ وعظ کہہ کر بڑے مولانا تو واپس تشریف لے گئے ، مگر جو آگ پنڈت جی کے پرچار سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی وہ اب مولانا کے وعظ سے یکبارگی بھڑک اٹھی اور گاؤں کا امن خطرہ میں پڑ گیا ۔

—:※(۳)※:—

صبح کا وقت تھا پنڈت جٹا شنکر چبوترہ پر بیٹھے لالہ بہاری لال پٹواری اور چھوٹے لال بنیئے سے باتیں کر رہے تھے ۔ تھوڑی دور پر شنکر واچار زمین پر بیٹھا مونج کی رسی بٹ رہا تھا ۔ شیخ جمن اپنے گھر سے نکلے ان کو دیکھ کر جٹا شنکر نے کہا " کہو شیخ جی ! ہندوؤں کو گالیاں دلا کر اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا "

شیخ جمن نے تیوری چڑھا کر جواب دیا " جو جیسا کہے گا ویسا سنے گا ۔ وہ دن بھول گئے جب تم نے مسلمانوں کو گالیاں دلائی تھیں ۔ سچ ہے میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو "

" لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا "

" دیکھا جائے گا " کہتے ہوئے شیخ جمن آگے بڑھ گئے ، چبوترے پر بیٹھے نہیں ۔

چھوٹے لال بنیئے نے کہا " شیخ جی تو بہت بگڑے ہوئے ہیں "

پٹواری ۔ " رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی "

چھوٹے لال " شیخ جی کا کسی سے مقابلہ پڑے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا "

شنکرو اچار نے دیکھا کہ وہی سب سے پیچھے رہا جاتا ہے۔ بول اٹھا "چار بگھہ جمین (زمین) پر اتنا اکڑت (اکڑتے) ہیں۔ کہوں جمیدار ہوت تو ہم لوگن کا کچا کھائے جات (کہیں زمیندار ہوتے تو ہم لوگوں کو کچا کھا جاتے)"

اب جٹا شنکر کی باری تھی، کہنے لگے "پرنتو یہاں پرواہ کس کو ہے۔ گاؤں میں گنتی کے تو مسلمان ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو مار کر بھگا دیں گے" وہ تو بھگوان داس مہاراج بھی آ گئے، ان کی رائے بھی لے لو۔

بھگوان داس مہاراج گاؤں کے پروہت تھے۔ انہوں نے جب سارا معاملہ سنا تو کہا۔ ان ملکشوں کا کبھی وشواش نہیں کرنا چاہئیے۔ سب کو ان سے اسہوگ کرنا ہی اچھا ہے۔ پرماتما کرے سب مسلمان گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔"

شنکر واچار۔ اچھل پڑا "مہاراج! تم نے بڑی اکول (معقول) بات کہی۔ دھن ہے تمہری بدھی کو کہو ہتو تمہارا کا رائے ہے (تمہاری کیا رائے ہے)"

چھوٹے لال بنیئے نے جواب دیا "مدا (لیکن) ہمار انکسان (نقصان) ہوگا"

پٹواری نے سنبھالا "نہیں نہیں تم اس کی کوئی فکر نہ کرو"

آخر کار مہاراج بھگوان داس کی رائے سب نے مان لی اور اسی دن سے گاؤں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جہاں کبھی ہندو و مسلمان آپس میں برادرانہ تعلقات رکھتے تھے وہاں اب نفاق کا بیج بو دیا گیا۔ "شیخ و برہمن" کی جنگ سے پریشان ہو کر امن و امان کی دیوی گاؤں سے رخصت ہو گئی۔

—(۳)—

ایک دن پنڈت جٹا شنکر کے بیلوں کی چری میں شیخ جمن کی مرغی چلی گئی۔ جٹا شنکر نے ڈھیلا مارا، جمن نے دیکھ لیا، پہلے ڈھیلے کا کیا ذکر اگر جٹا شنکر مرغی کو جان سے بھی مار ڈالتے تو شیخ جی کو کوئی صدمہ نہ ہوتا لیکن اب تو لاگ ڈانٹ تھی۔ جمن نے سوچا کہ جٹا شنکر نے جان بوجھ کر ان کی مرغی کو ڈھیلا مارا ہے۔ بگڑ کر بولے "تم نے میری مرغی کو ڈھیلا کیوں مارا"

"ہمارا نقصان کرے گی تو ہم ضرور ماریں گے"

"آئے کہیں کے بڑے مارنے والے، اب مارو تو بتائیں"

"اچھا یہ بات ہے تو اپنی مرغی بھیج کر دیکھ لو"

"اب اس ضد پر تو میری مرغی ضرور جائے گی، میں بھی دیکھوں گا کہ کون مائی کا لال میری مرغی کو مارتا ہے"

"شیخ جی، بس زیادہ نہ بڑھو، زبان سنبھال کر بات کرو نہیں تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا. تمہاری مرغیاں میرا نقصان کریں اور اگر میں کچھ کہوں تم بجائے شرمندہ ہونے کے الٹا مجھے آنکھیں دکھاتے ہو۔"

"تم کو کچھ کہنا تھا تو مجھ سے کہتے. میری مرغی کو مارنے والے تم کون ہوتے ہو، میں تم سے دبنے والا آسامی نہیں ہوں، تم ایک کہوگے تو میں ہزار کہونگا، تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں سمجھا، مجھ سے زیادہ بولوگے تو ساری شیخی خاک میں ملا دوں گا۔"

"آہا چیونٹی چلی بہڑائیج" "تمہاری یہ مجال کہ مجھ سے آنکھ ملاؤ، اچھا آؤ بس اب دیر کیا ہے لاٹھی لے کر آجاؤ۔ آج ہی ہمارا اور تمہارا فیصلہ ہو جائے" یہ کہہ کر شیخ جمن گھر سے لاٹھی لینے کے لیے دوڑے ماں نے گھبرا کر پوچھا کیا معاملہ ہے جمن نے غصہ میں کوئی جواب نہ دیا! ادھر بھی جب جٹا شنکر گھر سے لاٹھی لے کر باہر نکلنے لگے تو ان کی ماں نے ٹوکا مگر وہ بھی بغیر کچھ کہے جلدی سے باہر آگئے۔

اس اثنا میں گاؤں کے اور بھی ہندو مسلمان جمع ہو گئے تھے مسلمانوں نے شیخ جی کا ساتھ دیا اور کہا. شیخ جی گھبرانا نہیں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں، اگر آج تم دب گئے تو اتنا سمجھ لینا کہ پھر ہندو ہمارا گاؤں میں رہنا دشوار کر دیں گے. دوسری جانب ہندوؤں نے جٹا شنکر کو ابھارا، "خبردار مسلمانوں سے دبنا نہیں۔ اکڑے رہو۔"

دونوں جانب کے لوگ مرنے مارنے کو تیار ہو گئے. اب یہ جٹا شنکر اور شیخ جمن کی لڑائی نہ تھی بلکہ شیخ و برہمن کی جنگ تھی۔ گاؤں میں زمینداروں کا ظلم برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لگان کی وصولیابی کے وقت کارندوں کی مار پھٹکار سہی جا سکتی ہے، پیادوں کی گالیاں کھائی جا سکتی ہیں، حاکم پرگنہ کی بیگار میں کوئی عذر نہیں کیا جائے گا. لیکن اس وقت شیخ و برہمن کا سوال پیدا ہو گیا تو فاقہ کش ہندو مسلم کسان اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر اس جنگ میں نہ تو کتھا والے پرچارک اور نہ میلاد شریف والے مولانا شریک تھے۔ اس وقت بھس میں چنگاری ڈال کر وہ دور سے تماشا دیکھنے والوں میں بھی نہیں تھے. فریقین جوشِ غضب میں پاگل ہو رہے تھے انجام کی کسی کو کوئی فکر نہ تھی، ہندوؤں نے "جے، جے" اور مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ مارا دونوں جانب کے سردار شیخ جمن اور پنڈت جٹا شنکر سب سے پہلے لاٹھی سنبھال کر آگے بڑھے، قریب تھا کہ دونوں جانب سے لاٹھیاں چل جائیں کہ اسی وقت جٹا شنکر اور شیخ جمن کی مائیں دوڑتی ہوئی آئیں اور دونوں کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ جوش پر آیا ہوا دریا تھم گیا، اٹھی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔

مہارا جن نے اپنے لڑکے جٹا شنکر کو مخاطب کر کے کہا "تو میرے جیتے جی جمن پر لاٹھی نہیں چلا سکتا.

تجھے مارنا ہی ہے تو پہلے اپنی ماں پر لاٹھی چلا۔ میں جمن کو تجھ سے کم نہیں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی میرا بچہ ہے جس کو تو آج مارنے چلا ہے اسی کو تیرے پتا جی اپنی جان سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ آج تم دونوں بھائیوں کی لڑائی سے ان کی آتما کو کتنا دکھ پہونچ رہا ہوگا۔ ہائے وہ میل ملاپ کے دن کیا ہوئے، تیری تو عقل ماری گئی ہے، تو دوسروں کے بہکانے میں آگیا ہے، مسلمان برسوں سے اس گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں انھوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے، ان سے لڑائی مول لینا اچھا نہیں۔ آپس کی لڑائی سے سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا جنھیں تو اپنا دوست سمجھتا ہے وہ وقت پڑنے پر تیرا ساتھ نہ دیں گے۔ فوجداری سے جیو ہتھیا ہوگی، اس کا پاپ کس پر پڑے گا۔" ادھر تو مہارانی جٹاشنکر کو سمجھا رہی تھیں اور ادھر شیخ جمن کی ماں جمن کو لعنت ملامت کر رہی تھیں" میں جٹاشنکر پر ہرگز کوئی آنچ نہ آنے دونگی، وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میرا کیا میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، آج نہ مری کل مری۔ مارنا ہے تو مجھے مار ڈال، میرے خون سے تیرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ ایک مرغی کے پیچھے تو جٹاشنکر کی جان لینے چلا ہے۔ توبہ! توبہ! جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم دونوں بھائیوں کو لڑا کر تماشا دیکھیں ان کی منشا میری زندگی میں پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک مہارانی اور میں زندہ ہوں اس گھر میں پھوٹ نہیں پڑ سکتی"

اتنا کہہ کر وہ مہارانی کی طرف بڑھیں، دونوں گلے مل کر رونے لگیں، بہت ہی پر اثر اور حسرتناک نظارہ تھا۔ دونوں ماؤں کی محبت آمیز تقریر اور پاک آنسوؤں نے بغض و عناد کے خس و خاشاک کو بہا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل صاف ہو گئے۔ جٹاشنکر اور شیخ جمن آگے بڑھے اور دونوں گلے مل گئے۔ سب یکبارگی چلا اٹھے۔

" ہندو مسلمان کی جے "

۞ ۞ ۞

۱۔ مرگ بے ہنگام ایشور کی سب سے بڑی بے رحمی ہے۔ یہ مصیبت ہمارے اعتقاد کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ ہم کو منکر و ملحد بنا دیتی ہے۔ ہم مصیبت کے نظارے آئے دن دیکھا کرتے ہیں اور ان کے عادی ہو جاتے ہیں، لیکن ہماری غم نصیب آنکھیں اس سانحہ کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ بے وقت موت ہمارے دلوں پر مشیت الٰہی کا سب سے قاتل وار اور ہماری خدا پرستی پر سب سے بڑا ستم ہے۔

۲۔ جس طرح روشنی کی شعاعیں کسی کثیف شے سے گزر کر منقلب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح نیک ارادے غیر قومی حکومت کی سخت گیری اور حکام کی خود پروری سے مس ہو کر منقلب ہو جاتی ہیں۔ انصاف اور حق پیروں تلے آجاتا ہے۔ اور فرض اور زعم حکومت سر پر جا پہونچتا ہے۔

زمانہ اکتوبر ۱۹۳۹ء اقوال پریم چند

میری شہسواری

مرزا عظیم بیگ چغتائی (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

زمانہ جنوری ۱۹۳۲ء

حماقت پر حماقت تو میری ملاحظہ ہو!..... میری شادی کو مشکل سے بیس پچیس ہی روز ہوئے ہونگے کہ کمرہ میں آیا تو خانم نے اپنی دانست میں ایک عجیب واقعہ سنایا، کہ ایک دفعہ ایک نہایت شریر گھوڑا آیا جس پر کسی سے چڑھا نہ گیا، بھائی صاحب نے کہا کہ ہم چڑھیں گے اور کوشش بھی انھوں نے بہت کی مگر کامیاب نہ ہوئے بالآخر اس کو ایک چبوترے کے پاس لا کر غڑاپ سے زین پر پھاند پڑے لیکن گھوڑے نے جو ٹاپیں ماریں تو بس دیکھتے ہی بنا، الف ہو گیا، بل کھائے، دولتیاں چلائیں۔ چرخ کھایا اور کیا کیا تلملایا ہے کہ خدا کی پناہ مگر بھائی صاحب نے اسے نہ چھوڑا۔ دیکھنے والے ان کی شہسواری کو دیکھ کے واہ واہ کرنے لگے۔ بالآخر بجلی کی طرح وہ ایک دم سے بنگلہ کی دیوار کود گیا اور انھیں ایسا لے بھاگا کہ لوگ گھبرا اٹھے کہ خدا معلوم کہاں لے جا کر پھینکے۔ غرض سب کے چہرے فق تھے۔ بھابی جان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، نانی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں البتہ والد صاحب کھڑے ہنس رہے تھے کہ ایک آدھ گھنٹہ بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی صاحب ہنستے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ گھوڑے کو انہوں نے بالکل شل کر دیا تھا۔

میں کیا عرض کروں کہ خانم نے شہسواری کی یہ کیفیت کس طرح بیان کی۔ میرا دل کڑھنے لگا کہ ہائے میں بھی کیوں نہ ایسا شہسوار ہوا، جب چھوٹا تھا تو عموماً ٹٹو پر سوار ہونے کی اپنی باری بھائی صاحب کے ہاتھ ایک پیسہ میں فروخت کر ڈالتا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تجارت اور یہ منفعت کچھ کام نہ آئے گی خانم نے یہ تمام کیفیت بیان کر کے مجھ سے میری شہسواری کا حال پوچھا تو میں نے پہلے تو خانم کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس خیال سے کہ ان کی دلشکنی نہ ہو جائے میں نے کہہ دیا کہ "ہاں مجھے گھوڑے پر چڑھنا آتا ہے" اس کے ساتھ ہی دو تین واقعات بھی سنا ڈالے، گھٹنہ پر چوٹ کے نشان تھے وہ دکھا کر دیکھو اسی شوق کی بدولت یہ چوٹیں آئی ہیں ایک دفعہ ایک بدمعاش گھوڑے نے گرا کر زخمی کر دیا تھا، حالانکہ اصل واقعہ تو یہ تھا کہ ایک نالائق کتے نے بھونک بھونک کر مجھے گرا دیا تھا۔

کوئی وجہ نہ تھی کہ خانم میرے جھوٹ کو سچ نہ مان لیتیں، خدا کے فضل سے سارا گھر شہسواری کا دلدادہ تھا۔ والد صاحب کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ وہ اپنی سواری کا گھوڑا کسی کو نہیں دیتے گھر میں لے دیکھئے اب صرف یہی گھوڑا رہ گیا تھا اس لیے نہ کبھی سواری کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔

بہر حال مجھے معلوم تھا کہ نہ کبھی والد صاحب گھوڑا دیں گے اور نہ میری شہسواری کا امتحان ہوگا اگر کبھی ایسا کوئی موقعہ آیا بھی تو اس کو ٹال دینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

⁂

مجھ سے بھابی جان سے کوئی لڑائی نہیں پھر نہ معلوم کیوں انھوں نے میری شہسواری کے افسانوں کو کہنے ہی نہ دیا۔ اور میرے لیے ایک مصیبت یہ تھی کہ خانم اکثر میری شہسواری کے قصے لے بیٹھتیں اور بھابی جان ہنس ہنس کر ان کی پرزور تردید کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اور خانم کا یہ حال ہو گیا کہ بھابی جان کی تردید دل کو دو اپنی ذلت کرنے اور مذاق اڑانے کا بہانہ تصور کرکے آگ ہو جاتی تھیں۔ ان کے دل میں یہ یقین ہو گیا تھا کہ بھابی جان انھیں اپنے مذاق کا تختہ مشق بنا رہی ہیں۔

میں بھی کس سادگی سے بھابی جان کے منھ پر یہ کہہ دیتا تھا کہ کیوں مذاق کرتی ہو؟ مگر وہ حقیقت سے واقف تھیں ہنسی کے مارے دوہری ہو جاتیں اور آنکھیں پھاڑ کر کہتیں "غضب کرتے ہو! ایسا سفید جھوٹ! آخر یہ جھوٹ کتنے دن چلے گا؟ بھائی صاحب اس بارے میں کبھی نہ بولے بلکہ جب ذکر آیا فوراً تسلیم کر لیا کہ میں ان سے کہیں اچھا شہسوار ہوں۔ وہ کچھ اس پیرایہ میں کہ کبھی پتہ نہ چلا کہ مذاق کرتے ہیں یا سچ کہتے ہیں۔ نتیجہ اس بحث بازی کا یہ ہوا کہ خانم اور بھابی جان نے شرط بدی، بھابی جان نے یہ شرط کی کہ جس گھوڑے پر میں کہوں اگر بھائی چڑھ دلیں تو دس روپیہ ہاروں گی ورنہ تمھیں دینا پڑیں گے۔ خانم نے نتیجے میں آکر فوراً یہ شرط پختہ کر لی اس کے بعد دو تین مرتبہ میری شہسواری کے امتحان کا موقعہ آیا لیکن ہر دفعہ بہانہ کرکے ٹال گیا۔ ادھر والد صاحب قبلہ کا یہ حال کہ آئے دن چھانٹ چھانٹ کر بگڑے تگڑے اور بدمعاش گھوڑے منگواتے، بہرحال کچھ عرصہ تک میری ٹالم ٹال مزہ سے چلتی رہی۔

بھابی جان تو جانتی ہی تھیں کہ میرے لیے کسی گھوڑے پر چڑھنے کی ہمت کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے ایفائے شرط کے لیے خانم سے موٹی موٹی قسمیں لے رکھی تھیں۔

⁂

میں لحاف میں لپٹا ہوا مزے سے ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا کہ آواز آئی "ارے میاں منّن ۔ ۔ ۔ ۔

جلدی سے میں نے سگریٹ دیوار سے رگڑ کر بجھایا اور اٹھ بیٹھا کہ پھر آواز آئی۔

"کیا کر رہے ہو؟ ۔ ۔ ۔

میں باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب قبلہ اس بلا کی سردی میں صرف ایک قمیص پہنے چبوترہ پر کھڑے ہیں اور سائیس ایک گھوڑا لیے سامنے کھڑا ہے، مجھے دیکھتے ہی والد صاحب نے شش

ہو کر بولے :۔

"یہ کیسا گھوڑا ہے؟"

میں نے کہا "کیا آپ لیں گے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں۔" مسکرا کر کہا۔

میں نے کہا "کیا کیجیئے گا ضرورت تو نہیں ہے" پھر میں نے سائیس سے کہا کہ لیجاؤ یہاں کسی کو گھوڑا دوڑانا نہیں لینا۔

والد صاحب اس پر ہنس پڑے اور کہنے لگے "میاں ٹھہرو بھی یہ تھوڑی رہے ہیں" ذرا دیکھنے تو دیں۔ نے لاکھ کہا کہ دیکھ کر کیا کیجیئے گا مگر وہ کاہے کو مانتے۔ کہنے لگے "ذرا پو کھیں ہاتھ پر لیکر دوڑا تو سہی۔"

اب سائیس تو لگا گھوڑا دوڑانے اور میں نے والد صاحب قبلہ کو لکچر دینا شروع کیا۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آپ کے والد یا کسی اور بزرگ کو ساٹھ ستر برس کی عمر میں یہ مرض لگ جائے کہ چلبلا سا گھوڑا پکڑ پائیں تو اچھل کر اس کی پیٹھ پر ہو لیں اور روزانہ دس بارہ میل کا چکر لگا آئیں آپ ہی بتائیے کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہوں گے۔ جب تک ملازمت پر رہے چار چار پانچ پانچ گھوڑے رکھتے رہے جب پنشن ہوئی اور آمدنی میں کمی ہو گئی تو دو ہی ایک پر اکتفا کی مگر ہم لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ صرف محض بے ضرورت اور لغو ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے ادھر گھوڑا عمر پر آیا اور اُدھر انھوں نے اُسے الگ کر کے پھر کوئی دوسرا نہایت شریر گھوڑا ڈھونڈھنے لگے۔ ان باتوں سے مجھے گھوڑے سے نفرت ہی نہیں بغض ہو گیا ہے، آپ بھی غور فرمائیے کہ کس قدر نالائق جانور ہے۔ دانہ کھلاؤ، گھاس کھلاؤ اور موقع پا جائے تو لات مار دے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کون حضرت تھے جنھوں نے گھوڑے ایسے نامعقول جانور کو سواری کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے جب کوئی چیز سواری کو میسر ہی نہ تھی تو گھوڑے کا سواری میں رکھنا حق بجانب تھا۔ مگر آج کل گھوڑے کی کیا حیثیت رہ گئی۔ اگر کسی موٹر سائیکل، ریل، ٹرام یا کسی دوسری سواری میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ ادھر مسافر اس کے قریب آیا اور اُدھر اُس کا پہیہ ٹوٹ کر مسافر کی پسلی میں لگنے لگے تو وہ کہاں تک سواری کے قابل سمجھی جائے گی، گھوڑے میں یہ عیب موجود ہے پھر بھی وہ سواری کی تعریف میں داخل ہے! اگر آپ کی موٹر سائیکل میں ویسا انجن لگا دیا جائے جو آپ کے قبضہ میں نہ ہو اور جب زور پر آئے تو جہاں جی چاہے لے کر چلدے مثلاً اگر آپ اسے سڑک کے بیچ میں چلانا چاہیں اور وہ کنارے کسی کھڈ میں لے جا کر ڈال دے اور روکنے پر بھی نہ رکے تو یہ کوئی سواری ہے۔ گھوڑے میں یہ سب عیب موجود اور جب کبھی اس کے جی میں آتا ہے تو اس زور سے دوڑتا ہے کہ روکے رکتا ہی نہیں اور آپ کو لیے

بھاگا جاتا ہے۔ اگر آپ زیادہ روکیں اور راس تانیں تو وہ کوشش کرکے آپ کو ہوا میں اچھال دیگا اور گرتے گرتے اوپر سے دولتی بھی جڑ دے گا اور خود ایسا بے تحاشا بھاگے گا جیسے کوئی ریل چھوٹی جا رہی ہے۔ آپ کہیں گے کہ تم اناڑی سوار کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ مجھے یہ نامعقول سواری واقعی پسند نہیں ہے مگر بھائی صاحب کو اکثر گھوڑے سے گرتے دیکھا ہے اور جب کبھی انھوں نے آسن جما کر بیٹھنے کی کوشش کی تو گھوڑے نے دوسری ترکیب نکالی یعنی کھڑا سا اٹھ چلا، گھوما اور پھر الف ہو گیا! والد صاحب قبلہ کی ہدایت ہے کہ جب گھوڑا الف ہو جائے تو آگے کو جھکو۔ یوں راس جھٹکو یوں زین پر جمو وغیرہ وغیرہ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر یہ مصیبت مول ہی کیوں لی جائے۔
بہر حال اگر آپ بے حیائی سے زین پر جمے رہے تو گھوڑا آپ کو الٹا پلٹا کر اور جھٹکا دے کر نت نئی حرکتیں کرے گا اور اگر خدا خدا کرکے چلا بھی تو عجیب شان سے چلے گا۔ اگر منہ پورب کی طرف ہوگا تو دم پچھم کی طرف ہوگی مگر وہ خود جائے گا دکھن کی طرف! یعنی آڑے آڑے کودتے ہوئے چلے گا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس معصوم کا کوئی قصور نہیں۔ ان کی رائے میں پتہ کھڑکا تھا اور گھوڑے کو بدکنے کا حق حاصل ہو گیا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ والد صاحب نے کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے گھوڑے کو علیحدہ کر دیا۔ اور علیحدہ کیا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں ڈرا دیا کہ اگر آپ کچھ دنوں کے لیے گھوڑے کی سواری ترک نہ کریں گے تو آپ کے اعضا کو نقصان پہونچے گا۔ بہر حال گھوڑا بھی بڈھا تھا بیچ ڈالا جب تک دوسرا خریدا جائے کوچوان بھی جو تیس برس کا ملازم تھا کہیں چل دیا۔ غرض اس طرح کچھ عرصے تک گھوڑے کی خریداری کی نوبت نہ آئی۔ اور والد صاحب ٹینس میں گھوڑے کی کسر نکالنے لگے، روز جا کر کھیلتے تھے مگر جناب بڑھاپا بری چیز ہے، اڑسٹھ سال کی عمر میں اس قسم کی کود پھاند میں ضرور کسی نہ کسی دن نقصان اٹھانا پڑے گا۔ چنانچہ ایک روز جست و خیز کرنے میں گھٹنے میں چوٹ پیدا ہو گئی اور دوڑنے کی سکت باقی نہ رہی۔ اب تانگے پر آنے جانے لگے۔ مگر تانگے والے بھی بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ ان سے گھوڑوں کی باتیں ہوتے ہوتے ایک روز گھوڑا لانے کو کہہ دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا وہ بہترین گھوڑا دکھانے کو لے آیا۔ جب اس کو دوڑایا جا چکا تو مجھے بھی حکم ملا کہ ذرا تم بھی چڑھ کے اس پر دُلکی نکالو۔

یہ وہ جانتے تھے کہ نہ کبھی میں گھوڑے پر چڑھا ہوں اور نہ چڑھ سکتا ہوں۔ ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ لو بھئی اب تم چڑھو محض ایک طنز آمیز اور مزاحیہ فقرہ تھا۔ بھائی صاحب تو ابھی سو کر بھی نہ اٹھے تھے اور میں بھی حشر تک کمرے سے نہ نکلتا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ باہر گھوڑا آیا ہوا ہے۔ مگر اب تو پھنس گیا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے کی طرف خانم اور بھابی جان بھی کھڑی ہیں۔ دل میں سوچا کہ آج ہی بھانڈا پھوٹا۔ میں بت کی طرح ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ یہ نازک پوزیشن جلد ہی نازک تر ہو گئی کیونکہ خانم اور بھابی جان میں نہایت زور و شور سے بحث ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں نے اشارے

سے بلایا۔ چار و ناچار جانا پڑا مگر میں گھبرایا ہوا پہونچا۔ دم بھر کے لیے دل کو مضبوط کر کے نہایت لاپروائی کے ساتھ دونوں کی باتیں سننے لگا۔ کس اطمینان اور بھروسے کے ساتھ خانم مجھ سے شرط جیتنے کی فرمائش کر رہی تھیں اور بھابی جان کے چہرہ پر گویا انبساط و شادمانی کا دریا لہریں مار رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے فرشتے بھی کبھی گھوڑے پر نہیں چڑھے۔ مگر خانم کا جوش قابل دید تھا وہ خود بھی میری شہسواری کے کرتب دیکھنے کے لیے بیچین تھیں۔

بہرحال خوش و بشاش ہو کر خانم نے مجھے چبوترے پر ڈھکیل دیا اور کہنے لگیں کہ جلدی جاؤ چڑھو اور تھکا کر اس کو شل کر دو، بڑی تیزی دکھا رہا ہے، سب بھول جائے تو بات ہے۔ میں ان الفاظ کو سن کر سمجھا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر کہ مرنا برحق ہے، خیال کیا کہ چاہے کچھ ہو ایک دفعہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ ہی جاؤں۔ پھر راس کھینچے رہونگا، چمکارتا رہونگا۔ تھوڑی دیر میں روک راک کر کسی نہ کسی بہانہ سے اتر پڑوں گا۔ یہ خیال کر کے ایک دم سے ہمت کی، مڑ کر خانم کے باغ باغ چہرہ کو دیکھا تو اور بھی ہمت ہو گئی۔ پھر کیا تھا سائیس کو حکم دیا کہ لاؤ جی ادھر لاؤ ادھر۔ والد صاحب دیکھ کر مسکرائے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں کبھی چڑھا نہیں ہوں مگر میرے لیے گھوڑے کی سواری کو اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ خواہ مخواہ گر کر مر ہی کیوں نہ جاؤں لیکن چڑھوں ضرور بلکہ گھوڑے سے گر کر مرنے کو وہ شہادت سے کم نہ خیال کرتے تھے۔

خیر جب میں گھوڑے کے قریب پہونچا تو ایسا معلوم ہوا کہ میں میدان جنگ میں کود پڑا۔ گھوڑا کمبخت الگ بگڑ رہا تھا مگر میرے بدن سے جرأت کے فوارے چھوٹ رہے تھے یعنی انتہائی جرأت کے باعث سارے بدن میں پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو چمکارنے کی کوشش کی مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی، شاید سردی کی وجہ سے! پھر کپکپاتے ہاتھوں سے اس کی باگ پکڑ لی۔ گھوڑے کے بائیں طرف کھڑا تھا۔ دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا، گھوڑا بدمعاش خواہ مخواہ بھڑبھڑا رہا تھا۔ میں بیٹھنے کو ہوا: نصر من اللہ کہنے سے مجھ میں ایک دم سے تمام جسم کی روحانی قوت عود کر آئی، پھر یاد آیا کہ ایک روز ایک مولوی صاحب نے وعظ کے دوران میں کہا تھا کہ ہر رسم کو بسم اللہ سے شروع کرنا چاہیئے اور جب کہیں کوئی کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہہ کر سیدھا پیر رکھے انشاء اللہ فتح ہو گی۔ چنانچہ بسم اللہ کہہ کر میں نے بھی سیدھا پیر رکاب میں رکھا۔ مگر پیر رکھتے ہی ادھر پیچھے سے والد صاحب اور بھائی صاحب نے بھی (جو اب آ گئے تھے) زور سے للکارا اور ہیں ہیں!! کر کے قہقہہ لگایا۔ میں بیٹھ ہی گیا ہوتا مگر گھوڑا چلدیا لہٰذا مجھے پیر نکالنا پڑا۔

والد صاحب ہنس ہنس کر کہنے لگے کہ تم بالکل گدھے ہو، سیدھا پیر رکھ کر کیا دم کی طرف منہ کر کے بیٹھتے؟ گدھے کہیں کے۔

میں نے اپنی حماقت کو محسوس کیا مگر واہ ری حاضر جوابی میں نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ خواہ مخواہ آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں، میں تو تنگ کو دیکھتا تھا کہ کھسکتا تو نہیں ہے۔

انھوں نے کہا۔ اچھا اب چڑھو، جلدی چڑھو۔

میں نے پھر گھوڑے کو چمکارا اور بسم اللہ کہہ کر بایاں پیر اس کی رکاب میں رکھا مگر پیر رکھا ہی تھا کہ وہ پھر چمکا جس پر میں نے جلدی سے پیر نکال لیا، لیکن دم بھر بعد پھر چمکار کر پیر رکھا مگر گھوڑا چل دیا اور پھر پیر نکالنا پڑا۔ دوتین دفعہ یہی ہوا۔ والد صاحب گھڑک کر مجھ سے کہنے لگے، پاؤں میں رکاب مار کے ایک دم سے اچھل کر بیٹھ کیوں نہیں جاتے ہو۔ یہ بھی کوئی ریل گاڑی ہے کہ تمہارے لیے کھڑی رہے گی، بھائی صاحب بھی لپک کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر تم انتظار ہی کیوں کرتے ہو، ہلکے پھلکے آدمی ہو پیر رکھتے ہی بجلی کی طرح چمک کے غڑاپ سے زین پر بیٹھ جاؤ۔

اوہو ہو! اب تو مجھے بھی گر معلوم ہو گیا، لاحول ولاقوۃ میں بھی واقعی عجیب آدمی ہوں۔ یہ خیال کرتے ہی میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ بیٹھئے مجھے چڑھنے دیجئے گا یا نہیں۔ میں یہ سب باتیں جانتا ہوں۔ میں نے یہ فقرہ زور سے کڑک کر کہا تاکہ خانم بھی سن لیں۔

یہ کہہ کر میں نے تھکپی کر ہونٹھ دبا کر اور جست کرنے کی پوری تیاری کر کے بایاں پاؤں رکاب میں رکھ ہی تو دیا، مگر مشکل سے پیر رکھ پایا تھا کہ تڑپ کر بجلی کی طرح اس بار گرا اور اس طرح اوندھے منہ گرا کہ لگام ہاتھ سے چھوٹ کر پیر میں الجھ گئی۔ ادھر اس موذی گھوڑے نے جو دیکھا کہ میری پیٹھ پر بجلیاں کوند گئیں تو وہ طرارہ بھر کے یہ جا وہ جا، میرا پیر جھٹکے کے ساتھ بلند ہوا اور اس طرح گھوما گویا میں پھرکی ہو گیا..... میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا بنگلہ کے احاطہ کو طے کر کے سرپٹ اڑا جا رہا ہے اور والد صاحب اور بھائی صاحب کا ہنستے ہنستے برا حال ہے، بھائی جان کی کیفیت تو بیان سے باہر۔ مارے ہنسی کے دوہری ہو گئیں، حلق میں پھندا پڑ گیا، آنسو نکل آئے۔ خانم کی حالت البتہ قابلِ رحم تھی، رنج و یاس کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں میں نے کہا، ہیں..... دیکھتی کیا ہو... گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ کون گھوڑے پر سے نہیں گرتا۔

خانم کا چہرہ ایک دم سے بشاش ہو گیا۔ بھابی جان کی طنز آمیز تکلیف دہ ہنسی پر وہ بگڑ کھڑی ہوئیں جب ذرا بھابی جان کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو ہنسی کو روکتی ہوئی آئیں اور بولیں۔

لاؤ بہن میری شرط کے روپے

واہ، واہ، خانم نے کہا۔ خوب! شرط تم ہاریں یا میں۔

ادھر میں نے کہا کہ اگر اتفاق سے گھوڑا اگر بگڑ کر نکل جائے تو کوئی کیا کرے۔ اس کے بعد میں نے دنیا کے مشہور شہسواروں کے گرنے کے واقعات بیان کرنا شروع کیے۔ اور والد صاحب اور بھائی صاحب کے گرنے کے بھی واقعات بتلائے تو بھابی جان تو کیا قائل ہوتیں ہاں خانم کو البتہ اطمینان ہو گیا اور

دونوں میں بڑے لطف کی بحث ہونے لگی۔ ایک طرف بھابی جان کہتی تھیں کہ میری شرط کے روپے مارئے اور قسمیں کھاتی تھیں، دوسری طرف خانم ہی کہتی رہیں، کہ میری شرط کے روپے تم کو ہضم نہ ہونگے۔

بھابی جان پھر شرط لگانے کو کہتی رہیں مگر میں نے خانم سے کہہ دیا ہے کہ جب تک پہلی شرط کے روپے ادا نہ ہو جائیں تم ہرگز ہرگز شرط نہ بدنا۔ اور میں دعا مانگتا ہوں کہ خدا نہ کرے بھابی جان کبھی شرط کے روپے ادا کریں۔

بہرصورت میں بھی ایک دفعہ گھوڑے پر چڑھا ہوں، کب اور کس طرح، یہ آپ نے خود دیکھ لیا۔

✣ ✣ ✣

نقد دھرم

زمانہ بابت نومبر و دسمبر ۱۹۰۵ء میں عنوان بالا سے ایک مضمون چھپا تھا جس کے ابتدائی جملہ درج ذیل ہیں،

"وید میں لکھا ہے کہ ست ہی کی جے ہوتی ہے، جھوٹ کی کبھی نہیں، یعنی سانچ کو آنچ نہیں، اور دروغ کو فروغ نہیں، جہاں کہیں دنیا میں دولت و اقبال ہے دھرم ہی اس کا سبب ہے، ہندو کہتے ہیں کہ لکشمی وشنو کی استری ہے اور وہ پتی برتا ہے۔ یعنی جہاں وشنو جی یعنی ست، راستی ہوں گے وہیں لکشمی ہوں گی۔ ایشور کو کسی شخص کا لحاظ نہیں۔ اقبال حدود جغرافیہ کا پابند نہیں یعنی کسی مقام پر محدود نہیں۔ جو لوگ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی ترقی کو وہاں کی سرد آب و ہوا سے منسوب کرتے ہیں (اور بعض اور ملکوں کی پستی کو وہاں کے حدود اربعہ سے متعلق منسوب کرتے ہیں) غلطی کرتے ہیں۔ ابھی ہزار سال نہیں ہوئے انگلستان کے باشندے روما وغیرہ میں بردے اور غلام بنے بکتے تھے۔ آج انگلینڈ اتنے بڑے بڑے ملکوں کا راج کر رہا ہے۔ کیا انگلینڈ اپنے حدود اربعہ سے بھاگ کر کہیں آگے نکل گیا ہے۔؟ پانسو سال پہلے امریکہ زمین کے اسی موقع پر تھا جہاں آج ہے۔ لیکن اس عرصہ میں وہاں کے باشندوں کی حالت میں تفاوت کا اندازہ لگائیے۔ روما یونان، مصر اور ہسپانیہ وہی تو ہیں جہاں اس زمانہ میں تھے جبکہ تمام دنیا میں ان کے علم و فضل کی دھاک تھی جوشش بھائی ملکوں اور انسانوں کا لحاظ نہیں کرتی۔ جو لوگ ست یا راستی پر چلتے ہیں صرف انہیں کی فتح ہوتی ہے اور جب تک ست دھرم پر چلتے رہتے ہیں ان کی جے رہتی ہے

سوامی رام تیرتھ

سہی

مسٹر سلیم جعفر

زمانہ جولائی ۱۹۳۳ء

لفظ "سہی" ابھی تک "شرمندہ تحقیق" نہیں ہوا ہے، مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ میں ارقام فرماتے ہیں "اصل میں صحیح تھا" اس حکم و وثوق پر مولوی عبدالحق صاحب پہلے یہ کہہ کر کہ "اس کی اصل صحیح بتائی جاتی ہے"، رنگ اشتباہ چڑھاتے پھر ایک اور فقرہ لکھ کر کہ قدیم اردو میں اس لفظ کو صحیح ہی کہتے تھے: خیال کو اسطرف لے جانا چاہتے ہیں کہ ایک سند اس قسم کی ضرور ملتی ہے جس سے اس تحقیق کا درست ہونا خارج از امکان نہیں؛

مستشرقین انگلستان محققین ہندوستان کے ہم خیال نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فاربز تو تحقیق سے گریز کرتے ہیں، لیکن ڈاکٹر فالن نے جرأت کی ہے ان کا قول ہے کہ یہ "متعلق فعل" ہے۔ اور اس کا ماخذ سنسکرت کا مادہ آس (आस) بہ معنی "ہونا" ہے، مسٹر پلاٹس اپنے "لغت ہندوستانی اور انگریزی" میں لکھتے ہیں کہ "اصل" غالباً ستیم (सत्यम) بہ معنی "سچ" ہے۔

لفظی تحقیق بیان فرمانے کے بعد مولوی سید احمد صاحب فرماتے ہیں:-

"یہ لفظ جس قدر موقعوں پر بولا جاتا ہے اگر وہ سب مواقع جتائے اور ان کے واسطے الفاظ بنائے جائیں تو بھی ہم پورا پورا ترجمہ یا نہیں اتار سکتے۔ کیونکہ اہل زبان اسے ایسے بہت سے موقعوں پر استعمال کر جاتے ہیں کہ انھیں اہل زبان ہی بول اور سمجھ سکتا ہے دوسرا شخص اگر بولے تو ضرور خطا کھائے گا۔ لہٰذا ہم چند مشہور قریب الفہم مواقع زیادہ تر حضرت غالب کی غزل سے بتا کر آگے چلتے ہیں"۔

اور بطور مشتے نمونہ از خروارے، گیارہ محل استعمال بتاتے ہیں مولوی صاحب کا استنباط و استقرا، غور و فکر سے محض فریب نظر معلوم ہوتا ہے، ممدوح نے اپنے دعویٰ کی تائید میں کچھ روزمرہ کے فقرے اور غالب مرحوم کی ایک غزل پیش کی ہے جو درج ذیل ہیں۔

ٹھیک بجا۔ درست جیسے جو تم کہو سو ہی سہی

(۲) برائے ایجاب۔ قبول۔ منظور۔ تسلیم۔ مانا۔ فرض کیا ع

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(۳) برائے شرط ، تو سہی۔

(۴) تکمیل فعل کے واسطے جیسے۔ میاں کھاؤ تو سہی ، پیچھے تکلف کر لینا یعنی پہلے کھانا تو کھاؤ (مصرعہ رنگین) اس کو یاں لا تو سہی ، سوچ میں بیٹھی ہے کیوں؟ یعنی پہلے تو آ ۔

(۵) غنیمت ہے۔ مغتنم ہے۔ بہتر ہے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۶) تسلی خاطر کے واسطے ، یہی سمجھیں گے۔ یونہی جانیں گے ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی

(۷) تاکید کے واسطے۔ حصر تاکید کے لئے ؎

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

(۸) تسلسل کے واسطے۔ جاری رہے چلے جائے۔ برقرار رہے ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۹) تاکید کلام کے واسطے۔ مانو۔ جانو۔ خیال کرو ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

(۱۰) منظور کرو۔ قبول کرو ؎

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(۱۱) ہر چہ بادا باد۔ کچھ ہی ہو۔ کچھ پروا نہیں۔ چلو یونہی سہی ، ہم فقیر ہی سہی

پہلے دوسرے اور پانچویں محل استعمال میں نہ تو کوئی بحث اور نہ کوئی باریک فرق ہے "ٹھیک" ہندی کا لفظ ہے۔ اور بقول خود مولوی صاحب اس کے معنی راست ، درست بجا ، صحیح ہیں۔ اس کے علاوہ کیا پہلی مثال کے یہ معنی لینا کہ جو کچھ تم کہتے ہو ہم اسے مانتے یا تسلیم وقبول ومنظور کرتے ہیں غلط ہے۔ یہ فقرہ متکلم اس موقع پر بے تکلف بول سکتا ہے جہاں ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کا کہنا قبول کرتا ہے خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو ، اسی طرح اگر دوسری مثال کے شعر کا مطلب یوں بیان کیا جائے کہ

"یہ ٹھیک۔ بجا۔ یا درست ہے کہ غیر کو تم سے محبت ہے مگر ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں ہیں" تو معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پانچویں مثال میں بھی صرف لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔ اور کچھ نہیں۔ یہاں بھی شعر کے یہ معنی کہے جا سکتے ہیں کہ اگر نغمۂ شادی میسر نہیں تو کچھ پروا نہیں ہمیں نوحۂ غم بھی منظور ہے گھر کی رونق کا دارومدار "ہنگامہ" پر ہے اس سے غرض نہیں کہ اس کا باعث کون ہے، نوحہ غم اور نغمۂ شادی دونوں "ہنگامہ" پیدا کر سکتے ہیں۔ اور دونوں میں سے جو بھی میسر آجائے گھر کی رونق کے لیے کافی ہے اور اس لئے ہم اسکو قبول کرتے ہیں۔

غالب کا سا "الم دوست"، حریص لذت آزار جو "کف افسوس" ملنے کو "عہد تجدید تمنا" سے تعبیر کرتا ہے۔ نغمۂ شادی میسر نہ آنے پر نوحۂ غم کو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر قبول کرلے یہ اس کی "شوخی اندیشہ" کے لیے باعث ننگ ہے، وہ دونوں کو ہم پلہ سمجھتا ہے، اس کے نزدیک دونوں میں سے کسی کی کوئی قدر نہیں اور ہے تو محض اس سبب سے کہ وہ ایک ہنگامہ پیدا کر سکتا ہے، جو گھر کی رونق کا باعث ہے۔

مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی اس شعر کی شرح ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "دنیا کی شادی غم دونوں ہیچ ہیں۔ اپنی دل لگی سے کام رکھنا چاہیئے۔ عارف کی نظر میں شادی و غم دونوں کی ایک ہی صورت ہے" اس سے بھی نہیں معلوم ہوتا کہ غالب نوحۂ غم کو غنیمت اور مغتنم سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

(۶) اس مد میں جتنے معنی بتائے گئے ہیں وہ سب پورے کے پورے شعر کا حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ یہ معنی محض لفظ سہی سے نکلے درست نہیں۔ مثلاً پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اپنی ہی ہستی سفینۂ بحر نجات بن سکتی ہے، اگر تم سے ہو سکتا ہے تو اس کی حقیقت کو سمجھ لو، نہیں ہو سکتا تو اسے قطعی بھلا دو۔ درحقیقت ہستی ہی مانع حصول مقصد ہے، اور دفع مانع صرف دو ہی صورتوں سے ممکن ہے یا تو اسے بہت ہی اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے یا پھر اسے اتنا بھلا دیا جائے کہ دل میں اس کا خیال ہی نہ آئے۔ معرفت نفس حاصل ہو تو اور خودی مٹا دی جائے تو دونوں ایک ہی منزل پر پہونچاتی ہے، اس لیے برابر ہیں۔

اسی طرح شاعر دوسرے شعر میں ایک آرزو کرتا ہے۔ تیسرے میں، عاشق صادق اور وفا شعار ہونے کا مدعی ہے، اور گوارا اور ناگوار کی پروا نہیں کرتا، اور چوتھے میں یہ قبول و منظور کرتا ہے کہ بے ثباتی تیری "عادت" ہے۔ جس کے ہم اس وقت متحمل نہیں، کہتا ہے کہ اب سے وہ طریق عمل اختیار کریں گے، کہ آئندہ نہیں تیری بے نیازی شاق نہ گذرے اور اس کی وجہ سے جو کچھ پڑے جھیل جائیں۔ بہرصورت وفا ہمارا شعار ہے اور اس سے منہ نہ موڑیں گے؛

ان چاروں اشعار میں لفظ سہی کے استعمال سے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو صورت واقعات ہو یا پیش آئے اس سے اسے کوئی تعرض نہیں۔ وہ اسے قبول و منظور کرتا ہے۔ بہ لحاظ معانی، پہلا شعر اچھا خاصہ تصوف کا وعظ ہے، دوسرا ایک مجسمۂ آرزو اور تیسرا اور چوتھا نعرۂ وفا پرستی۔ ان سے "تسلی خاطر" کے معانی کہاں نکلتے ہیں؟

(۷) اس شعر میں تاکید یا حصر جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ لفظ "سہی" سے نہیں بلکہ "تو" اور "ہے" سے ہوتا ہے، ان میں سے پہلا حرف تاکید ہے اور دوسرا بہ معنی حصر مستعمل ہے، خود مولوی صاحب کی تالیف اس کی شاہد ہے۔

(۸) اس میں کلام نہیں کہ شاعر تسلسل تعلقات کا خواہشمند ہے اور اس کے نزدیک دو شخصوں میں باہم عداوت ہونا بھی دلیل تعلق ہے، کیونکہ دو بے تعلق شخصوں میں دوستی یا دشمنی کچھ بھی نہیں ہو سکتی۔ گویا تعلق ہی ہیولائے منافرت و موانست ہے۔ لیکن لفظ "سہی" میں کون سی بات ہے جس سے یہ استدلال کیا جائے، کہ یہ تسلسل تعلق کی جانب ذہن کو منتقل کرتا ہے، کوئی بھی نہیں، شاعر پہلے کہتا ہے ع "قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے" اس مصرع سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ لفظ منہ سے نکلے ہیں متکلم و سامع میں پہلے سے ربط و ضبط تھا جسے اب سامع توڑنا اور متکلم قائم رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے مصرع میں یہ صاحب غرض اس کے قائم رہنے کی تدبیر بتاتا اور کہتا ہے کہ اگر کوئی اور صورت پسند نہیں تو عداوت ہی رکھیے۔ اس طرح آپ یاد تو کر لیا کریں گے اور یہی بہت ہے کیونکہ یاد وہی کیا جاتا ہے جس سے تعلق ہوتا ہے۔ اسی مضمون کے دو اور شعر نقل کیے جاتے ہیں پہلے سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر دشمنی (لاگ) کو تعلق (لگاؤ) سمجھتا ہے اور دوسرا شعر زیر بحث کا ہم معنی ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو　　　کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

(۹) کسی نے کسی کے عشق کا دعویٰ کیا تھا، جواب ملا "یہ عشق نہیں وحشت ہے، اسے چھوڑ دو" اس کے جواب میں مدعی عشق کہتا ہے "میں مانتا ہوں کہ میرا عشق، عشق نہیں وحشت ہے۔ لیکن یہ وحشت کوئی بیکار اور فضول چیز بھی نہیں کہ چھوڑ دی جائے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو آپ کے حسن کا شہرہ ہی ہوتا ہے" اس شعر میں حصر و تاکید "ہی" سے پیدا ہوتی ہے، دونوں مصرعوں میں "ہی" کے وہی ایک معنی ہیں یعنی منظور و قبول۔

(۱۰) یہاں از ہمائے ایک بازی ہے جلوت ہو یا خلوت، روش میں فرق نہیں آ سکتا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں "مان لیا کہ تم تنہا ہو اور کوئی پاس نہیں" سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں سہی کے معنی "منظور کر دہ قبول کردہ" کیونکر ہو گئے۔ ایک پرانا مقولہ "المعنی فی بطن الشاعر" یہ تو غالب ہی جانیں کہ کون سا منظر سامنے تھا جس کی انھوں نے تصویر کھینچی ہے۔ لیکن شعر سے دو منظر سمجھ میں آتے ہیں وھو ہذا۔

(۱) عاشق اپنے محبوب سے ملنے کی آرزو ظاہر کرتا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ دنیا بھر کے سامنے تمھیں کیسے بلا لیں، رسوا ہو جائیں گے، یہ پھر کہتا ہے کہ میں پاک باز ہوں، اندیشہ نہ کرو تنہائی میں بلا لو اس سے تمہاری رسوائی نہ ہو گی، مجھے تنہا ملنا بھی منظور رہے گا۔

ب) معشوق تنہا تھا اسے حسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق کہ عاشق ادھر جا نکلا۔ اب وہ برس رہے ہیں کہ تو یہاں کیوں آیا تیرے یوں آجانے سے ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ عاشق بطور معذرت یوں کہتا ہے کہ میرے یہاں آ نکلنے سے کوئی اندیشہ نہیں، مانا کہ آپ تنہا ہیں (خلوت ہے) لیکن میں لچا شہدا نہیں اور آپ پاک باز ہیں۔

(۱) اس فقرہ میں بے پروائی کا انداز لفظ سہی نہیں پیدا کرتا بلکہ خود فقرہ محل استعمال اور بالخصوص اس میں لفظ "چلو" کا موجود ہونا محاورہ میں بعض اوقات یہ لفظ اس معنی پر بھی دلالت کرتا ہے: "تمھیں کیا غرض تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو"۔

(۳) یہاں "تو" سے محض تاکید پیدا کرنا مقصود ہے لفظ سہی موکد ہے۔ یہ جملہ شرطیہ ہی نہیں اور بغرض اتمام حجت مان بھی لیا جائے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے تو شرط کی جزا میں حرف "تو" آتا ہے۔ "سہی" نہیں آتا۔

(۴) یہاں "سہی" تکمیل فعل کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوا۔ درحقیقت جب ایک شخص کو دو کام پیہم کرنا ہے اور ان میں وہ ایک کام بے درنگ کرتا ہے اور دوسرے کے کرنے میں اسے پس و پیش ہوتا ہے تو سامع اسے دوسرا کام کرنے کی ترغیب دینے کے لیے "تو سہی" استعمال کرتا ہے۔ ان دونوں مثالوں میں "تو" محض تاکید کے لیے اور "سہی" ایک کام کے ساتھ ساتھ دوسرا کرنے کی ترغیب دینے کو استعمال ہوئے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں جو مثالیں لفظ سہی کا محل استعمال سمجھانے کے لیے لکھی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض دو موقعوں پر بولا جاتا ہے۔ ایک وہ ہے جہاں کوئی بات منظور و قبول ہو دوسرا وہ جہاں دو فعل پیہم صادر ہونے چاہئیں۔ اور وہاں ایک کے صدور کے بعد دوسرے کے صدور میں توقف ہو۔ اور متکلم سامع کو اس کے کرنے کی ترغیب دلانا چاہتا ہو یعنی یہ کہنا چاہتا ہو کہ ایک کام کر لیا ہے اسکے ساتھ ہی دوسرا بھی کرنا چاہئیے۔ چوتھی مثال میں مولوی سید احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ "پہلے کھانا تو کھاؤ" یعنی ایک شخص کو دو فعلوں کا مصدر ہونا چاہئیے۔ کھانا کھانا۔ اور تکلف کرنا۔ وہ تکلف کرتا اور کھانا نہیں کھاتا ہے اس لیے اس سے کوئی کہتا ہے کہ تکلف تو کرتے ہو مگر کھانا نہیں کھاتے اس لیے پہلے کھانا کھالو پھر تکلف بھی کر لینا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اس لفظ کا محل استعمال سمجھانے کے لیے مندرجہ ذیل مثالیں لکھی ہیں:

(۱) سن تو سہی۔ کہہ تو سہی۔ اکثر "تو" کے ساتھ مل کر آتا ہے۔

(۲) بعض اوقات اپنے اصل معنی کی طرف رجوع کرتا ہے، جیسے ؎

بجڑکی سہی، اداس سہی، چین جبین سہی　　　سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

(۳) کبھی دھمکی کے معنی دیتا ہے، جیسے آؤ تو سہی، کھاؤ تو سہی،

(۴) (ان معنوں میں ہمیشہ تو کے ساتھ آتا ہے) کبھی آمادگی ظاہر کرتا ہے، تم جاؤ تو سہی پھر دیکھا جائے گا۔

(۵) کبھی استغنا ظاہر کرتا ہے لیکن حرف نفی کے ساتھ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی (غالبؔ)

ان میں سے دوسری مثال میں سہی کے معنی منظور، و قبول ہیں، باقی کی مثالوں پر وہی صادق آتا ہے جو فرہنگ آصفیہ کی تیسری اور چوتھی مثالوں کے متعلق کہا جا چکا ہے دھمکی، آمادگی اور استغنا کا مدار "سہی" پر نہیں ہے بلکہ ان فقروں کے خاص خاص مواقع سے بولنے پر ہے،

پلاٹس کے "ستیم" (सत्य) کا بگڑ کر "سہی" ہو جانا بہت ہی بعید از قیاس نظر آتا ہے فالن نے صرف مادۂ لفظ بتانے پر اکتفا کی ہے، دونوں کی تحقیقات پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی۔ لیکن ان کی مدد سے صحیح صحیح نتیجہ نکال لینا دشوار نہیں، پلاٹس نے لکھا ہے کہ ہندی میں "سئی" (सई) مستعمل ہے، اور فالن کہتا ہے کہ اس کا مادہ "اُس" ([illegible]) ہے فالن نے اسکے معنی BE IT SO (ایسا ہی ہو) بھی بتائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں جو لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ وہی بگڑا ہے۔ سنسکرت میں مضارع رास्यथ جہاں بہت سے معنی میں آتا ہے آرزو اور خواہش کے معنی میں بھی آتا ہے۔ "آس" کا مضارع "سیات" (स्यात्) ہوتا ہے اس کی دو مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں،

(۱) यस्य यो भाव स्यात् (جس کی جو عادت ہو)

(۲) न स्यात् प्राचमि: (وہ تابع غیر ہو)

"سیات" کا بگڑ کر "سئی" ہو جانا عین اصول پراکرت کے مطابق ہے۔ مسٹر آر۔ وی جاگیردار کی ایک تازہ تصنیف[1] سے ظاہر ہوتا ہے کہ "بت" (वत्ति) پراکرت میں "اے۔ ای" ہو گیا ہے انھوں نے مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے۔

---

[1] AN INTRODUCTION TO THE COMPARATIVE PHILOLOGY OF INDO ARYAN LANGUAGES BY R.V. Jahagirdar M.A (LONDON)

پراکرت	پالی	سنسکرت
नासेइ	नासेति	नाशयति
ناسیئی	ناسیئت	ناشیَیت

اس تبدیلی کی سند پر یہ نتیجہ نکالنا کہ سیات کا ٹکڑا " یات " ति "ای" ہے سے بدل گیا تاویل لایعنی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ سیات کے لغوی یا مجازی معنی ان تمام موقعوں پر چسپاں ہوتے ہیں جہاں "سہی" مستعمل ہے۔ حسب تقاضائے سیاق و سباق ہمیں سیات کے کہیں لغوی معنی (ہو) لینے پڑیں گے اور کہیں مجازی معنی (قبول و منظور وغیرہ) اس لفظ کو غالب مرحوم نے اپنی دو غزلوں کی ردیف میں رکھا ہے جن کے مطلعوں کے پہلے مصرع یہ ہیں :-

(۱) عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

(۲) نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

ان دونوں غزلوں میں سے پہلی میں "سہی" بیشتر اپنے مجازی اور کمتر لغوی معانی میں آیا ہے اور دوسری میں بالکل اس کے برعکس ہے۔

اس قسم کے فقروں میں جیسے "میاں کھاؤ تو سہی پیچھے تکلف کر لینا" یعنی جہاں سیاق و سباق کلام دو فعلوں میں وقوع یکے بعد دیگرے چاہتا ہے۔ میں "سہی" کو سنسکرت کے لفظ "سہت" (सहित = ساتھ) کا مخفف مانتا ہوں، مثال کے فقرہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ دو کام ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے تھے، ان میں سے سامع نے ایک کیا ہے دوسرا نہیں، متکلم تقاضا کرتا ہے کہ دوسرا بھی اس کے "ساتھ" ہی کرو۔ مصرعۂ رنگین سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"سیئی" کیوں کر "سہی" ہو گیا اس کے جواب وہ وہ زبردست لوگ ہیں جو بیدھڑک لفظوں کا تلفظ بگاڑتے اور بے کھٹکے قواعد کا خون کرتے ہیں جو بے سمجھے بوجھے ان میں کبھی کچھ گھٹا اور کبھی بڑھا دیتے ہیں اور جن کی قوت و اقتدار کا اعتراف کرنے کے لیے مستعلیق گو اپنے عجز و بے بسی کو محاورہ اور روزمرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

شمس العلماء حالی اور ڈاکٹر نذیر احمد کے خطوط

زمانہ اپریل ۱۹۳۴ء

زمانہ کو جاری ہوئے تیس سال سے زیادہ ہو چکے، اس عرصے میں اسکو ملک کے بڑے بڑے ادیبوں نامور انشا پردازوں باکمال شاعروں اور مقتدر لیڈروں کے بہترین مضامین نظم و نثر کی اشاعت کی عزت نصیب ہوئی۔ لیکن جس کوشش و کاوش سے ناظرین زمانہ کی ادبی ضیافت کا سامان مہیا ہوا ہے اس کا مفصل حال نامعلوم ہی رہیگا۔ اس بارے میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ زمانہ کے لیے فخر و مباہات کا باعث ہوا اور ایڈیٹر زمانہ کے لیے بھی ابتدائی جد و جہد کی یاد نہایت دلآویز و دل خوش کن ہے۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے ناموران ملک سے تبادلۂ خیالات کے مواقع حاصل ہوئے عظیم القدر بزرگوں سے خط و کتابت رہی۔ ان میں سے شمس العلما مولانا حالی اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے چند خطوط ذیل میں نذر ناظرین کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ یادگار مراسلے قدردانان ادب کے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

ایڈیٹر

پانی پت ۱۳ر جولائی ۱۹۰۵ء

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم!

عنایت نامہ پہنچا، مجھ سے زیادہ کوئی ناشکرا اور نامنفعل نہ ہوگا کہ ایک عرصہ سے آپکے بے نظیر رسالہ کے مطالعہ سے مستفید ہوتا ہوں، مگر باوجود اس کے آج تک نہ کبھی رسالے کی رسید لکھی اور نہ شکریہ کا ایک حرف لکھا مگر حال یہ ہے کہ میں تقریباً ایک سال سے ایسی پریشانیوں میں الجھا ہوا ہوں کہ لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہو گیا ہے، اور جمعیت خاطر اور اطمینان نے کلیتہً جواب دیدیا ہے میں نہیں چاہتا کہ پہلے ہی خط میں ان پریشانیوں کی تفصیل سے آپ کو بے لطف کروں، لہٰذا اس موقع پر صرف یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل اس وقت ناممکن ہے لیکن اگر زندگی باقی ہے تو میں ضرور اپنی شرمندگی رفع کرنے میں کوشش کروں گا۔ اور جیسا برا بھلا لکھنا مجھے آتا ہے زمانہ کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ امید ہے کہ آپ میرے اس عذر کو کسی حیلہ یا بہانہ پر محمول نہ فرمائیں گے۔

زمانہ کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان منتخب رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو

لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ زمانہ نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی اور تہذیب میں بھی روز افزوں ترقی کرے' اور جو صلح کل کا مسلک اس نے اختیار کیا ہے اُس سے سرمو تجاوز نہ کرے۔

زیادہ نیاز۔ آپکا نیازمند۔ الطاف حسین حالی

(۲)

نظام کلب۔ حیدرآباد دکن ۸۔ اپریل ۱۹۰۶ء

جناب منشی صاحب۔

کل ٹیلیگرام اور آج عنایت نامہ پہنچا۔ جو نظم میں نے جلسہ ینگ مینس ڈبیٹنگ فورم میں پڑھی تھی وہ کوئی جدید نظم نہ تھی۔ اس کو لکھے ہوئے بائیس تیئیس برس سے کم عرصہ نہ ہوا ہوگا اور مجموعہ نظم حالی جو ڈیوٹی شاپ علیگڈھ فروخت کرتی ہے وہاں سے مل سکتا ہے' یہاں بڑی مشکل سے ایک کاپی لوگ تلاش کرکے کہیں سے لائے تھے۔ اگر آپ اس پرانی دقیانوسی نظم کو اپنے رسالہ میں چھاپنا چاہیں تو ڈیوٹی سے ایک کاپی منگوالیں۔ اس میں اور بہت سی میری نظمیں شامل ہیں۔

جو لکچر سرسید مرحوم کی برسی کے موقع پر دیا گیا تھا وہ ان کی لائف موسوم بہ حیات جاوید کا خلاصہ ہے مگر بالکل نامکمل اور ادھورا ہے' میں آج اتوار کے سبب اس کو روانہ نہیں کرسکا' انشاء اللہ کل ضرور روانہ کردوں گا۔

جس روز میں نے نظم "تعصب و انصاف" پڑھی تھی اس روز میرے دوست مولوی عبدالحق بی۔اے نے اکبر کی برسی کے موقع پر اسکی لایف اور اس کی پالیسی پر لکچر دیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ابتک اکبر پر کسی صاحب نے ایسا عمدہ مضمون نہیں لکھا۔ میں نے سکریٹری فورم مذکور سے زمانہ کے لیے اس کو مانگ لیا ہے' وہ بھی عنقریب (جبکہ مولوی عبدالحق اس پر نظرثانی کرلیں گے) آپ کی خدمت میں بھیجدوں گا۔ مگر سکریٹری نے اس کو اس شرط پر دینا منظور کیا ہے کہ اسکی سو یا پچاس جلدیں جو وہ آپ سے طلب کریں وہ اصل لاگت پر آپ انکو دیدیں۔

اس لحاظ سے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کا جواب متضمن بہ منظوری شرط مذکور آجائے اس وقت اُس لکچر کو آپ کی خدمت میں بھیجا جائے اور اُسی وقت مطلوبہ جلدوں کی تعداد مسٹر درما سکریٹری فورم مذکور سے پوچھ کر آپ کو اطلاع دیجائیگی۔ چونکہ یہ سب مطالب تار کے ذریعہ ادا ہونے مشکل تھے اس لیے تار نہیں دیا گیا۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

۳ ـ مولوی عبدالحق بی۔اے کا لکچر آج بک پیکٹ کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں ارسال کیا گیا'

مہربانی کر کے اس کی رسید سے جلد مطلع کریں۔ انشاءاللہ ۲۴ مئی کو یہاں سے روانہ پانی پت ہو جاؤں گا۔ اس لکچر کو آپ خواہ الگ چھاپیں یا اپنے رسالہ کے ضمن میں بشمول دیگر مضامین طبع فرمائیں، بہر صورت اپنی ضرورت سے پچاس جلدیں زیادہ چھاپنی چاہئیں، اور اصل لاگت کے حساب سے پچاس جلدوں کی قیمت لگا کر ویلیو پے ایبل پارسل بنام مولوی عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر و پرنسپل مدرسۂ آصفیہ سرکار عالی بمقام حیدرآباد بھیج دیجئے گا۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

حیدرآباد دکن نظام کلب۔ ۱۴ مئی ۱۹۰۶ء

۴۔ جناب من۔ مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون آپ جب چاہیں زمانہ میں شائع کریں۔ اگر ڈیڑھ سو سے کم جلدیں چھاپنی مناسب نہیں ہیں تو آپ کو اجازت ہے ڈیڑھ سو جلدیں زائد چھپوا لیں۔ میں انشاءاللہ تین چار دن میں وطن روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ اگر کچھ مجھے لکھنا چاہیں تو ایک ہفتے کے بعد پانی پت خط ارسال فرمائیں۔ اور اگر مضمون مذکور کے متعلق کچھ پوچھنا پوچھنا ہو تو مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل مدرسۂ آصفیہ سرکار عالی کے نام بمقام حیدرآباد ملک پیٹ خط تحریر کریں۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

از حیدرآباد دکن، نظام کلب۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۶ء

۵۔ جناب منشی دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ

اس خط کے ساتھ ہی میں اپنا ایک تازہ چھپا ہوا لکچر آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ یہ لکچر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں دینے کے لیے تیار ہوا تھا مگر افسوس کہ وہاں اس کا ایک فقرہ بھی نہیں پڑھا گیا۔ اخباروں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اراکین انجمن کی مخالف ایک پارٹی کھڑی ہو گئی ہے اور وہ انجمن کی مخالفت کھلم کھلا کرتی ہے۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ میں ایک عام برہمی اور جوش پیدا ہو گیا، اور اسی برہمی کے رفع کرنے میں، میں اپنا لکچر پڑھ نہ سکا۔ باتیں بہت سی ہوئیں اور میرا وقت نکل گیا۔ چونکہ لکچر ابھی تک شائع نہیں ہوا اور جلسہ میں پڑھا نہیں گیا اس لیے میں آپ کے پاس بھیجتا ہوں، آپ اسے زمانہ کے صفحوں میں جگہ دیجئے اور دفعۃً یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے جب آپ مناسب سمجھیں شائع کیجئے۔ فقط

خاکسار: نذیر احمد۔ ۱۳ اپریل ۱۹۰۶ء

۶۔ جناب من۔ تسلیم۔ ۲۔ فروری کو آپ کا ایک ملفوف خط جناب قبلہ مولوی صاحب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ نے مجھے دیا جس میں لکھا تھا کہ کتاب الحقوق میرے پاس نہیں پہونچی۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ اس قدر جلد الحقوق کو بھول گئے۔ خود میں نے کتاب مذکور بصیغہ تبصرہ آپ کی خدمت میں روانہ کی ہے، اور آپ نے رسالۂ زمانہ میں اس کا ایک مضمون منتخب کر کے

چھاپا ہے۔ غالباً سہو کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کتاب مکمل نہ تھی۔ ٹائیٹل پیج اور فہرست اور خاتمہ آخر کی دو کاپیاں اس میں شامل نہ تھیں، کیونکہ وہ اس وقت تک طبع نہ ہوئی تھیں بہر کیف گزارش یہ ہے کہ اگر آپ فرمائیں تو کتاب الحقوق مکمل روانہ خدمت کر دوں۔ باقی والسلام

نیاز مند محمد رحیم بخش از دہلی مکان شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل ڈی

۷ رفروری ۱۹۰۶ء

۷۔ بخدمت بابو دیا نرائن نگم صاحب۔

آپ کا خط جس میں جواب کے لیے ٹکٹ وار لفافہ بھی ملفوف تھا پہونچا، یہ تو آپ کھینچ تان کر مجھکو کارسپانڈنٹ کے راستے پر ڈال چلے جو میری عادۃ اور میرے مزاج دونوں کے خلاف ہے رسالوں اور اخباروں کی کارسپانڈنٹ وہ کرتا ہے جس بدنصیب کو شہرۃ کا دوسرا ذریعہ میسّر نہیں۔ شکر ہے خدا نے مجھ کو اس بے حرمتی سے بچایا ہے۔ ایسے مذاق کے لوگ بھی ہیں جو میری کتابوں اور میرے لیکچروں کے آرزومند رہتے ہیں دو پیسے کے ٹکٹ وار لفافے کے یہ معنی کہ سودیشی تحریک پر جو کچھ لکھوں اس کی قیمت آدھ آنہ۔ میں آپ کی قدردانی کا شکر گزار ہوں۔ کیتنے ہیں کہ چھاپ دینے کی الٹی منت رکھتے ہیں۔ سودیشی تحریک پر موافق و مخالف بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، میں اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہوں رہی اہل ملک کی ہدایت تو جن کو خدا گمراہ کرے ان کو کون ہدایت دے، میں تمام اہل ملک کو الا ماشاء اللہ عقل مصلحۃ اندیشی کی طرف سے گمراہ پاتا ہوں ہندو ہوں یا مسلمان۔ فقط

(یہ خط ۱۹۰۷ء کا ہے) خاکسار نذیر احمد

⁂ ⁂ ⁂

تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعالِ ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا وقت کو عزیز سمجھنا واقعات کے اسباب ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات۔ معاشرت۔ طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدرِ امکان خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا۔ اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی۔ اصلی تمکین۔ حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

زمانہ فروری ۱۹۰۶ء سر سید احمد

کرکٹ میچ

پریم چند ——— زمانہ جولائی ۱۹۳۷ء

یکم جنوری ۱۹۳۵ء۔ آج کرکٹ میچ میں مجھے جتنی مایوسی ہوئی اس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ ہماری ٹیم حریفوں سے کہیں زیادہ مستحکم تھی۔ مگر ہمیں ہار ہوئی اور وہ لوگ فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے ٹرافی اڑا لے گئے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہمارے یہاں قیادت کے لئے لیاقت شرط نہیں ہم قیادت کے لئے ثروت اور دولت لازمی سمجھتے ہیں۔ ہز ہائینس کپتان منتخب ہوئے، کرکٹ بورڈ کا فیصلہ سب کو ماننا پڑا۔ مگر کتنے دلوں میں آگ لگی، کتنے لوگوں نے حکم حاکم سمجھ کر اس فیصلہ کو منظور کیا، وہ کھیلنے والوں سے پوچھئے۔ اور جہاں محض منہ دیکھی ہے وہاں اُمنگ کہاں، ولولہ کہاں، عزم کہاں، آخری قطرہ خون گرا دینے کا جوش کہاں، ہم کھیلے اور بظاہر دل سے کھیلے، مگر یہ حق کے لئے جان دینے والے سرفروشوں کی فوج نہ تھی۔ بیٹ اور لوٹ کے لئے لڑنے والی فوج تھی، کھیل میں کسی کا دل نہ تھا۔

میں اسٹیشن پر کھڑا اپنا تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک نازنین نے جو ابھی کار سے اتری تھی آگے بڑھکر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولی، آپ بھی تو اسی گاڑی سے چل رہے ہیں مسٹر ظفر؟"

مجھے حیرت ہوئی یہ کون نازنین ہے اور اسے میرا نام کیونکر معلوم ہوگیا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے سکتہ سا ہوگیا۔ گویا سارے آداب اور اخلاق کی رسمیں دماغ سے محو ہوگئی ہوں حسن میں ایک سطوت ہے جو بڑے بڑوں کا سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنے عجز کا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ میں نے نظام حیدرآباد سے، ہز اکسلنسی وائسرائے سے، مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھکر کھایا ہے مگر یہ افتادگی اور فروتنی مجھ پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی پلکوں سے اس کے قدموں کا بوسہ لے لوں۔ وہ ملاحت نہ تھی جس پر ہم جان دیتے ہیں، نہ وہ نزاکت جس کی شعراء قسمیں کھاتے ہیں۔ اس کی جگہ ذہانت تھی، متانت تھی، وقار تھا، زندہ دلی تھی اور شوخی اظہار تھا۔

بے نقاب میں نے پُرسوال انداز سے کہا، جی ہاں،

یہ کیسے پوچھوں کہ مجھے آپ سے کب نیاز حاصل ہوا، اس کی بے تکلفی کہہ رہی تھی کہ وہ مجھ سے متعارف ہے، میں بیگانہ کیسے بنوں۔ اسی سلسلے میں میں نے اپنی مروّت کا فرض بھی ادا کر دیا۔

"میرے لئے کوئی خدمت؟"

اُس نے مسکرا کر کہا، جی ہاں آپ سے بہت سے کام لوں گی، چلئے! اندر وٹینگ روم میں بیٹھیں، لکھنؤ کا قصد ہوگا، میں بھی وہیں چل رہی ہوں۔

وٹینگ روم میں آکر اُس نے مجھے آرام کرسی پر بٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی، "آج تو آپ کی بولنگ بڑی مہلک تھی، ورنہ ہم لوگ پوری اننگ سے ہارتے۔"

میری حیرت اور زیادہ ہوئی، اس حسینہ کو کیا کرکٹ سے بھی شوق ہے۔ مجھے اس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ ایسی آداب شکن حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوئی تھی، تو جہ اسی طرف تھی، طبیعت میں کچھ انقباض سا ہو رہا تھا، رگوں میں وہ سرعت اور طبیعت میں وہ گلابی بشاشت نہ تھی جو ایسے موقع پر فطرتاً مجھ میں ہونی چاہیے تھی۔

میں نے پوچھا، کیا آپ وہیں تشریف رکھتی تھیں؟

اس نے اپنا سگرٹ جلاتے ہوئے کہا، جی ہاں، اول سے آخر تک۔ مجھے تو صرف آپ کا کھیل جچا اور لوگ تو کچھ بددل سے ہو رہے تھے، اور میں اس کا راز سمجھ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں لوگوں میں صحیح آدمیوں کو صحیح مقام پر رکھنے کا مادہ ہی نہیں، جیسے اس سیاسی پستی نے ہمارے سبھی اوصاف کو کچل ڈالا ہے جس کے پاس ثروت ہے وہ قادرِ مطلق ہے، وہ کسی علمی، ادبی، معاشرتی جلسے کا صدر ہو سکتا ہے۔ اہل ہو یا نہ ہو، نئی عمارتوں کا افتتاح اسی کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے، بنیادیں اس کے ہاتھوں رکھوائی جاتی ہیں تہذیبی تحریکوں کی قیادت اُسے دی جاتی ہے، وہ کانووکیشن کے خطبے پڑھیگا، لڑکوں کو انعام تقسیم کریگا۔ یہ سب ہماری غلامانہ ذہنیت کی برکت ہے، کوئی تعجب نہیں ہم اس قدر ذلیل اور پست ہیں۔ جہاں حکم اور اختیار کا معاملہ وہاں تو خیر مجبوری ہے، ہمیں پابوسی کرنی ہی پڑتی ہے، مگر جہاں ہم اپنی آزاد خیالی اور آزاد عملی سے کام لے سکتے ہیں وہاں بھی ہماری رسوم طلبی اور منعم پرستی ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔ اس ٹیم کا کپتان آپ کو ہونا چاہیئے تھا، تب دیکھتی حریف کیونکر بازی لے جاتا۔ مہاراجہ صاحب میں اس ٹیم کے کپتان بننے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی آپ میں اسمبلی کی صدارت کی، یا مجھ میں سینما ایکٹنگ کی۔

بالکل وہی جذبات جو میرے ذہن میں تھے، مگر اس کی زبان سے نکل کر کتنے پُر اثر اور کتنے بصیرت افروز ہو گئے تھے۔ میں نے کہا آپ بجا فرماتی ہیں، واقعی یہ ہماری کمزوری ہے۔

"آپ کو اس ٹیم میں شریک نہ ہونا چاہیئے تھا۔"

"میں مجبور تھا۔"

اس حسینہ کا نام مس ہیلن مکرجی ہے۔ ابھی انگلینڈ سے آرہی ہے۔ یہی کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے بمبئی ٹھہر گئی تھی۔ انگلینڈ میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے اور خدمت خلق اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ یہاں اس نے ایک اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی اور میرا ذکر بھی پڑھا تھا۔ تب سے اُسے میری جانب حسنِ ظن ہو گیا ہے۔ یہاں مجھے کھیلتے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کا ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ایک نئی ٹیم مرتب کی جائے، اور اس میں وہی لوگ لئے جائیں جو قوم کی نیابت کرنے کے مستحق ہیں۔ اس کی تجویز ہے کہ میں اس ٹیم کا کپتان بنایا جاؤں۔ اسی ارادہ سے وہ سارے ہندوستان کا دورہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے والد مرحوم ڈاکٹر این مکرجی نے بہت کافی دولت چھوڑی ہے، اور وہ اس کی بلا شرکتِ غیرے وارث ہے۔ اس کی تجویز سن کر میرا دماغ آسمان میں اڑنے لگا۔ میری زندگی کا سنہرا خواب اس غیر متوقعہ انداز سے حقیقت بن سکے گا۔ اس کا کسے گمان تھا۔ مشیت غیب میں میرا اعتقاد نہیں۔ مگر آج میرے وجود کا ایک ایک ذرہ تشکر اور عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں نے مناسب اور منکسر الفاظ میں مس ہیلن کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کی گھنٹی ہوئی، مس مکرجی نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ منگوائے۔ میں احتجاج نہ کر سکا۔ اس نے میرا لگیج اٹھوایا۔ میرا ہیٹ خود اٹھا لیا اور بیباکانہ انداز سے ایک کمرہ میں جا بیٹھی اور مجھے بھی اندر بلا لیا۔ اس کا خانساماں تیسرے درجہ میں بیٹھا۔ میری قوتِ عمل جیسے سلب ہو گئی تھی۔ میں خدا جانے ان سب معاملات میں کیوں اسے پیش قدمی کرنے دیتا تھا جو مرد کی حیثیت سے میرے فرائض میں شامل تھے۔ شاید اس کے حسن، اس کے ذہنی وقار اور اس کی علو ہمتی نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ گویا اس نے کامروپ کے جادو طرازوں کی طرح مجھے بھیڑ بنا لیا ہو۔ اور مجھ میں قوتِ ارادہ غائب ہو گئی ہو۔ اتنی ہی دیر میں میری ہستی اس کی رضا میں جذب ہو گئی تھی۔ میری خودداری کا تقاضہ یہ تھا کہ میں اُسے اپنے لئے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ منگوانے دیتا اور تیسرے ہی درجہ میں آرام سے بیٹھتا اور اگر اول درجہ میں بیٹھنا تھا تو اتنی ہی فیاضی سے دونوں کے لئے خود اول درجہ کے ٹکٹ لاتا لیکن فی الواقع میری قوتِ عمل سلب ہو گئی تھی۔

۲ر جنوری۔ میں حیران ہوں مس ہیلن کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے اور یہ محض دوستانہ ہمدردی نہیں ہے، اس میں محبت کا خلوص ہے۔ رحم تو اتنا مہماں نواز نہیں ہوا کرتا، اور میرے کمال کا اعتراف! میں اتنا عقل سے عاری نہیں ہوں کہ اس مغالطے میں پڑوں، کمال کا اعتراف زیادہ سے زیادہ ایک گرم

اور ایک پیالہ چائے پا سکتا ہے، یہ خاطر و مدارات تو وہیں پاتا ہوں جہاں کہیں میچ میں کھیلنے کے لئے مدعو ہوتا ہوں تاہم وہاں یہ دلنوازی نہیں ہوتی محض رسمی خاطر داری برتی جاتی ہے۔ اس نے تو جیسے میری آسائش کے لئے اپنے کو وقف کر دیا ہو، میں تو شاید اپنی معشوقہ کے سوا اور کسی کے ساتھ اس خلوص کا برتاؤ نہ کر سکتا، یاد رہے، میں نے معشوقہ کہا ہے، بیوی نہیں کہا، بیوی کی ہم خاطر داری نہیں کرتے، اس سے تو خاطر داری کروانا ہی ہمارا وطیرہ ہو گیا ہے اور شاید حق بھی یہی ہے۔ مگر فی الحال تو میں ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی بہرہ ور نہیں، اس کے ناشتے، ڈنر، لنچ میں تو میں شریک تھا ہی، ہر اسٹیشن پر (وہ ڈاک تھی اور خاص خاص اسٹیشنوں ہی پر رکتی تھی) میوے اور پھل منگواتی اور مجھے بہ اصرار کھلاتی، کہاں کی کیا چیز مشہور ہے اس کا اسے خوب علم ہے، میرے عزیزوں کے لئے طرح طرح کے تحائف خریدے۔ مگر حیرت تو یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی اسے منع نہ کیا، منع کیونکر کرتا۔ مجھ سے پوچھ کر تو لاتی نہیں، جب وہ ایک چیز لاکر محبت کے ساتھ میری نذر کرتی ہے تو میں کیسے انکار کر دوں۔ خدا جانے کیوں میں مرد ہو کر بھی اس کے روبرو عورت کی طرح شرمیلا، کم گو، بستہ دہن ہو جاتا ہوں۔

دن کی تھکان کی وجہ سے رات بھر بخیلی رہی، سر میں خفیف سا درد تھا۔ مگر میں نے اس درد میں مبالغہ کیا، تنہا ہوتا تو اس درد کی شاید مطلق پروا نہ کرتا۔ مگر آج اس کی موجودگی میں مجھے اس کے اظہار میں مزہ آرہا تھا، وہ میرے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی اور میں خواہ مخواہ نڈھال ہوا جاتا تھا۔ میرے اضطراب کے ساتھ اس کی وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ سے بار بار پوچھتی اب درد کیسا ہے، اور میں تو کلانہ انداز سے کہتا اچھا ہوں۔ اس کی نازک ہتھیلیوں کے احساس سے میری روح میں گدگدی ہوتی تھی، اس کا وہ دلکش چہرہ میرے سر پہ جھکا ہوا ہے۔ اس کی گرم سانسیں میری پیشانی کے بوسے لے رہی ہیں۔ اور میں گویا جنت کے مزے لے رہا ہوں۔ میرے دل میں اب اس پر فتح پانے کی خواہش اکھوے لے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ میری ناز برداری کرے۔ میری طرف سے کوئی ایسی پیش قدمی نہ ہونی چاہئے جس سے اس پر میری فریفتگی کا اظہار ہو۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میری ذہنیت میں کیونکر یہ انقلاب ہو جاتا ہے۔ میں کیونکر طالب سے مطلوب بن جاتا ہوں یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے نہ جانے کب نیند آجاتی ہے۔ مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں وہ بدستور اسی محویت کے ساتھ میرے سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی ہے۔ تب مجھے اس پر رحم آجاتا ہے اور میں کہتا ہوں آپ اب تکلیف نہ کریں، میں بالکل اچھا ہوں۔ عاشقی کا تھوڑا سا تجربہ کسے نہیں ہوتا میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں۔ مگر اس معشوقی میں آج جو لطف آیا اُس پر عاشقی صدقے، عاشقی غلامی ہے معشوقی بادشاہت۔

میں نے ترحم کے انداز سے کہا، آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔

اُس نے دلسوزی کی۔ مجھے کیا تکلیف ہوئی، آپ درد سے بے چین تھے اور میں بیٹھی رہتی۔ کاش، یہ

درد مجھے ہوتا:
میں عرش معلٰی پر اُڑا جا رہا تھا۔

---

۵ رجنوری۔ کل شام کو ہم لکھنؤ پہونچ گئے۔ راستے میں ہیلکن سے تمدنی، سیاسی، اور ادبی مسائل پر خوب باتیں ہوئیں۔ گریجویٹ تو بخدا کے فضل سے میں بھی ہوں، اور تب سے فرصت کے اوقات میں کتب بینی بھی کرتا رہا ہوں، علما کی صحبت میں بھی بیٹھا ہوں۔ لیکن اس کی وسعتِ معلومات کے سامنے قدم قدم پر مجھے اپنی بے بضاعتی کا علم ہوتا ہے۔ ہر ایک مسئلہ پر اس کی اپنی رائے ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خوب تحقیق کے بعد وہ رائے قائم کی ہے۔ اس کے برعکس میں ان لوگوں میں ہوں جو ہوا کے ساتھ اڑتے ہیں، جنھیں وقتی تحریکیں زیر و زبر کر دیتی ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح اس پر اپنا ذہنی وقار قائم کر دوں، مگر اس کے نظریات مجھے بے زبان کر دیتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ علمی مسائل میں اس سے پیش نہ پا سکوں گا تو میں نے ابی سینیا اور اٹلی کے معرکے کا ذکر چھیڑ دیا جس پر میں نے اپنی دانست میں بہت کچھ پڑھا تھا، اور انگلینڈ اور فرانس نے اٹلی پر جو دباؤ ڈالا ہے اس کی تعریف میں اپنا سارا زورِ بیان صرف کر ڈالا۔ اس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا آپ کا یہ خیال ہے کہ انگلینڈ اور فرانس محض انسانیت یا زبردست پروری کے جذبات سے متحرک رہے ہیں تو یہ آپ کی غلطی ہے ان کی ملوکیت پرستی یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت پھیلے اور سر سبز ہو۔ مسولینی وہی کر رہا ہے جو انگلینڈ نے بارہا کیا ہے اور آج بھی کر رہا ہے۔ یہ سارا بہروپیا پن محض ابی سینیا سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اگر انگلینڈ کو اپنی تجارت کے لئے بازاروں کی ضرورت ہے اپنی زائد آبادی کے لئے تعلقات زمین کی ضرورت ہے۔ اپنے تعلیم یافتوں کے لیے موٹے منصبوں کی ضرورت ہے تو اٹلی کو کیوں نہ ہو۔ اٹلی جو کچھ کر رہا ہے، ایمانداری کے ساتھ علانیہ کر رہا ہے۔ اس نے کبھی عالمگیر اخوت کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ کبھی امن کا راگ نہیں الاپا۔ وہ تو صاف کہتا ہے جنگ و جدل ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسانیت کا ارتقا جنگ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ انسان کے ملکوتی اوصاف میدانِ جنگ ہی میں نشو و نما پاتے ہیں۔ مساوات کے نظریے کو وہ جنون کہتا ہے، اور اپنا شمار بھی انھیں برگزیدہ اقوام میں کرتا ہے جنھیں رنگین آبادیوں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ اس لئے ہم اس کے طرزِ عمل کو سمجھ سکتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہمیشہ روباہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمیشہ ایک قوم کے مختلف عناصر میں تفرقے ڈال کر یا ان کے اختلافات کو سیاسیات کا مدار بنا کر انھیں اپنا حلقہ بگوش بنایا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دنیا میں اٹلی، جاپان اور جرمنی خوب فروغ حاصل کریں اور انگلینڈ کا تسلط ٹوٹے تبھی دنیا میں اصلی جمہوریت، اصلی امن پیدا ہوگا۔ موجودہ تہذیب جب تک نہ مٹ جائے گی دنیا میں امن کا راج نہ ہوگا

کمزور قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، اسی طرح جس طرح کمزور پودوں کو، صرف اس لئے نہیں کہ ان کا وجود انھیں کے لئے عذاب کا باعث ہے، بلکہ اس لئے کہ وہی دنیا کی اس کشمکش اور خونریزی کی ذمہ دار ہیں۔

مجھے بھلا اس رائے سے کیوں اتفاق ہونے لگا۔ میں نے جواب تو دیا اور ان خیالات کی اتنی ہی زوردار الفاظ میں تردید بھی کی، مگر میں نے دیکھا اس معاملہ میں وہ عقل سلیم سے کام نہیں لینا چاہتی یا نہیں لے سکتی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ہیلن کو اپنا مہمان کیسے بناؤں۔ اگر ہوٹل میں ٹھہراؤں تو خدا جانے اپنے دل میں کیا کہے، اگر اپنے گھر لے جاؤں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ وہاں ایسی خوش مذاق اور امیرانہ مزاج نازنین کے لئے آسائش کے کیا سامان ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میں کرکیٹ اچھا کھیلنے لگا اور پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر اسی کا ہو رہا اور ایک اسکول میں ماسٹر ہوں مگر گھر کی حالت بدستور ہے۔ وہی پرانا اندھیرا بوسیدہ مکان، تنگ گلی میں، وہی پرانی روش، وہی پرانا ڈھچر، اماں تو شاید ہیلن کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیں اور یہاں تک نوبت ہی کیوں آنے لگی ہیلن خود دروازے ہی سے بھاگ جائے گی، کاش آج اپنا مکان ہوتا، آراستہ و پیراستہ، میں اس قابل ہوتا کہ ہیلن کی مہمانداری کر سکتا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی لیکن بے سروسامانی کا برا ہو۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہیلن نے قلی سے اسباب اٹھوایا اور باہر آ کر ایک ٹیکسی بلا لی۔ میرے لئے اس ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے سوا دوسرا چارہ کیا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں اسے اپنے گھر لے جاتا تو اس بے سروسامانی کے باوجود وہ خوش ہوتی۔ ہیلن خوش مذاق ہے مگر نازک دماغ نہیں ہے وہ ہر ایک قسم کی آزمائش اور تجربہ کے لئے تیار رہتی ہے۔ ہیلن شاید آزمائشوں کو اور ناگوار تجربوں کو بلاتی ہے مگر مجھ میں نہ یہ تخیل ہے نہ وہ جرأت۔

اس نے اگر ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا، اس پر کتنی ندامت اور کتنی بیکسی جھلک رہی تھی۔ مگر ظاہرداری کا نباہ تو ضروری تھا، میں نے احتجاج کیا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا، آپ الٹا مجھے ہوٹل لئے جا رہی ہیں۔

اس نے شرارت کے انداز سے کہا۔ اسی لئے کہ آپ میرے قابو سے باہر نہ ہو جائیں، میرے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوتی کہ آپ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤں۔ لیکن محبت حاسد ہوتی ہے یہ آپ کو معلوم ہے، وہاں آپ کے احباب آپ کے وقت کا بڑا حصہ لے لیں گے آپ کو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا اور مرد بالعموم کتنے بے مروت اور زود فراموش ہوتے

ہیں اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر تم مجھے بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے۔

مجھے اپنی اس خوش نصیبی پر حیرت ہی نہیں خواب کا گمان ہونے لگا۔ جس حسینہ کی ایک نظر پر میں اپنے کو قربان کر دیتا وہ یوں مجھ سے اظہارِ محبت کرے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اسی بات پر اس کے قدموں کو پکڑ کر سینے سے لگا لوں اور آنسوؤں سے تر کر دوں۔

ہوٹل میں پہونچے۔ میرا کمرہ الگ تھا، کھانا ہم نے ساتھ کھایا اور تھوڑی دیر تک وہیں ہری ہری گھاس پر ٹہلتے رہے۔ کھلاڑیوں کا کیسے انتخاب کیا جائے یہی مرحلہ تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ساری رات اس کے ساتھ ٹہلتا رہوں۔ لیکن اس نے کہا آپ اب آرام کریں، صبح بہت کام کرنا ہے۔ میں اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہا، مگر ساری رات نیند نہیں آئی۔ ہیلن کا باطن ابھی تک میری نظروں سے چھپا ہوا ہے، ہر لمحہ وہ میرے لئے معمہ ہوتی جا رہی ہے۔

---

۱۲ جنوری۔ آج دن بھر لکھنؤ کے کرکیٹروں کا مجمع رہا، ہیلن شمع تھی اور پروانے اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ یہاں سے میرے علاوہ دو صاحبوں کا کھیل ہیلن کو بہت پسند آیا۔ برجندرا اور صادق، ہیلن انھیں آل انڈیا ٹیم میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں اس فن کے استاد ہیں لیکن انھوں نے جس طرح شروعات کی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرکیٹ کھیلنے نہیں اپنی قسمت کی بازی کھیلنے آئے ہیں۔ ہیلن کس مزاج کی عورت ہے یہ سمجھنا دشوار ہے۔ برجندر مجھ سے زیادہ قبول صورت ہے، یہ مجھے تسلیم ہے، وضع قطع سے پورا صاحب ہے لیکن بالکل شہدا، لوفر، میں نہیں چاہتا کہ ہیلن اس سے کسی قسم کا تعلق رکھے، ادب تو اسے چھو نہیں گیا، بدزبان پرلے سرے کا، بیہودہ، فحش مذاق، گفتگو کا سلیقہ نہیں، محل و موقع کی تمیز نہیں۔ بعض اوقات ہیلن سے ایسے پر معنی کنائے کر جاتا ہے کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ لیکن ہیلن کو شاید اس کا بازاری پن اس کا ابتذال محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ شاید اس کے فحش کنایوں کا مزہ لیتی ہے۔ میں نے اسے کبھی چیں بہ جبیں نہیں دیکھا۔ یہ میں نہیں کہتا کہ شگفتہ طبعی کوئی بری چیز ہے۔ نہ زندہ دلی کا میں دشمن ہوں لیکن ایک لیڈی کے ساتھ تو ادب و قاعدے کا لحاظ رکھنا ہی چاہیئے۔

صادق ایک معزز خاندان کا چراغ ہے، بہت ہی ثقہ، بلکہ سرد مزاج، نہایت مغرور، بظاہر ترش رو لیکن اب وہ بھی شہدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ کل آپ ہیلن کو اپنے اشعار سناتے رہے اور وہ خوش ہوتی رہی۔ مجھے تو ان اشعار میں کوئی مزہ نہ آیا۔ اس سے پہلے میں نے ان حضرت کو کبھی شاعری کرتے نہیں دیکھا، یہ کیفیت کہاں سے پھوٹ پڑی ہے؟ حسن میں اعجاز کی قوت ہے اور کیا کہوں، اتنا بھی نہ

سوچا کہ اُسے اشعار ہی سُنانا ہے تو حسرت یا جگر یا جوش کے کلام کے دو چار شعر یاد کر لیتا، ہیلن سب کا کلام پڑھے بغیر بیٹھی ہے، آپ کو شعر گفتن چہ ضرور۔ مگر یہی بات اُن سے کہہ دوں تو بگڑ جائیں گے۔ سمجھیں گے مجھے رشک آ رہا ہے۔ مجھے کیوں رشک آنے لگا۔ ہیلن کے پرستاروں میں ایک میں بھی ہوں، ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز کرے۔ ہر شخص سے بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔ مگر ہیلن کی نظروں میں سب برابر ہیں، وہ باری باری سے سب سے محترز ہے اور سب سے ملتفت، کس کی جانب زیادہ مائل ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ صادق کی دولت و ثروت سے وہ مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتی کل شام کو ہم لوگ سنیما دیکھنے گئے تھے۔ صادق نے آج غیر معمولی فیاضی دکھائی۔ جیب سے روپے نکال کر سب کے لیے ٹکٹ لینے چلے، میاں صادق جو اس تمول کے باوجود بعض تنگدل واقع ہوئے ہیں، میں تو خسیس کہوں گا۔ ہیلن نے اُن کی فیاضی کو بیدار کر دیا ہے، مگر ہیلن نے انھیں روک لیا اور خود اندر جا کر سب کے لیے ٹکٹ لائی، اور یوں بھی وہ اتنی بے دردی سے روپے خرچ کرتی ہے کہ میاں صادق کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں جب اُن کا ہاتھ جیب میں جاتا ہے، ہیلن کے روپے کاؤنٹر پر جا پہنچتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، میں تو ہیلن کی مزاج شناسی پر فدا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ہماری فرمائشوں کی منتظر رہتی ہے اور اُن کی تعمیل میں اُسے خاص لطف آتا ہے۔ صادق صاحب کو اس نے اپنا البم نذر کر دیا جو یورپ کی نایاب تصاویر کی نقلوں کا مجموعہ ہے۔ اور جو اس نے یورپ کے سارے نگار خانوں میں جا کر خود مرتب کیا ہے۔ اس کی نظر میں کتنی حسن پسند ہیں۔ برجندر جب شام کو اپنا نیا سوٹ پہن کر آیا جو اس نے ابھی سلایا ہے تو ہیلن نے مسکرا کر کہا، چشم بد دور، آج تو تم یوسف ثانی بنے ہوئے ہو۔ برجندر باغ باغ ہو گیا۔ میں نے جب ذرا لحن کے ساتھ اپنی تازہ غزل سُنائی تو وہ ایک ایک شعر پر اُچھل اُچھل پڑی، بلا کی سخن فہم ہے۔ مجھے اپنے ذوقِ سخن پر اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی، مگر جب تحسین صلائے عام ہو جاتی ہے تو اس کی کیا وقعت۔ میاں صادق کو کبھی اپنی وجاہت کا دعویٰ نہیں ہوا۔ معنوی حسن سے آپ جتنے بہرہ ور ہیں حسن ظاہر سے اتنے ہی بے فیض، مگر آج ساغر کے دور میں جونہی ان کی آنکھوں میں سُرخی آئی ہیلن نے والہانہ انداز سے کہا، تمہاری یہ آنکھیں تو جگر کے پار ہوئی جاتی ہیں، اور صادق صاحب اس وقت اس کے قدموں کی جبہ سائی کرتے کرتے رُک گئے، شرم مانع ہوئی۔ ان کی آنکھوں کی اتنی قدر افزائی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مجھے کبھی اپنی وضع قطع کی تعریف سننے کی تمنا نہیں ہوئی۔ میں جو کچھ ہوں جانتا ہوں۔ مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں خوش رُو ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہیلن کے یہ نوازشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ لیکن اب مجھے بھی یہ اضطراب ہونے لگا کہ دیکھوں مجھ پر کیا عنایت ہوتی ہے کوئی بات نہ تھی مگر میں بے چین رہا۔ جب میں شام کو یونی ورسٹی گراؤنڈ سے مشق کر کے آ رہا تھا تو میرے یہ پریشان بال کچھ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے، اس نے گرویدہ نظروں سے دیکھ کر فوراً کہا: تمہاری اس

زلفِ پریشاں پر نثار ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نہال ہو گیا۔ دل میں کیا کیا طوفان اٹھے کہہ نہیں سکتا۔ مگر خدا جانے کیوں ہم تینوں میں سے ایک بھی اس کی کسی ادا یا انداز یا حسن کی الفاظ میں داد نہیں دے پایا۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں موزوں الفاظ نہیں ملتے، جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

یکم فروری۔ ہم دہلی آ گئے۔ اس اثنا میں مراد آباد، نینی تال، دیرہ دون، وغیرہ مقامات کے دورے کئے مگر کہیں کوئی کھلاڑی نہ ملا، علی گڑھ اور دہلی سے کئی اچھے کھلاڑیوں کے ملنے کی امید ہے اسلئے ہمارا قیام یہاں کئی دن رہیگا۔ الیون ہوتے ہی سب لوگ بمبئی آ جائیں گے اور وہاں ایک مہینہ مشق کریں گے مارچ میں آسٹریلین ٹیم یہاں سے رخصت ہوگی، تب تک وہ ہندوستان میں سارے موعودہ میچ کھیل چکی ہوگی۔ ہم اس سے آخری میچ کھیلیں گے اور خدا نے چاہا تو ہندوستان کی ساری شکستوں کی تلافی کر دیں گے۔ جمادق اور برجنا بھی ہمارے ساتھ گھومتے رہے، میں نہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں مگر ہیلن کو شاید عشاق کے مجمع میں لطف آتا ہے۔ ہم سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہیں اور سب ہیلن کے مہمان ہیں۔ اسٹیشن پر پہونچے تو صدہا آدمی ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے۔ کئی عورتیں بھی تھیں لیکن ہیلن کو نہ معلوم کیوں عورتوں سے احتراز ہے، ان کی صحبت سے بھاگتی ہے، خاص کر حسین عورتوں کے سائے سے بھی گریز کرتی ہے۔ حالانکہ اُسے کسی حسینہ سے بدظن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ حسن اس پر ختم نہیں ہو گیا ہے۔ اس میں جاذبیت کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ کوئی حور بھی اس کے مقابلہ میں نہیں کھڑی ہو سکتی۔ نک سک ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ حسنِ مذاق، حسنِ گفتار، حسنِ ادا بھی تو کوئی چیز ہے۔ محبت اس کے دل میں ہے یا نہیں خدا جانے، لیکن محبت کے اظہار میں اُسے یدِ طولیٰ ہے۔ دلجوئی اور ناز برداری کے فن میں ہم جیسے دل داروں کو بھی اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شام کو ہم لوگ نئی دہلی کی سیر کو گئے، پُر فضا مقام ہے، کشادہ سڑکیں، خوبصورت مربعے، دلفریب روشیں، اس کی تعمیر میں سرکار نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے اور بے ضرورت۔ یہ رقم رعایا کی فلاحی تجاویز میں صرف کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ عوام اس کی تعمیر سے جتنے متاثر ہیں اتنے کسی فلاحی تجویز سے نہ ہوتے۔ آپ دس پانچ مدرسے زیادہ کھول دیجئے یا سڑکوں کی مرمت میں، یا زراعتی تحقیقاتوں میں اس روپیہ کو صرف کر دیتے۔ مگر عوام کو تزک واحتشام اور شان وشکوہ سے آج بھی جتنی رغبت ہے اتنی آپ کے تعمیری کاموں سے نہیں ہے۔ فرمانروا کا جو تخیل اس کے وجود کے ذرّے ذرّے میں سرایت کر گیا ہے وہ ابھی صدیوں تک نہ مٹے گا۔ فرمانروا کے لئے شان وشکوہ ضروری ہے، بے دریغ روپیہ خرچ کرنا ضروری ہے، کفایت شعار یا بخیل

فرمانروا چاہے وہ ایک ایک پیسہ رعایا کے فلاح کے لئے خرچ کرے، اتنا مقبول اور ہر دلعزیز نہیں ہو سکتا۔ انگریز تفریحات کے بادشاہ ہیں، انگریز ہی کیوں، ہر ایک قوم جو اپنے زور بازو اور قوت فکر سے یہ درجہ حاصل کیا ہے فطرتاً نفسیات کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر عوام پر اُس کا اقتدار کیونکر حاصل ہوتا خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے اس اندیشہ ہو رہا ہے کہ شاید ہماری ٹیم خواب ہی رہ جائے ابھی سے ہم لوگوں میں کشمکش ہونے لگی ہے۔ برجندر قدم قدم پر میری مخالفت کرتا ہے۔ میں آم کہوں تو وہ یقیناً املی کہے گا۔ اور ہیلین اس کی جانب ملتفت ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے میٹھے خواب دیکھنے لگا تھا، مگر برجندر احسان فراموش خودغرض برجندر میری زندگی تباہ کئے ڈالتا ہے۔ ہم دونوں ہیلین کے منظور نظر نہیں رہ سکتے۔ یہ طے شدہ بات ہے، ایک کو میدان سے ہٹنا پڑے گا۔

---

۷ فروری۔ شکر ہے دہلی میں ہماری کوشش بارآور ہوئی، ہماری ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کا اضافہ ہوا، جعفر، مہرا اور ارجن سنگھ۔ آج ان کے کمال دیکھ کر آسٹریلین کرکٹروں کی دھاک میرے دل سے جاتی رہی۔ تینوں گیند پھینکنے میں جعفر قادر انداز ہے، مہرا میں آرزا اور ارجن شاٹ تینوں مستقل مزاج، نگاہ کے سچے اور انتھک۔ اگر کوئی انصاف سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ ارجن مجھ سے بہتر کھیلتا ہے۔ وہ دوبار انگلینڈ ہو آیا ہے، انگریزی معاشرت سے واقف ہے، اور مزاج شناس بھی اول درجہ کا، تہذیب اور اخلاق کا پُتلا، برجندر کا رنگ پھیکا پڑ گیا، اب ارجن پر خاص نظر عنایت ہے اور ارجن پر فتح پانا میرے لئے آسان نہیں ہے، مجھے تو خوف ہے کہیں وہ میرا رقیب نہ بن جائے۔

---

۲۵ فروری۔ ہماری ٹیم پوری ہو گئی۔ دو پلیئر ہمیں علیگڑھ سے ملے، تین لاہور سے اور ایک اجمیر سے اور کل ہم بمبئی آ گئے۔ ہم نے اجمیر، لاہور اور دہلی میں وہاں کی ٹیموں سے میچ کھیلے اور ان پر بڑی شاندار فتح پائی۔ آج بمبئی کی ہندو ٹیم سے ہمارا مقابلہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ ارجن ہماری ٹیم کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے، اور ہیلین اس کی اتنی خاطر داری کرتی ہے کہ مجھے رشک نہیں آتا۔ اتنی خاطر داری تو مہمان کی ہی کی جا سکتی ہے، مہمان سے کیا خوف۔ لطف یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے کو ہیلین کا منظور نظر سمجھتا ہے اور اس سے ناز برداریاں کرواتا ہے۔ اگر کسی کے سر میں درد ہے تو یہ ہیلین کا فرض ہے کہ اس کی مزاج پرسی کرے۔ اس کے سر میں صندل تک گھس کر لگائے مگر اس کے ساتھ ہی اس کا رعب ہر ایک کے دل پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کوئی اس کے کسی فعل کی تنقید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سب کے سب اس کی مرضی کے غلام ہیں وہ اگر سب کی ناز برداری کرتی ہے تو حکومت بھی ہر ایک پر کرتی ہے۔ شامیانہ میں ایک سے ایک حسین عورتوں کا جمگھٹ ہوتا ہے، مگر

ہیلن کے قیدیوں کی مجال نہیں کہ کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی سکیں۔ ہر ایک کے دل پر ایسا خوف طاری رہتا ہے گویا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ارجن نے ایک مس پر یونہی کچھ نظر ڈالی تھی، ہیلن نے ایسی تیز نگاہ سے اُسے دیکھا کہ سردار صاحب کا رنگ اُڑ گیا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ وہ اس کی تقدیر کی خالق ہے اور اُسے اپنی جانب سے مطمئن کر کے وہ شاید زندہ نہ رہ سکے گا۔ اوروں کی تو میں کیا کہوں، میں نے بھی گویا اپنے کو اُس کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ مجھے تو اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز فنا ہو گئی ہے جو پہلے میرے دل میں حسد کی آگ سی جلا دیا کرتی تھی، ہیلن اب کسی سے بولے ہنسی سے رازو نیاز کی باتیں کرے، مجھے اشتعال نہیں آتا۔ دل پر چوٹ لگتی ضرور ہے، مگر اس کا اظہار تخلیہ میں آنسو بہا کر نے کو جی چاہتا ہے۔ وہ خودداری کہاں غائب ہو گئی نہیں کہہ سکتا۔ ابھی اس کی خفگی سے دل کے ٹکڑے ہو گئے تھے کہ یکایک اس کی ایک نگاہِ غلط انداز نے یا ایک تبسم نے گدگدی پیدا کر دی۔ معلوم نہیں اُس میں وہ کونسی طاقت ہے جو اتنے حوصلہ مند، نوجوان دلوں پر حکومت کر رہی ہے، اُسے جبارت کہوں، مہارت کہوں، یا کیا کہوں، ہم سب جیسے اس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں، ہم میں اپنی کوئی شخصیت، کوئی انفرادیت، کوئی ہستی نہیں ہے، اُس نے اپنے حسن سے، اپنی فراست سے، اپنی دولت سے، اور سب سے زیادہ اپنی ہمہ گیری سے ہمارے دلوں پر تسلط قائم کر لیا ہے۔

یکم مارچ۔ کل آسٹریلین ٹیم سے ہمارا میچ ختم ہو گیا۔ پچاس ہزار سے کم تماشائیوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہم نے پورے اننگس سے شکست دی اور دیوتاؤں کی طرح پجے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دل و جان سے کام کیا اور سبھی یکساں طور پر پھولے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی اہلِ شہر کی جانب سے ہمیں ایک شاندار پارٹی دی گئی، ایسی پارٹی تو شاید وائسرائے کے اعزاز میں نہ دی جاتی ہوگی۔ میں تو تعریفوں اور مبارکبادوں کے بوجھ سے دب گیا۔ میں نے جو الیون رنوں میں پانچ کھلاڑیوں کا صفایا کر دیا تھا۔ مجھے خود اپنی ہلاکت آفرینی پر حیرت ہو رہی تھی، ضرور کوئی غیبی طاقت ہماری پشت پر تھی۔ اس مجمع میں بمبئی کا حسن اپنی پوری شان اور رنگینی کے ساتھ جلوہ افروز تھا اور مجھے دعویٰ ہے کہ حسن کے اعتبار سے یہ شہر جتنا خوش نصیب واقع ہوا ہے، دنیا کا کوئی دوسرا شہر شاید ہی ہو۔ مگر ہیلن اس مجمع میں بھی مرکزِ نگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ ظالم محض حسین نہیں ہے، شیریں بیان بھی ہے، شیریں ادا بھی، سارے نوجوان پروانوں کی طرح اُس پر منڈلا رہے تھے۔ ایک سے ایک قبول صورت، منچلے اور ہیلن ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی، اُسی طرح جیسے وہ ہم لوگوں کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ ہمارا کپتان جیسا شکیل جوان میں نے آج تک نہیں دیکھا، صورت سے رُعب ٹپکتا ہے، ان کے عشق نے کتنے حسینوں کو دیوانہ کیا ہے، کون جانے، مردانہ دلکشی کا جادو سا بکھرتا چلتا ہے۔ ہیلن اُن سے بھی اُسی آزادانہ بے تکلفی

سے ملی جیسے دوسرے ہزاروں نوجوانوں سے، اُن کے حسن کا، اُن کی دولت کا، اس پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔ نہ جانے اتنا غرور، اتنی خودداری اس میں کہاں سے آگئی ہے، کبھی نہیں ڈگمگاتی، کہیں مرعوب نہیں ہوتی کبھی مائل نہیں ہوتی۔ وہی بدلہ سنجی ہے، وہی اظہار محبت، کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں، دل جوئی سب کی مگر اسی استغنا کی شان کے ساتھ۔

ہم لوگ سیر کر کے کوئی دس بجے رات کو ہوٹل پہنچے تو سبھی زندگی کے نئے خواب دیکھ رہے تھے۔ سبھی کے دلوں میں ایک دھکڑ پکڑ سی ہو رہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ امید و بیم نے سبھی کے دلوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا، گویا آج ہر ایک کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے اب کیا پروگرام ہے، اس کی کسی کو خبر نہ تھی، سبھی زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک نے اپنے دل میں سودائے خام پکار رکھا تھا، ہر ایک کو یقین تھا کہ ہیلن کی خصوصی نگاہ اس پر ہے۔ مگر یہ اندیشہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا کہ خدانخواستہ کہیں ہیلن نے بیوفائی کی تو یہ جان ان کے قدموں پر رکھ دیگا۔ یہاں سے زندہ گھر جانا قیامت تھا۔

اُسی وقت ہیلن نے مجھے اپنے کمرہ میں بلا بھیجا، جا کر دیکھتا ہوں تو سبھی کھلاڑی جمع ہیں۔ ہیلن اس وقت اپنی شربتی جلیدار ساڑھی میں آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر رہی تھی، مجھے اس پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس مجمع عام میں مجھے بلا کر قواعد کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو خاص برتاؤ کا مستحق تھا میں بھول رہا تھا کہ شاید اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنے کو خاص برتاؤ کا مستحق سمجھتا ہو۔

ہیلن نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا "دوستو، میں کہہ نہیں سکتی کہ میں آپ لوگوں کی کتنی مشکور ہوں اور آپ نے میری زندگی کی کتنی بڑی آرزو پوری کر دی، آپ میں سے کسی کو مسٹر رتن لال کی یاد آتی ہے؟ رتن لال! اُسے بھی کوئی بھول سکتا ہے، وہ جس نے پہلی بار ہندوستان کی کرکٹ ٹیم کو انگلینڈ کی سرزمین پر اپنے کارہائے نمایاں دکھلانے کا موقع عطا کیا، جس نے لئے لاکھوں روپئے اس مہم کی نذر کئے اور آخر متواتر شکستوں سے مایوس ہو کر وہیں انگلینڈ میں خودکشی کر لی، اس کی وہ صورت اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔"

سب نے کہا "خوب اچھی طرح، ابھی بات ہی کے دن کی ہے۔"

آج اس شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ سال ہم انگلینڈ کا دورہ کریں گے۔ آپ لوگ ابھی سے اس مہم کے لئے تیاری کیجئے، لطف تو جب ہے کہ ہم وہاں ایک میچ بھی نہ ہاریں، متواتر ہمارے ہاتھ میدان رہے۔ دوستو یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کا عمل ہی زندگی ہے۔ ہمیں کامیابی وہیں ہوتی ہے جہاں ہم اپنے پورے جوش سے سرگرم عمل ہوں۔ وہی مقصد ہمارا خواب ہو، ہمارا عشق ہو، ہمارا مرکز حیات ہو، ہم میں اور اس مقصد کے بیچ

میں اور کوئی خواہش، کوئی آرزو حائل نہ ہو۔ معاف کیجئے گا، آپ نے اپنے مقصد کے لئے جینا نہیں سیکھا۔ آپ کے لئے کرکٹ محض ایک شغل، تفریح ہے، آپ کو اس سے عشق نہیں۔ اسی طرح ہمارے صدہا دوست ہیں جن کا دل کہیں اور ہوتا ہے دماغ کہیں اور۔ اور وہ ساری زندگی ناکام رہتے ہیں۔ آپ کے لئے میں زیادہ دلچسپی کی چیز تھی، کرکٹ تو محض مجھے خوش کرنے کا ذریعہ تھا پھر بھی آپ کامیاب ہوئے۔ ملک میں آپ جیسے ہزارہا نوجوان ہیں جو اگر کسی مقصد کی تکمیل کے لئے جینا اور مرنا سیکھ جائیں تو معجزے کر دکھائیں۔ جائیے اور وہ کمال حاصل کیجئے۔ میرا حسن اور میری ذات بازیچہ نفس بننے کے لئے نہیں ہیں۔ نوجوانوں کی آنکھوں کو خوش کرنے اور ان کے دلوں میں سرور پیدا کرنے کے لئے جینا میں شرمناک سمجھتی ہوں۔ حیات کا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔ سچی زندگی وہی ہے جہاں ہم اپنے لئے نہیں، سب کے لئے جیتے ہیں۔"

ہم سب سر جھکائے سنتے رہے اور جھنجلاتے رہے اور ہیلن کمرہ سے نکل کر کار پر جا بیٹھی اس نے اپنی روانگی کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس صحیح ہوں اور ہم صورتِ حال سمجھیں وہ رخصت ہو چکی تھی۔

ہم سب ہفتے بھر تک بمبئی کی گلیوں، ہوٹلوں، بنگلوں کی خاک چھانتے رہے، ہیلن کہیں نہ تھی۔

اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس نے ہماری زندگی کا جو آئیڈیل رکھا وہ ہماری پہونچ سے اونچا ہے۔ ہیلن کے ساتھ ہماری زندگی کا سارا جوش اور ولولہ غائب ہو گیا ہے۔

✣ ✣ ✣

۱۔ خیر خیرات افلاس کو، خوش خلقی بگڑی ہمالت کو، عقل جہالت کو، اور عبادت خوف کو دفع کر دیتی ہے۔
۲۔ خواہش و طمع کے برابر دوسرا کوئی تکلیف دہ مرض نہیں ہے۔
۳۔ خدا رسیدہ شخص کی نظر میں بہشت کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ بہادر آدمی کو اپنی جان تنکے کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنے دل اور اعضا کو قابو میں کر لیا ہو اس کو حسین سے حسین عورت بھی اپنا فریفتہ نہیں کر سکتی، جس کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی اس کے نزدیک کل دنیا ہیچ ہے۔

زمانہ ستمبر ۱۹۰۹ء نصائح جانکیہ

عورتوں کی مضمون نگاری

مسز شفیع احمد قدوائی صاحبہ

"زمانہ" ستمبر ۱۹۲۹ء

کہتے ہیں کہ ایک ستم ظریف کسان جہاں جاتا اپنے گدھے کو ساتھ لے جاتا اور اسے شیر کی کھال پہنا کر دوسروں کے کھیت روندنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگ اسے شیر سمجھ کر اس کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہ کرتے۔ مدتوں مسٹر گدھے دوسروں کے خون پسینہ کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے رہے۔ آخر ایک دن جب وہ حسب عادت چر چگ رہے تھے تو بھرے پیٹ پر اپج کی سوجھی۔ طبیعت نہ مانی اور بلا ارادہ انھوں نے اپنا گیت گانا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا اصلیت کا پتہ لگتے ہی گنواروں نے جی بھر کر خاطر تواضع کی۔ اس کہانی کو تھوڑی سی مشابہت عورتوں کی جرنلزم سے بھی ہے۔ کیونکہ مدتوں تک ہماری جرنلزم کا گدھا شیر کی کھال پہنے ادب، تاریخ، سیاست، سب کے کھیتوں کو روندتا رہا اور آخر کار ملک پر انقلاب کا رنگ چڑھتے ہی ڈھول کا پول کھل گیا۔ آج خود ہم کو بھی پتہ لگ گیا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں ویسے لکھنے پڑھنے کا شوق تو بہت دنوں سے پیدا ہو گیا تھا اور جب سے یہ اکا دکا رسالے عورتوں کے نام سے چھپنے لگے تب سے اور بھی جی میں امنگ پیدا ہوئی کہ لاؤ اپنا مت بعید بھی سنائیں۔ میں جانتی ہوں وہ شاید شروع ہی کے دن تھے، جب اکبر الہ آبادی نے جل کر کہا تھا ؎

شوق تحریر مضامین میں کھلی جاتی ہیں — بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

عورتیں بیچاریاں ذرا اسی بہلانے پڑھے لکھے لوگوں میں شامل ہو جایا کرتی تھیں۔ ادب اور تاریخ سے انجان رہ کر مصنف لوگوں کی فہرست میں چھپ جانے کے لیے چڑے چڑیا کی کہانی کافی ہو جایا کرتی تھی لیکن خدا مردوں کا بھلا کرے، اس میں بھی وہ آن کودے۔ کبھی میاں بیوی کا برقعہ اوڑھ کر، کبھی بھائی بہن کے نام سے اور اکثر یہ کالج کے لڑکے اپنے کو عورتوں کی نظر میں بچانے کے لیے بڑے مضمون نگار بن بیٹھے۔ ایڈیٹر ایک دو کو چھوڑ رسالے کے سارے مرد تھے، وہ اپنا من مانا لکھواتے اور چھپواتے۔ ہر رسالہ کے سرورق پر عورتوں اور بچوں کے لیے لکھا رہتا تھا کیونکہ ان عقلمند لوگوں کے نزدیک سمجھ بوجھ میں عورت اور بچہ برابر تھا۔ بچاری عورتوں کو سکھایا بھی یہی جاتا تھا کہ قصہ لکھو یا نظم، سب کو بیٹ پاٹ کر "راہ نجات" یا "بہشتی زیور" بنا دو۔ اکیلے گھر والے یہ دھونس جماتے تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ اخبار رسالے والے بھی جان مارے رہتے تھے کہ جو لکھو راہ نجات کے ڈھب پر

نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چودہ برس کی لڑکی بوا بن کر رہ گئی۔ بڑی بوڑھیوں کی طرح نصیحت کرنے کا ایسا شوق بڑھا کہ تحریر دیکھ کر اس بات کا پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ ہمارے آپ کے سامنے منی چھوکری بول رہی ہے یا خاندان بھر کی نانی دادی۔ باوا آدم کے وقت کی باتیں کرنے کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ قلم ہاتھ میں لیا اور ساری ماؤں بہنوں کو جنت کا سیدھا راستہ بتا دیا۔ خیر اللہ کا شکر ہے، تھوڑے ہی دن بیتے تھے کہ ملک کا رنگ بدل گیا۔ عورتوں کی جو قوم بھی آسمان سے اتر کر زمین پر آئی۔ اس دور میں وعظ بیان کرنے کا شوق تو کم ہو گیا لیکن نہ پڑھائی پوری تھی نہ فیشن۔ اس لیے سب آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گیا۔ افسانے بھی لکھے گئے، نظمیں بھی ہوئیں اور غزل بھی۔ تاریخ، سیاست، خانہ داری، دلچسپی تو سب چیزوں سے پیدا ہو گئی۔ لیکن افسانہ لکھا تو ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری کی نقل کی۔ مضمون میں سید ممتاز علی یا حسن نظامی کا خاکہ اڑایا، اور غزل گائی تو داغ یا امیر مینائی کی دھن میں، سیاست سے دلچسپی صرف جلسوں میں رائے زنی کرنے یا تقریر کرنے والوں کی تعریف تک محدود رہی۔

فیشن کا اثر افسانوں پر بہت پڑا۔ کبھی بی جی یا ڈرائنگ روم میں پیاری ساڑی باندھے بیٹھی نظر آئیں اور چھڑے صاحب ہاتھ روم سے سوٹ ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔ ادب تمیز کے ساتھ اپنی ڈارلنگ سے بھونڈی بھونڈی دو چار باتیں کیں اور موٹر پر سوار ہو دونوں ہوا خوری کو نکل گئے۔ دکھ بھری کہانیوں کی حد نہ رہی، جہاں دیکھو کسی نہ کسی عقل کے اندھے، گانٹھ کے پورے شوہر پر بیوی صدقہ قربان ہو رہی ہے۔ کبھی اس کے قدموں پر آقا اور مالک کہتی ہوئی لوٹتی نظر آئی۔ یہاں سے لے کر ساس سسر تک کی جوتیاں کھا کر گھر سے نکل گئی اور قبر میں منہ چھپا کر سو رہی، یہ ہوئے افسانے۔ ان میں اکثر کوئی دل جلی ہارمونیم پر گاتی نظر آئی اور انگریز عورتوں نے تحسین ناشناس سے ہندوستانی گانوں کی عزت بڑھائی۔ شعر اور افسانہ دونوں کو عورتوں نے جی بھر کر رگڑا۔ ابا کی شان میں قصیدے لکھے گئے۔ ننھی بٹیا اور ننھے بھیا کے لیے جھولنا گیا رہا۔ اطاعت اور عصمت کا راگ الاپا گیا۔ کبھی بہنوں سے خطاب ہوا ؎

بہنوں پیاری تمھیں اللہ جلائے تھوڑا ۔۔۔ کبھی بہکائے نہ شیطان ستائے تھوڑا
ساتھ شوہر کے رہو بن کے پہاڑی ناگن ۔۔۔ نکلو باہر تو ذرا آنکھ جھکائے تھوڑا
بیوی اچھی ہے وہی ہاتھ ہوں جس کے انجی ۔۔۔ پیر پہیے ہوں مگر بین بجائے تھوڑا

کبھی عشق پر غزل لکھی

نیلگوں ہے فلک جام میں فردوس خیال ۔۔۔ گردش مے ہے بساط فلک انجم افروز
صانع حسن ازل جذب محبت ماسوا ۔۔۔ قدرت محبوب حق آغوش داماں ہوا

غرض یہ ساری چیزیں بلا ردیف اور قافیہ، معنی اور مطلب کے نظم کر ڈالیں۔ کبھی گھریلو زندگی کی برائیاں کیں تو کبھی اپنی بے بسی کا رونا رویا۔ بزموں اور محفلوں کے بہانے دنیا پر ثابت کر دیا کہ ؏

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی کے پیارے مولوی صاحب کا کولھا اتر گیا اور دوا علاج کا بوجھ یا جزو نویدی کی چھان بین ادبی مذاق رکھنے والی بہنوں کے سپرد کی گئی۔ کسی بہن نے اپنے بہرے پن اور میاں کے خبط کی دوا القابات صفت بہنوں سے پوچھ ڈالی۔ درزی سے لے کر لوہار اور سنار تک کی دوکانوں کا پتہ پوچھا۔ بھانجی بھتیجی کی شادی یا بہن بہنوئی کے نتیجہ حماقت کے لیے تاریخی نام اور قطعوں کی فرمائش کر دی۔ غرض ان دنوں عورتوں کی جرنلزم ایک ایسا اونٹ تھی جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی) اور سب پر طرہ وہ نقالی والا کوبڑ تھا۔ اعتراض کرنے کو تو سب ہی کرتے ہیں اور میں بھی کہتی ہوں لیکن انصاف سے دیکھیے تو آخر پھر کیا لکھتیں۔ انھوں نے دیکھا کیا تھا۔ اونچی اونچی دیواروں والا جیل نما مکان۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر چھالیہ کترنے والی سست عورتیں اور بدتمیز لڑاکو نوکر۔ یہ تھا ان کا تجربہ اور ان کا ماحول۔ کہتے ہیں افسانہ زندگی کی سچائیاں دکھاتا ہے اور شاعری دماغی خیالات کی جھلکتی آنکھ ہے۔ جو کچھ ہو، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن یہاں تو عورتوں کے رسالے خالی پیٹ، پیٹ رہے تھے۔ آخر ان کو بھرنا بھی تھا اب اس کے لیے عاشق ہونے تو ان جاتا اور دنیا دیکھنے کی کسے اجازت ملتی۔ الٹکل پچو جو جی میں آیا لکھ مارا۔ جب سے پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی ہے تھوڑی بہت جرنلزم بھی اونچی ہو رہی ہے۔ دو چار سچ مچ کی شاعرہ اور چند اچھے بھلے قصے لکھنے والیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ ذرا بیچ میں اردو کچھ من اتری ہو گئی تھی۔ انگریزی کا بڑا زور تھا۔ سو اب تو اس کا غرور ڈھے گیا ہے۔ اب تو رسالوں میں گاندھی جی کی سیاست اور ٹیگور کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ فلسفہ جسے "اپنا لکھا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا جب قومی لیڈر رہنے کا گر تعلیم نسواں اور ہندوستانیوں کے حق حقوق پر لڑنے جھگڑنے تک محدود تھا۔ لیکن اب تو ایسا زمانہ بدلا ہے جن کے خیالی عورت کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، تعلیم یافتہ لڑکیوں کو دیکھ کر منہ بناتے، فیشن ایبل بیویوں میں کیڑے ڈالتے اور سیاست داں بیوی پر آوازے کستے ہیں۔ اللہ جانے یہ کیوں کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ خیر یہ تو بات میں بات نکل آئی ہے ہاں تو ہوا یہ کہ عورت آگے تو بڑھی، تقریریں کرتی، مضمون لکھتی اور افسانوں کے پلاٹ سوچتی ہوئی، لیکن سوجھ بوجھ، اپج، جیالے پن کو دھکے دیتی ہوئی یہاں تک آئی۔ سیکھنے سمجھنے کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے مگر یہاں کون ایسا بیٹھا تھا جو ٹھنڈے دل سے سوچتا کہ لڑکیوں کو الگ بیٹھ کر سکھاؤ پڑھاؤ اور بڑی عورتوں جدا بیٹھ کر خوش گپیاں اڑائیں۔ یہاں تو جدھر دیکھو وہی اصلاح والا ڈھونگ رچا ہوا ہے حالانکہ اصلاحی شاعری، اصلاحی افسانوں اور اصلاحی مضامین وہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جنھیں برسوں گزرے مردوں نے اپنے دسترخوان سے جھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ کیا غضب ہے کہ آج تک عورتیں ان پر ندیدوں کی طرح ٹوٹی پڑتی ہیں۔

ویسے رنگ تو بہت بدل گیا ہے اور ادھر دو برس سے ذرا ملک کی جوتی پیزار نے ان کے کان کھڑے کر دیے ہیں، اس لیے اب ہوا میں قلعہ بنانا کم ہوتا جا رہا ہے لیکن کہاں تک؟ ملک تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ اقبال کی حجازی مے کو جوش اور ساغر کے ساز سے ہندوستانی راگ بن کر

نکلے بہت دن ہو چکے۔ لیکن عورتیں ابھی لکیر ہی پیٹ رہی ہیں۔ اور وہاں ترقی پسندوں کا غول بھوک بھوک کر چلاتا ہوا بڑھا چلا آ رہا ہے۔ نوجوان انقلابی کھرپا اور کلہاڑا لیے جھاڑیوں کانٹوں سے میدان صاف کرتے آ رہے ہیں۔ ان کی لکڑ توڑ شاعری میں نہ مے ہے نہ معشوق۔ ان کے یہاں محبوب "چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے" نہیں آتا ہے بلکہ میلی پگیا سر پر جمائے، گاڑھے کی مرزئی پہنے، سر پہ گارے کا ٹوکرا رکھے مزدور "مرے جا رہے ہیں" "بڑھے جا رہے ہیں" کہتا ہوا نازل ہوتا ہے۔ اب ساقی کی صراحی، شراب ارغوانی کے بدلے خون اگلتی ہے اور دھان من موہنی کی جگہ دیہات کی ٹھوس گنواری لہنگا پھڑکاتی، چوڑیاں بجاتی غصہ میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی، امیروں کو اُپلے کی طرح پاتھ ڈالتے تشریف لاتی ہے۔ ابھی کیا، تھوڑے دن میں دیکھیے گا۔ کون کہہ سکتا ہے دس ہی پانچ برس کے اندر یہ چنگاری سچ مچ انگارے نہ اگلنے لگے گی۔ غرض ملک میں تو یہ کچھ ہو رہا ہے۔ انقلاب کی پکار ہو رہی ہے۔ نئے ادب کا پرچم لہرایا جا رہا ہے اور یہاں غزل جو مسلمانوں کی بگڑی تقدیر کی نشانی اور کاہلی کی پوٹ بن کر ورثہ میں ملی تھی۔ نئے سرے سے پھر گھروں کے اندر جنم لے رہی ہے۔

ذرا اس ستم ظریفی کو دیکھیے؛ عورتیں غزل کہتی ہیں وہ بھی پردہ نشین۔ جن پر پوری جوان بھی نہیں ہونے پاتیں کہ ایک مرد ماں باپ کی رضامندی سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ لو اسے پوجو اور محبت کرو! پیاری پیاری گڑیا سی لڑکی پورے چھ فٹ لانبے دیودار سے باندھ دی جاتی ہے، یا فنون لطیفہ سے ذوق رکھنے والے نوجوان کے سر کالی کلوٹی ہتنی جیسی بیوی مڑھ دی جاتی ہے، یہ ہے یہاں کا دستور! اب آپ ہی بتائیے اس میں جذبات کہاں سے پیدا ہوں اور عشق کس سے لڑایا جائے۔ مجھے تو اسی میں شک ہے کہ کیا عورت غزل کہہ بھی سکتی ہے؟

کہتے ہیں عورت فطرت کا راز ہے، انسانیت کی ایک پہیلی ہے جسے بوجھنا ہر مرد کے لیے یہ سچ ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس میں تو شبہ نہیں کہ وہ اپنی محبت، اپنے جذبات یا خواہش کا بے دھڑک اظہار نہیں کر پاتی۔ آپ کسی جاہل عورت کو دیکھیے جب وہ لڑنے یا تقریر کرنے پر آتی ہے تو گھنٹوں بے تکان بولتی چلی جاتی ہے نہ اس وقت اس کے پاس مثلوں کی کمی ہوتی ہے نہ محاوروں کی۔ لیکن جب وہ پیار کی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی ہے تو الفاظ حلق میں اٹک اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی طرح اشاروں سے، کچھ آنسوؤں سے کچھ نگاہوں سے مدد لیے بغیر اپنا مطلب ادا ہی نہیں کر پاتی۔ نظر لاکھ پیام محبت دے لیکن اس پیام کو ڈگی پٹوا کر سب کو سنانا عورت کے بس کی بات نہیں۔ جوانی لاکھ دیوانی ہو لیکن بھرے مجمع میں ہرگز نہیں کہہ سکتی ع

لو ان کی جوانی آ پہونچی، اب کیسے بچیں گے دل و جگر

عورت بے بس ہو کر آنسو بہاتی ہے لیکن زندان سے دیوانی ہو کر اک دم صحرا کی طرف نہیں بھاگتی نہ دفتر

ناکامی کو عنوانِ تمنا بنا کر مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے جو وہ پھٹ سے کہہ دیں ؎
میں نے کہا کہ غیر کا کہنا نہ کیجیے بولے وہ بیچ میں مرے بولا نہ کیجیے
جب دل پر چوٹ ہی نہیں تو درد بھرے راگ نکلیں گے کہاں سے؟ اور پھر غزل تو تری مردوں کی رام کہانی اور ساری الجھن کی بپتا ہوتی ہے۔ بھلا عورت اس میں کہاں سما جائے گی؟ نہ معلوم اُسے دربان کی گالیاں کھانے اور لیلیٰ کا کتا بننے کا کیا شوق چرایا ہے؟ رہا عشقِ حقیقی سو میاں کی پانوں کی ڈبیہ اور میاں کا پیٹ بھرنے سے اتنی چھٹی کہاں؟ جو دو گھڑی آنکھیں موند اپنی آتما اونچی کر لیں۔ ہاں لغت اور دیوان کی مدد سے لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بن سکتا ہے، اسے غزل یا بقول برنارڈ شاہ اگر یورپ نیم دیوانوں کا ملک ہے تو ہندوستان کے مکمل دیوانوں کی بستی ہونے میں کوئی شک ہی نہیں یہاں غزل عورت کہتی ہے اور گیت مرد بناتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو مردوں کی بے ہوئی بپتا اور بن آئی موت کی داستاں سنتے سنتے ملک کا پہلے ہی سے برا حال ہو چکا ہے بھلا اسے عورتوں کی زبان سے سیاپا سننے کی کیا ضرورت آ پڑی ہے؟

غرض جب ہماری اندھی سیدھی جرنلزم کا اب تک یہ حال ہو کہ کسی نہ کسی شہسوار کی گرد راہ سے اپنی منزل کا پتہ پوچھتی ہی رہی ہوں تو نئے ادب کا استقبال کون کرے اور کس کو پہچان ہے کہ پرانا ادب کون سی بلا تھی اور نیا ادب ہے کس چڑیا کا نام؟

سب کچھ جلی کٹی کہہ لینے کے بعد ذرا اپنی صفائی تو پیش کر لینے دیجیے۔ ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اگر عورت کو پھانسی پانے کا حق ہے تو اسے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی حق ہے۔ پھر جب یہ دونوں حق آپ کو حاصل ہیں، تو مجھے اپنے جی کی بات کہنے کا کیوں نہ حق حاصل ہو؟ اگر آپ پھر ایسی گفتگو میں سننا چاہیں تو ذرا ناپ تول کر بات کہا کیجیے اور قلم سنبھال کر لکھا کیجیے۔ تاکہ اپنوں کا جی خوش ہوا اور پرایوں میں ناک اونچی رہے!

⁂ ⁂ ⁂

نذر

لڑکے نے کہا "ابا مجھے کیا دیجیے گا؟" میں نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ دوست نے کہا "مجھے کیا عنایت ہوگا؟" میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ بھائی نے کہا "مجھے کیا ملے گا؟" میں نے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ماں نے کہا "بیٹا مجھے کیا دو گے؟" میں نے جھک کر اس کے قدم چوم لیے۔ بیوی بولی "آخر میرا حصہ؟" میں نے محبت سے اس کا بوسہ لے لیا۔ اتنے میں ایک آواز آئی "میرے لیے بھی تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟" یہ سن کر میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے!

ٹیگور

اردو ادب پر طوائفوں کا اثر

پنڈت آنند نرائن ملّاؔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
زمانہ فروری ۱۹۴۲ء

گزشتہ دور کے حالات اور واقعات تو تاریخ سے بخوبی معلوم ہوجاتے ہیں لیکن وہ واقعات کیوں رونما ہوئے۔ اور وہ کون سی باتیں تھیں جو پس پردہ ان واقعات کی ذمہ دار تھیں، اس کے لیے تاریخ کے صفحات کافی نہیں ہوتے، اور ہمیں اس دور کے تمدن اور معاشرت کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے اس زمانہ کے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور اگر ایک دور کا ادب بغور دیکھا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کے احساسات اور خیالات، ان کی رسوم اور عقیدے، ان کے ذہنی اور جذباتی رجحانات، سب کا عکس اور تصویر صاف اور نمایاں نظر آتی ہے کیونکہ ادب کے لیے ناممکن ہے کہ وہ زندگی سے متاثر نہ ہو۔ کسی شاعر اور ادیب کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ ہوجائے۔ اس لیے یہ سمجھنے کے لیے کہ اردو ادب پر طوائفوں نے کیا اثر ڈالا، ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری معاشرت میں طوائفوں کی کیا جگہ تھی۔

قدرت نے جہاں عورت کو جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور بنایا ہے، وہاں اسے حیات کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک فوقیت بھی دی ہے۔ وہ اپنے جسم ہی کو ذریعۂ معاش بنا سکتی ہے، اور جہد زیست کی بازی میں اسے داؤں پر لگا سکتی ہے۔ عورت کا اولین پیشہ یہی تھا اور آج بھی جبکہ عورت مرد کے بہت کچھ ہمدوش آگئی ہے، اس کے لیے زیست کی مشکلوں کو آسان بنانے کا اس سے بہتر دوسرا طریقہ نہیں۔ مختلف ملکوں میں اس جسم فروشی کے طریقے مختلف ہیں، اور مختلف مذہبوں نے مختلف رسموں کے حسین لباس پہنا کر اور شادی کا پاک اور مقدس نام دے کر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر ملک میں آج بھی بکثرت ایسی عورتیں ہیں جو بغیر کوئی حسین نقاب پہنے ہوئے بالاعلان اپنا اولین پیشہ کرتی ہیں۔ اکثر ملکوں کے چھوٹے اور مذہبی تمدن نے انھیں معاشرت کا جزو قبول کرنے سے

گریز کیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت کی معاشرت میں اُن کی ایک اہم اور مستقل جگہ تھی۔

انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اُس حصہ میں جہاں اردو رائج تھی مسلمانوں کا راج تھا۔ دہلی میں شاہانِ مغلیہ تھے اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ۔ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ تھی۔ کیونکہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگذار اور نمک خوار تھے ایسی صورت میں جبکہ شاہی خزانے بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس باپ دادوں کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی شہزادوں رئیسوں اور امیروں کا عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوائے دوسرا کام نہ تھا۔ ان زندگی سامانِ نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں اسبابِ نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جس وجہ سے کہ وہ ہماری معاشرت پر چھائی ہوئی تھیں اس کی وجہ محض امرا کی عیاش مزاجی نہ تھی بلکہ پردہ کی رسم۔

پردہ ہندو اور مسلمان دونوں میں نہایت سختی سے رائج تھا۔ کسی رئیس شریف زادے کو اپنی ماں اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو جو کہ خادمہ یا نیچ قوم نہ ہو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی شادی حالانکہ صغیر سنی میں ہو جاتی تھی لیکن اس میں اس کی پسند کا کوئی سوال نہ تھا، کیونکہ شادی کے بعد ہی بیوی کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ شادی دراصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لیے کی جاتی تھی نہ کہ دو دلوں کا تقاضہ پورا کرنے کے لیے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کرنے والے افراد کی طبیعت سن اخلاق یا رجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بھی بیوی سے اختلاط برتنے کی اجازت نہ تھی، بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس کر بول سکے بیوی کی قدم قدم پر نند اور بھاوجیں پاسبانی کرتی تھیں۔ اور اگر اُس نے اشارةً یا کنایتاً خاوند سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بے حیا قرار دی جاتی تھی۔ گویا ہماری معاشرت میں خاوند بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہارِ محبت کرنا برا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو جوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے محبت کا کوئی مناسب تقاضا کر سکتا تھا اور نہ ایک رسم کی پابند اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے اور نہ مذہب قید کر سکتا ہے بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر عشق انسان کی فطرت کا سب میں زبردست تقاضا ہے۔ کسی تندرست نوجوان کو محض ایک روحانی ہم آہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی۔ ہماری سماج کا خلاف فطرت دباؤ صرف یہاں تک کامیاب ہوا کہ اُس نے عشق و محبت کے جنسی لوازمات کو گھروں سے نکال دیا۔ اس

نے بازاروں میں نشوونما پائی۔ بیویوں نے رفتہ رفتہ ان باتوں کو جن سے جنسی خواہشات مشتعل ہوتی ہیں ترک کر دیا۔ انہوں نے کوشش کی کہ وہ دیویاں بن جائیں، وہ مورتیں اپنے بارے میں لکھنے لگیں۔

عشق کا حال بیسوا جانیں ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ہمارے اکثر نوجوان شریف زادوں کے دل پر بجلی بجلی ایک طوائف سے آنکھیں چار کرنے کے بعد گری۔ ان کے جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش میں آنکھیں کھولیں بیوی محض خاندان چلانے کا ذریعہ رہ گئی، لیکن ان کی جذباتی دنیا کی مالک طوائف بن گئی۔

عشق و محبت کا جو تعلق شاعری اور ادب سے ہے وہ ظاہر ہے خصوصاً ایسے دور میں جبکہ شاعری صرف نشاط اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہی طوائف جو ہماری معاشرت میں ہمارے عشقیہ جذبات کی تنہا مالک بن چکی تھی۔ ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی۔ اگر آپ غور سے ادب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے افسانوں، مثنویوں اور غزلوں کے معشوق میں طوائف کا کردار اور اس کے خدوخال بخوبی نمایاں ہیں، معشوق کا ہرجائی پن اور بے وفائی رقیبوں کا ہجوم، کبھی ظلم و ستم، کبھی لگاوٹ کی باتیں، شوخی اور طراری ناز اور غمزے، یہ ہو بہو ایک طوائف کی تصویر آنکھ کے سامنے لے آتا ہے، اکثر شاعر اور ادیب جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس میں اسی معاشرت کا خاکہ نظر آتا ہے، آج کل کے پڑھنے والے اُن کے کلام پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مبتذل رکیک اور مخرب اخلاق ہے۔ لیکن وہ اپنی نظر کافی دور تک نہیں لے جاتے، کیونکہ یہ قصور شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے بلکہ اس دور کی معاشرت کا ہے جس کے وہ سچے نمایندے تھے۔

طوائفوں کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ادب پر ایک اثر اور بھی پڑا۔ طوائف ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور عورت ہوتی ہے۔ اُس سے پاک محبت کی امید کرنا حماقت ہے۔ ایسی حالت میں محبت پر ہوس پرستی کا غالب آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ادب میں جس محبت کا ذکر ہے اس میں جنسی ترغیب روحانیت پر چھائی ہوئی ہے۔ محبت کی وہ رفعتیں جہاں دو دل ایک ذہنی اور جذباتی آویزش کی وجہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے نغمے ہمارے ادب میں سنائی نہیں دیتے۔ ہماری عشقیہ شاعری زیادہ تر معاملہ بندی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے کی ساری کائنات عشقیہ شاعری ہی ہے لہٰذا ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نہیں ملتے جن کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔

طوائفیں معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھ گئی تھیں کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو پانے کے لیے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہیں بلکہ اس میں تہذیب، خوش سلیقگی، شیریں بیانی حسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے جملہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے لہٰذا ان کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردوں کے لیے محض سامان عشق ہی نہ ہوں بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کریں اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لیے انھیں اپنی تعلیم و تربیت کا بھی کافی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مرزا محمد ہادی رسوا صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب "امراؤ جان ادا" میں جو کہ طوائف کی سچی سوانح عمری کہی جاتی ہے ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں۔ رقص اور موسیقی میں تو وہ اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ اس فن کو انھوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہونا لازمی تھا۔ بعض طوائفیں اس زمانے کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ پوشاک میں بھی تراش خراش یہی نکالتی تھیں اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھیں۔ خاص خاص طوائفوں تک تو ایسے ویسے آدمی کی رسائی آسان نہ تھی۔ جس طرح کہ بڑے امرا کے لڑکے اپنی تعلیم پر جلا دینے کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں کے لیے بھیجے جاتے تھے اسی طرح ہمارے رئیس زادے آداب محفل سیکھنے کے لیے کسی مشہور طوائف کے سپرد کیے جاتے تھے۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا ادارہ تھا۔ خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ رئیسوں کے لیے جہاں شان ریاست برقرار رکھنے کے لیے گھوڑے گاڑی مصاحب وغیرہ ضروری تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی۔ اس معاشرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں تصنع اور تکلف حد سے زیادہ دخیل ہو گیا جس سے ادب بھی ایک "طوائف" بن کر رہ گیا۔ وہی ظاہری حسن، وہی آرائش اور نمائش، وہی حسین لباس، لیکن فطری جذبات کی وہی کمی۔ ہمارے اشعار کے الفاظ "حسین"، جملے چست اور بندشیں دلکش لیکن مصنوعی جذبات کے حامل اور بے روح۔

طوائفوں نے ہمارے چند مخصوص اصناف سخن کو رائج اور مقبول بنانے میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ گزشتہ زمانے میں نہ تو اتنے تعلیم یافتہ لوگ تھے اور نہ اتنے اخبار اور رسالے، نہ ماکیز تھیں اور نہ ریڈیو شعرا کی شہرت کا دار و مدار صرف مشاعروں کی کامیابی پر یا کسی مشہور خوش گلو طوائف کا ان کی غزل کسی صاحب ذوق شہزادہ یا رئیس کی محفل میں گا دینے پر تھا۔ شاعر اپنی معراج شہرت اور حاصل زندگی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شہزادوں کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ عمر بھر روٹیوں کا سہارا ہو جائے نسیم لکھنوی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ شاہ اودھ کے دربار میں ایک طوائف ان کی غزل جس کا مطلع ہے :-

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی　　　کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

گا رہی تھی۔ بادشاہ سن کر بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ یہ نسیم کون ہیں، اور اس طرح نسیم کا دربار اودھ میں پہلے پہل غائبانہ تعارف ہوا۔ ایسی صورت میں وہ اصناف سخن جن کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا زائد رائج اور مقبول ہوگئیں۔ غزل کا اور اصناف سخن سے مقبولیت میں اس قدر زیادہ بڑھ جانے کا بڑی حد تک راز یہی ہے کہ وہ گانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی، اسی طرح شاہان اودھ کے زمانے میں مرثیوں کے فروغ پانے میں طوائفوں کی سوز خوانی کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔

گو اس کی اصل وجہ شاہان اودھ اور ان کے درباریوں کا امامیہ مذہب تھا، لیکن خاص اصناف سخن جو اس معاشرت سے ظہور پذیر ہوئی ریختی ہے۔ ریختی دراصل ایک طوائف کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور غالباً ایک طوائف اور تماش بین کے تعلقات ہی اس صنف سخن کے اتحاد کے محرک ہوئے۔ اکثر مصوروں نے تصویروں کے ذریعہ سے راگ اور راگنیوں کے روپ اور بھاؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دور گذشتہ کے اردو ادب کے روپ اور بھاؤ کو جب ہم تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ہماری نظر کے سامنے ایک نیم برہنہ حسینہ کی تصویر آتی ہے۔ جو خوبصورت پوشاک اور زیور سے لدی ہوئی ہے اور گت پر ناچ رہی ہے جس کے گرد تماش بینوں کا ہجوم ہے، جس کی زبان پر مصنوعی عشقیہ بول ہیں، جن کو باری باری سے ہر تماش بین کو وہ بھاؤ کے ساتھ بتا رہی ہے۔ جس کی نظر میں ہر ایک کے لیے ایک پیام ہے جو ان کی آتش ہوس کو بھڑکا رہا ہے۔ لیکن جس کے ہونٹوں پر ایک خفیف طنز آمیز تبسم ہے کیونکہ اس کا دل سرد ہو چکا ہے، اور اس میں کسی فطری جذبہ کی چنگاری کے مشتعل ہونے کی صلاحیت نہیں۔

شعر کیا ہے

بقول لارڈ میکالے یہ ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی، اور ناٹک سے متشابہ ہے مگر یہ سب اظہار مطلب میں عاجز ہے۔ ایک اور محقق کا قول ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر متاثر ہو وہ شعر ہے۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ ہندی محققین کا قول ہے کہ رعایات لفظی اور محاسن معنوی کا نام شعر ہے میرا خیال یہ ہے کہ کبھی چیزوں میں قیود کے لگنے سے ایک دلفریبی آجاتی ہے، جیسے پانی کو صدف کی قید ہوتی۔ خون کو نافِ آہو کی قید مشک بنا دیتی ہے اسی طرح الفاظ۔ وزن اور بحر کی قید میں آکر ایک دلفریب شکل اختیار کر لینے میں اور جب اس میں تاثیر کی روح دوڑ جاتی ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

زمانہ اپریل ۱۹۳۳ء کلیم اعظم گڈھی

گلدستۂ نظم

رفتار زمانہ

زمانہ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء

اکبر الہ آبادی

فلک کے سامنے کیا مذہبی بہانہ چلے
چلیں گے ہم بھی اسی رخ جدھر زمانہ چلے

میں جانتا ہوں نہ چھوڑیں گے آپ چال اپنی
کسی کا کام چلے اے حضور یا نہ چلے

خدا کے واسطے ساقی یہی نگاہ کرم
چلا ہے دور تو پھر کیوں رکے چلا نہ چلے

کھلا ہے باغ قناعت میں غنچۂ خاطر
خدا بچائے تمہیں حرص کی ہوا نہ چلے

نصیب ہو نہ سکی دولت قدم بوسی
ادب سے چوم کے حضرت کا آستانہ چلے

فروغ عشق کا بے آہ کے نہیں ممکن
نہ پھیلے بوئے گلستاں اگر ہوا نہ چلے

خودی کے حس سے بھی ہوتا نہ آشنا اکبر
کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

گھر سے جب نکلیں گی لکھ پڑھ کر کنواری لڑکیاں
دلکش و آزاد و خوش رو ساختہ پرداختہ

یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ

مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے
ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ

ڈال دے گا سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو آختہ

مالوی کا مال کچھ اور مولوی کا مول کچھ
کہتے ہیں بازار میں اکبر سے تو بول کچھ

بولا وہ دنیا کا فقط اک کھیل ہے
عمدگی ہے مال میں اور مول میں جب میل ہے

دل بھی کانپا، ہونٹ تھرائے، شرمایا بھی خوب
شیخ کو لیکن تری محفل میں پینا ہی پڑا

جب کہا میں نے بھلا دو غیر کو، ہنس کر کہا
یاد پھر مجھ کو دلانا بھول جانے کے لئے

فرش نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر؟ یہ خوب کہی

ہزار سائنس رنگ بدلے ہزار قانون ہم بنائیں
خدا کی قدرت یہی رہے گی، ہماری حیرت یہی رہے گی

ہمارا دیس — علامہ اقبال

یہ مشہور قومی ترانہ سب سے پہلے زمانہ ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء
کے پرچہ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت اشعار ذیل سے تھے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پنجاب[1] کیا دکن کیا، بنگال و بمبئی کیا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

اقبال اکبر کے رنگ میں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ایک وید منتر کا ترجمہ

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو — احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو
روشن مرے سینہ میں محبت کا شرر ہو — دل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو
پہلو میں مرے دل ہو مے آشام محبت — ہر شے ہو مرے واسطے پیغام محبت

---

[1] یہ اسی وقت ترمیم ہو گیا تھا۔ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

گلاب

نوبت رائے نظر

اے گلابِ روح پرور! اے شہِ گلہائے باغ قید ہستی میں کہاں ممکن مجھے تجھ سا فراغ
شب کو تو روشن میانِ باغ ہے مثلِ چراغ اور دن کو ہے مئے گلرنگ کا لبریز ایاغ
تیرے نظارے کو لیکن چشمِ بینا چاہیے
دل بھی سرشار مئے ذوقِ تماشا چاہیے
صبح کو تو کھول لیتا ہے آنکھ جس دم خواب سے منھ دھلاتی ہے ترا شبنم مصفا آب سے
تخت پر تو جلوہ گر ہوتا ہے رعب و داب سے پھول سب نذریں دکھاتے ہیں تجھے آداب سے
جگمگاتا ہے جو صحنِ باغ تیرے نور سے
بے خبر خورشید لیتا ہے بلائیں دور سے
بلبلوں کے دل محبت سے تری لبریز ہیں عاشقی کے ولولے دریائے طوفاں خیز ہیں
لب پہ وہ دلکش ترانے ہیں دہن گلریز ہیں حوصلے بڑھتے ہوئے، دل کی امنگیں تیز ہیں
بجلیاں بھر دیں دلوں میں اضطرابِ شوق نے
مست اور بیخود کیا ان کو شرابِ شوق نے

یادِ وطن

پیارے لال شاکر میرٹھی

اِن شاندار محلوں کو کیا کروں میں لے کر لگتا نہیں ہے میرا دل آہ! ان میں دم بھر
ان میں نہیں ہے میری دل بستگی کا منظر دلکش کہیں ہے ان سے اُجڑا ہوا مرا گھر
مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو رہنا دم بھر نہیں گوارا
ہیں برکتیں اترتی جس گھر میں آسماں سے پیارا ہے آہ! وہ گھر میرے لیے جہاں سے
اے گھر سوا ہے دلکش تو روضۂ جناں سے ہاں! تو عزیز تر ہے مجھ کو ہزار جاں سے
مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو دم بھر رہنا نہیں گوارا

دلِ بیقرار سو جا

سرور جہان آبادی

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا — کہ گزر گئی شب آدھی، دلِ بیقرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے — تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا
یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے — مرے پردہ دار سو جا، مرے راز دار سو جا
مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دمبدم تڑپنا — ترے غم میں آہ! کب سے ہوں میں اشکبار سو جا
ابھی دھان پان ہے تو، نہیں عاشقی کے قابل — یہ تپش کا آہ! شیوہ نہ کر اختیار سو جا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم، تجھے گود میں اٹھا لوں — تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سو جا
تجھے حسن کا ہے تصور ارے مست جامِ الفت — انھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سو جا
تجھے پہلا سابقہ ہے، شبِ غم بڑی بلا ہے — کہیں مر مٹے نہ ظالم، دلِ بیقرار سو جا

گنگا جی

سرور جہان آبادی

اے آبِ رودِ گنگا، اُف رے تری صفائی — یہ تیرا حسنِ دلکش، یہ طرزِ دلربائی
تیری تجلیاں ہیں جلوہ فروشِ تیغی — تنویر میں ہے تیری اک شانِ کبریائی
جمنا تری سہیلی گو ساتھ کی ہے کھیلی — اس میں مگر کہاں ہے تیری سی جاں فزائی
بے لوث تیرا دامن ہے داغِ معصیت سے — موزوں ہے تیرے قد پر ملبوسِ پارسائی
حسنِ ازل کی گویا تو اک مجسم صورت — صانع نے تیری صورت کیا موہنی بنائی
اے نازشِ زمانہ اے نقشِ نازِ عصمت — بھارت کی پاک دیوی تو ہے ہماری مائی

دلبند ہم ہیں تیرے لختِ جگر ہیں تیرے
نخلِ مراد ہے تو اور ہم ثمر ہیں تیرے

قومی عمارت

برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

بتاؤں کونسا ہے وہ مکاں سارے مکانوں میں — گڑے رفعت کے جھنڈے جس کے ہیں ہفت آسمانوں میں
کہیں افزوں ہے وسعت جس کی پہنائے دو عالم میں — محیطِ دہر اک گوشہ ہے جس کے سائبانوں میں
وفائے گل کی کھائی ہے قسم بادِ صبا جس جا — جہاں رنگِ شکایت ہے نہ بلبل کے ترانوں میں
نہیں ہے جس کے کاشانوں میں قیدِ مذہب و ملت — گذر شیخ و برہمن کا ہے جس کے آستانوں میں

بسترِ علالت
شررؔ سہارنپوری

گردشِ دوراں بستم ہے ظلم کی بانی ہوئی
اُف بلائے ناگہانی یوں دشمن جانی ہوئی

منظرِ ارض و سما نظروں میں وحشت خیز ہے
خانہ ویرانی سی ہے خانہ ویرانی ہوئی

کیا خبر تھی ہوں گے ایامِ علالت ختم یوں
جانستاں آب و ہوائے عالمِ فانی ہوئی

ایک ہفتہ میں کمی آئی غذا و ہضم میں
رفتہ رفتہ ضعف کی بے حد فراوانی ہوئی

میں نے جب پوچھا کہا کمبر اوست اچھا ہے جی
میری بیماری سے اُف ایکیسی پریشانی ہوئی

ہائے وہ بےچینیوں کے ساتھ دشب بیداریاں
حیف! خوابِ مرگ کو فکرِ تن آسانی ہوئی

اُڑ گئی تسکینِ خاطر مٹ گئے صبر و قرار
دل میں جمعیت جو تھی وقفِ پریشانی ہوئی

اُس تنِ نازک کے ڈالے دامنِ گنگا میں پھول
دیدۂ گریاں سے جن پر اشک افشانی ہوئی

کاتبِ تقدیر نے جو کچھ ازل میں لکھ دیا
وہ ہی ہوتا ہے شررؔ یہ بات بے معانی ہوئی

نیرنگِ ہستی
برقؔ دہلوی

فریبِ چشم تماشا ہے جلوۂ ہستی
نظر کے واسطے دھوکا ہے جلوۂ ہستی

کھلا کسی پہ نہیں کیا ہے جلوۂ ہستی
عجب طرح کا معما ہے جلوۂ ہستی

بروں ہے فہم بشر سے یہ رازِ سربستہ
یہاں ہے طائرِ اوجِ خیال پربستہ

رہینِ کشمکشِ انقلاب ہے عالم
ثبات یہ ہے کہ نقشِ برآب ہے عالم

نظر فریب تماشائے خواب ہے عالم
گرفتہ کاموں کے حق میں سراب ہے عالم

حجابِ چشمِ حقیقت ہے یہ ہست و بود کچھ بھی نہیں
ہے ماسوا کی نمائش وجود کچھ بھی نہیں

مقدس سرزمین
نادرؔ کاکوروی

(۱) مرحبا اے مادرِ ہندوستاں جنت نشاں
مرحبا اے بھارت اے روحانیت کی سرزمیں

ہم کہے جائیں گے مکہ اور مدینہ چھوڑ کر
ساری دنیا میں ہے تیری پاک تر بہتر زمیں

(۲) تو فضائیت میں شادابی میں پیداوار میں
سب ممالک سے ہے افضل سب ممالک سے قدیم

تجھ میں تھا اس وقت نورِ حق پرستی جلوہ گر
جب کہ روشن بھی نہ تھی شمعِ تجلائے کلیم

(۳) اے بہارستانِ جذبات اے خراباتِ خروش
سیرگاہِ سعدیِ شیراز و بزمِ والمیک

ہے خُم و مینا میں تیرے خاکِ خسرو تہ نشیں
اور مئے احمر میں تیری خونِ سرمد ہے شریک

غزل

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی

چند دور از رخ تو ہم نفس غم باشم — چند چون زلف تو آشفتہ و درہم باشم
با من از صحبت آن شوخ خوش افتاد بس است — حاجتم نیست کہ مقبول دو عالم باشم
من بہ آن مایہ نیرزم کہ بہ خلوت برسم — بس بود اینکہ بہ بزم آئی و من ہم باشم
بسکہ اے بت بہ جفائے سروکار است ترا — آن مبادا کہ من از راز تو محرم باشم
مستی بادۂ الفت نہ بہ اندازہ بود — عجبے نیست کہ رسوائے دو عالم باشم
من گدائے در میخانہ شدم از پئے آں — کہ گر آں مغبچہ ام جام دہد جم باشم
این گمان را نتوانیم کہ تا نہ بکشیم — شبلیا در فن شعر ار چہ مسلم باشم

کلام ابر

بشن نرائن در ابر دہلوی

عدوئے دوست سے کب خواہش امداد کرتے ہیں — کہیں گلچیں سے ہم صیاد کی فریاد کرتے ہیں
سر محفل کہیں یوں شکوۂ بیداد کرتے ہیں — ہیں ساز نغمہ گر چھیڑ دو تو ہم فریاد کرتے ہیں
یہ کیا اسرار ہے بیہوش ہو کر ہوش آتا ہے — خودی جب بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں
یہ جور گل کا بلبل رات دن کیا راگ گاتی ہے — جو عاشق ہیں کہیں معشوق کی فریاد کرتے ہیں
ثواب حج اکبر ان کو گھر بیٹھے ہی ملتا ہے — کسی مسکین و بیکس کے جو دل کو شاد کرتے ہیں
جو جنت کی ہوس میں کار دنیا چھوڑ بیٹھے ہیں — طمع میں سود کی وہ اصل کو برباد کرتے ہیں

اُمید

مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآباد

کہتے ہیں امید جسکو دل کی وہ محبوب ہے — سبکی یہ مطلوب ہے، اور سبکو یہ مرغوب ہے
شاد دل کو کرنے والی ہے جہاں کو یہ امید — گدگدانے والی ہے شوق نہاں کی یہ امید
بیکسی کی آشنا ہے اور خلوت کی رفیق — اور معذوری و مجبوری کی ہے مشفق شفیق
ایک پل میں رونے والوں کو ہنسا دیتی ہے یہ — ہنسنے والوں کو رلا کر پھر لٹا دیتی ہے یہ
بول بالا ہے اسی کے دم سے ہر اک بات کا — نام باقی ہے اسی سے سارے موجودات کا
فتح کی تلوار ہے مرد سپاہی کے لئے — تاج و طرہ ہے یہی تو بادشاہی کے لئے
عاقلوں کو اس کا دامن، دامن مقصود ہے — ذات اس کی جاہلوں کے واسطے معبود ہے

قوم کی لڑکیوں سے خطاب

برج نرائن چکبست

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
جو بناتے ہیں نمائش کا کھلونا تم کو
ان کی خاطر سے یہ ذلت نہ اٹھانا ہرگز
رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
نقدِ اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے
تم دمینتی یہ دولت نہ لٹانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ
تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ اٹھانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو
پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے
راگ ان کو کوئی ایسا نہ سکھانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ
ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز
ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم مگر اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

---

(۱)
دنیا کی عجیب ہم نے ہستی دیکھی
ہر ایک کے حوصلے میں پستی دیکھی
زردار کو محوِ تنگ چشمی پایا
بے زر کی رفیق تنگدستی دیکھی

---

(۲)
ابھی نیا جوش عشق کا ہے صلاح سنتے نہیں کسی کی
کریں گے آخر میں پھر وہی ہم جو چار یار آشنا کہینگے
ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جسکو ہیں انساں وہ اسکو خوفِ خدا کہینگے

(۳)
مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس
پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں
مردِ میدانِ محبت زندۂ جاوید ہیں
موت آجانے سے تو انسان مرجاتا نہیں

---

(۴)
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا
صفحۂ دہر پہ مہرِ یدِ قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودہ سے نمایاں ہونا
ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھکر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

کلامِ حالیؔ

نہ عیش کیخسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہیگی
رہے گی کس طرح راہ اس میں کہ رہنما بنگئے ہیں رہزن
قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
صفائیاں ہورہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہورہے ہیں میلے
جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالیؔ تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث

شمس العلما الطاف حسین حالیؔ

رہے گی اے منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہیگی
خدا نگہبان ہے قافلہ کا اگر یہی رہزنی رہیگی
جو ڈول ڈالو گے حسنِ ظن کا تو تم سے یاں بدظنی رہیگی
اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہیگی
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہیگی

بھائی کا سوگ

دنیا ہے یہ ایک دار فنا اس کا اثاثہ
اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
حالی ہی کو معلوم ہے حالیؔ کی حقیقت

حالیؔ

سب خاک سے تا انجم و افلاک ہیں فانی
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہوگئے پانی
ساحل یہ ہیں جو راہ سپر قاضی و دانی
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو بتانی

کلامِ نظام

تھوڑی سی اگر خاک ترے راہ گذر کی
اک وار میں جو رنگ کیا دل کو ہمارے
کن آنکھوں سے دیکھوں تجھے یا شافع محشر
عثمانؔ تجھے اعزاز دیا ہے جو خدا نے

نظام حیدرآباد

مل جائے تو بن جائے دوا دردِ جگر کی
لی آبرو ابرو نے ترے تیغ و تبر کی
باہر ہے تجلی تری طاقت سے نظر کی
یہ شے نہیں تقدیر میں ہر ایک بشر کی

کلامِ ناطقؔ

جلوۂ باطن سے دیوانوں کے دل میں جوش ہے
مے کشو مے کی کمی بیشی یہ ناحق جوش ہے
کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
کہہ چکا کہنا تھا جو کچھ سن لیا سننا تھا جو
کچھ تو سرگرم سخن ہوا ے زبان شعلہ ریز
میکشانِ عشق کا ہے رنگ دنیا سے جدا

(۱) آنکھ اٹھا کر اس کو دیکھے کس کو کتنا ہوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے
اب ترا ناطقؔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

(۲) کالعدم ہے شمع کی ہستی اگر خاموش ہے
جتنی قوت جس میں ہے اتنا ہی وہ بیہوش ہے

اسیرانِ وفا

مولانا حسرت موہانی

(۱)
عاشقی پیشہ ہے اے دل تو یہ بیداد نکر
ستم یار سے بھی شاد ہو فریاد نہ کر

دیکھ اس جلوۂ پنہاں کی زیارت ہے محال
ہمتِ شوق کو بے فائدہ برباد نہ کر

بے پر و بال کہاں چھوٹ کے جائیں صیاد
ہم اسیرانِ وفا کوش کو آزاد نہ کر

ہم تری یاد کو بھولیں گے نہ بھولیں ہیں کبھی
تو ہمیں بھول کے بھی یاد نہ کر شاد نہ کر

یہ بھی حسرت کوئی تدبیر شگوں ہے کیا خوب
دلِ بیتاب سے کہتے ہو انھیں یاد نہ کر

(۲)
محبت نے اثر پیدا کیا یہ دل نشیں ہو کر
کہ اب تک شکوہ ہائے حسن بھی آئے حسیں ہو کر

یاد اُن کی ہوئی وجہ شگوں ہجر میں حسرت
بلبل کے لئے یادِ بہار آئی قفس میں

(۳)
عہد مستی کے اب کہاں وہ رنگ
ساغر بادہ ہے نہ کاسۂ بنگ

ایسی پھر شب نصیب ہو کہ نہو
ساقیٔ ماہوش کرے بزم رنگ

خوب تھا وہ زمانِ رسوائی
خوب ترقی وہ عقل و عشق کی جنگ

آہ وہ شہر کان پور کی شام
وہ لب نہر وہ کنارۂ گنگ

ہیں طلبگار شوق گونا گون
حسن کے جلوہ ہائے رنگا رنگ

بڑھ چلا جوشِ آرزو حسرت
ختم ہونے کو آئی قید فرنگ

لطف زندگی

ریاض خیر آبادی

مے رہے مینا رہے گردش میں پیمانہ رہے
میرے ساقی تو رہے آباد میخانہ رہے

حشر بھی تو ہو چکا رُخ سے نہیں اٹھتی نقاب
حد بھی آخر کچھ ہے کب تک کوئی دیوانہ رہے

گورے ہاتھوں میں بنے چوڑی خطِ ساغر کا عکس
اس ادا سے ہاتھ میں نازک سا پیمانہ رہے

حشر ہے تم شرم کے پتلے بنو چلنا کہیں
چال اٹھلاتی ہوئی انداز مستانہ رہے

ان بتوں کے چلتے ہم نے دل کو پتھر کر دیا
بُت رہے کوئی نہ یارب کوئی بتخانہ رہے

زندگی کا لطف ہے اُڑتی رہے ہر دم ریاض
میں ہوں شیشے کی پری ہو گھر پری خانہ رہے

مختصرات

باسط بسوانی

سن لو باسط غور کر لو مختصر سی بات
ہے تعصب پر فقط قطعِ کلام و اختتام

اپنا مسلک صلحِ کل ہے صلح جوئی نام ہے
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

برسات کی بہار

داغ دہلوی

چرخ پر چھائی ہیں اس طرح گھٹائیں کالی
ہے سیاہ ابر میں اس روپ پہ بگلوں کی قطار
کہیں بادل کی گرج ہے کہیں بجلی کی کڑک
نعرۂ مست کا بادل کی گرج میں انداز
پسلیاں اب نہیں دریا کی دکھائی دیتیں
کشتیوں میں کہیں جلسے ہیں چڑھے دریا کے
شوخیٔ رنگ سے مہندی کے ہو فق رنگ شفق
کہیں طاؤس چمن کی ہے نوائے دلکش
ہے کہیں گل کی مہک تو کہیں بلبل کی چہک
بھینی بھینی ہے وہ خوشبو کہ معطر ہو دماغ
بوسے لیتا ہے شگوفے کے شگوفہ کھل کر
روز ہر باغ میں ہیں گنبد نوں کے جلسے
شور ہے قلقلِ مینا کا چلے آؤ ادھر
ارض کو فوق سما پر ہے اسی موسم میں

جس طرح ہوں رخِ معشوق پہ زلفیں برہم
انجم کاہکشاں کی ہو لڑی جیسے بہم
کہیں بوندوں کی پھواریں کہیں برسے جھم جھم
جگہ شوق کا بجلی کی تڑپ میں عالم
خوب تن تن کے رواں ہونے لگے موجۂ یم
ہو رہی ہیں کہیں تیراکوں میں شرطیں باہم
لالۂ باغ پہ ہے لال پری کا عالم
کہیں آتی ہیں پپیہوں کی صدائیں پیہم
کوک کوئل کی ہے ارگن سے بھی خوشتر ہر دم
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں ہیں کہ دل ہو خرم
شاخ سے شاخ گلے ملتی ہے کیا کیا باہم
چندریاں ساڑیاں سرخ اس پہ ترشح کم کم
مغنیوں نے بھی مچا رکھی ہے کیا کیا اودھم
کہ زمیں موج زمرد ہے فلک ہے نیلم

مریضہ

جگت موہن لال رواں

کہتے ہیں بیمار مجھکو میرے سارے چارہ گر
ڈاکٹر کو فیس سے مطلب مرض سے کام کیا
نیک نیت ہیں احباب ان کا کیا شکوہ کروں
سعی لا حاصل ہے بیمار محبت کا علاج
کاش ہوں اس رمز سے واقف مرے تیماردار

کچھ حقیقت حال کی لیکن نہیں ان کو خبر
مجھکو ہے حیرت کہ ہے میرے مرض کا نام کیا
کیا کہوں حال دل اظہار تمنا کیا کروں
اس طرح کرتا ہے کوئی دردِ الفت کا علاج
میرے دردِ دل کا ارماں ہے فقط دیدارِ یار

خدا کی خدائی

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

تجلی نے کی اپنی صورت نمائی
نمایاں ہوا ایک قرصِ طلائی
کہا کیسہ زر کو گردوں نے خالی

بڑھی نہر میں اور بھی کچھ صفائی
ادھر جگمگائی خدا کی خدائی
چمکتی ہوئی اشرفی اک نکالی

حقیقتِ زندگی

علامہ سید ابو محمد ثاقبؔ کانپوری

زندگی ہے، یا ہوا ائے خانماں برباد ہے — یا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا جو غیر آباد ہے
یا ہے اک طائر جو اڑتا ہے فضا میں دمبدم — جوش جس کا ہو نہیں سکتا ہے کم کرنے سے کم
یا کہ ہے یہ فصلِ گل میں اک طرب انگیز جوش — کھو دیئے ہیں جس نے اربابِ بصیرت کے بھی ہوش
قطرۂ شبنم ہیں یا اوراقِ گل پر منتشر — جذب کرلیں گی شعاعیں جن کو ہوتے ہی سحر
یا کہ جھونکا ہے کوئی یہ بادِ طوفاں خیز کا — یا کہ دورہ ہے کوئی جوشِ جنوں انگیز کا
یا کہ سطحِ آب پر ہے اک حبابِ بے ثبات — دم زدن ہیں آہ گل ہونے کو ہے شمعِ حیات
اس حقیقت پر بھی ناداں کس قدر غافل ہے تو — اور دل میں یہ سمجھتا ہے بڑا عاقل ہے تو
بادۂ ہستی کے اک ساغر سے تو سرشار ہے — اپنے کاموں پر نظر کرنے سے تو بیزار ہے

آئینۂ بیدلی

احسنؔ شمبھی ادیبہ کانپور

تڑپ اٹھتا ہوں جب کہ مے گلفام آتا ہے — دلِ خوں کشتہ کا آئینہ بن کر جام آتا ہے
ٹھہر اے دل سکونِ عشق پر الزام آتا ہے — تجھے کوئی تڑپنے کے سوا بھی کام آتا ہے
اسی کا نام جینا ہے تو میں جینے سے باز آیا — کہ اب ہر ہر نفس سے موت کا پیغام آتا ہے
لبالب ہے مرا پیمانۂ دل خونِ حسرت سے — تکلف سے مری بزمِ طرب میں جام آتا ہے
رہینِ بیکسی ہوں نازبردارِ تمنا ہوں — اسیرانِ محبت کو کہیں آرام آتا ہے
فنا کے بعد بھی کیا سامنا ہے اس مصیبت کا — تڑپ اٹھتا ہے دل جب زندگی کا نام آتا ہے
یہ ذوقِ کیفِ غم یہ روح کی افسردگی احسنؔ — ترے دل میں کبھی اندیشۂ انجام آتا ہے

رباعیات

ملوک چند محرومؔ

(۱)
ہے تیرے کرم پہ انحصارِ ہستی — رحمت تری باعثِ بہارِ ہستی
حکمت تیری ہے اے حکیمِ مطلق — ذرّوں سے بنا دیا حصارِ ہستی

(۲)
ادبار کا گھر کر جائے اقبال ہے دہر — جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پر ہے برہم اتنا — ناداں! ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

(۳)
تم کو ہے ...زق اگر پریشانی ہے — اے دل! تیری یہ محض نادانی ہے
[illegible] — سامانِ حیاتِ عالمِ فانی ہے

شاعری

مرزا جعفر علی خاں اثر

اپنی قسمت کا ستارہ آپ ہی انسان ہے
خود اسی کی ذات میں پنہاں ہیں اسرارِ کمال
ہیں فرشتے قہر یا رحمت کے جو افعال ہیں
ذات پر اپنی اگر پورا بھروسہ ہے تجھے
کِذب سے ہرگز نہ ہو گا آشنا ڈرتا ہے کیوں
دل سے جو نکلے اثر دل پر وہ کرتا ہے ضرور
اک شعاعِ نور ہے شاعر کے سینے میں نہاں
یہ کرن ہے اُس تخیل کی جو تیری مِلک ہے

اور ہے وہ رُوح جس کا ساختہ ایمان ہے
بخت ہے محکوم، قدرت جذب پر تابع جمال
ساتھ سائے کی طرح سب نیک و بد اعمال ہیں
کہہ بآوازِ دُہل جو کچھ بھی کہنا ہے تجھے
ہو کے دانشمند خونِ راستی کرتا ہے کیوں
یہ ہے بو جو سے پھیلتی ہے دُور تک جس کا سرور
جس کی تابش کا نظارہ ہے نشاطِ بیکراں
یہ نہ ہو تو نغمہ سے خالی صریرِ کِلک ہے

تشریحِ وفا

محشر لکھنوی

کہہ گئے ہیں سچے دل سے اہلِ ایمانِ وفا
درسِ حُسن و عشق کے اسرار خود ہی کھل گئے
ایدھی کچھ ہو گئی پھولوں کی رنگت اور شمیم
مشقِ جذبِ باطنی میں ہو گیا اُس کو کمال
کلمہ گو ہو یا کہ دُنیا میں کوئی زُنّار بند
دورِ حاضر میں یونہیں ملتی ہے تصویرِ نفاق
زندگی بھر اہلِ باطن کو رہی یہ احتیاط

جان جائے ہاتھ سے چھوٹے نہ دامانِ وفا
گھر سے مجنوں جب چلا سوئے دبستانِ وفا
کھنچ کے بلبل آئی جب سوئے گلستانِ وفا
بن گیا تقدیر سے جو دل نگہبانِ وفا
سعیِ باطن سے جگا دے نامِ ایمانِ وفا
عشق کا کلمہ پڑھیں ہندو مسلمانِ وفا
نفسِ امّارہ نہ لوٹے ساز و سامانِ وفا

یہ نہ کرے تو آدمی آخر کار کیا کرے

ابو الاثر حفیظ جالندھری

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے
دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی
موت نے کس اُمید پر سونپ دیئے ہیں بحر و بر
اپنے کئے پہ بار بار کون ہو اور وہ شرمسار
حدِّ ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی

نخلِ اُمید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے
پڑ ہی جب ہوں پردہ در روئے نگار کیا کرے
یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے
مُشتِ غبار ہے بشر، مُشتِ غبار کیا کرے
مِل گیا عُذرِ پائدار قول و قرار کیا کرے
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

ماہتاب

مولانا عزیز لکھنوی

یہ کس نے بُرجِ زمرد سے مُنھ نکالا ہے
شرابِ نور اُبل آئی آفتاب سے
تڑپ اٹھا اثرِ چشمِ مستِ ساقی سے
چمک ہے ماہِ شبِ تیر کی سواری میں
مگر ہے لیلیٰ شب کا محافۂ سیمیں
اُبل پڑا ہے شب آتے ہی چشمۂ پُرجوش
ہزار نقش طراز جہاں حجاب میں ہے

ہر اک طرف شبِ تاریک میں اُجالا ہے
تجلیوں کا سمندر بہا قرابے سے
چھلک گیا ہے جو پیمانہ دستِ ساقی سے
چھپا ہوا ہے کوئی بدر کی عماری میں
دکھا رہا ہے جھلک اپنی کوئی پردہ نشیں
ہر ایک چیز زمانے کی ہے تجلّی پوش
فروغِ رخ کا اثر کشتِ ماہتاب میں ہے

متاعِ زندگی

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد

زمانے میں کسی کو ناز ہے شیریں زبانی کا
ہوئی ہے بیخودی جس کو مے وحدت کے ساغر سے
خدا جانے تپش ہے کس بلا کی آتشِ دل میں
پروں کو نوچ کر ڈالا قفس کی قید میں تو نے
مناسب ہے، اسے وحشت فنا کی راہ پیمائی
جلاتی ہے جو پروانہ کو خود بھی شمع جلتی ہے

ہماری خامشی میں ہے اثر جادو بیانی کا
وہ دلدادہ نہیں لُطفِ شرابِ ارغوانی کا
پتہ ملتا ہے کچھ کچھ آہ سے سوزِ نہانی کا
ٹھکانا بھی ہے کچھ صیاد تیری بدگمانی کا
جو ہے جویا زمانے میں متاعِ زندگانی کا
ثمر ہے باغِ دنیا میں یہی کچھ دلستانی کا

ہنگامۂ فریاد

مرزا یاس یگانہ لکھنوی

دل لگانے کی جگہ عالمِ ایجاد نہیں
آج اسیروں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں
سرِ شوریدہ سلامت ہے مگر کیا کہیے
تلملانے کا مزہ کچھ نہ تڑپنے کا مزہ
نکہتِ گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند
فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا باقی

خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں
شاید اب کوئی گلستاں کا سبق یاد نہیں
دستِ فرہاد نہیں، تیشۂ فرہاد نہیں
ہیچ ہے دل میں اگر دردِ خداداد نہیں
رُوح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں
زندگی اُس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

زندہ ہیں مُردہ پرستوں میں ابھی تک غالب
مگر اس فن میں یگانہ سا اب اُستاد نہیں

شکوہ

احسنؔ مارہروی

حقیر خادمِ اُردو ہے اُس زمانے کا
کہ اس "زمانہ" کا جبتک ہوا نہ تھا آغاز

جب اس کی عمر کا دُنیا میں سال اول تھا
تو میرے طائرِ سن کی تھی تیسویں پرواز

باایں تفاوتِ عمری بہم یہ ربط رہا
کہ تازہ ہوتا تھا ہر ماہ لطفِ راز و نیاز

اگرچہ مجھ سے بہت کم ادا ہوئی خدمت
مگر "زمانہ" رہا مدتوں حقیر نواز

اب آ گئے تیس برس سے یہ بر ہمی دیکھی
کہ یک قلم ہوئے متروک وہ قدیم انداز

نہ گم ہوں کیوں مرے ہوش و خرد جنابِ نگم
سُنیں اگر نہ توجہ سے آپ یہ آواز

سزا نہ دیجئے کوتاہ قلمیوں کی مجھے
کہ دامنِ کرم و لطف آپ کا ہے دراز

مرا وجود ہے کیا، اور میری خدمت کیا
معاونوں میں ہیں اس کے بڑے بڑے ممتاز

زبانِ خامہ سے قاصر رہا ہوں گو اکثر
مگر ہے دل کو دعا گوئیوں پر اپنی ناز

دعا ہے اب بھی یہی بارگاہِ قدرت میں
کہ ہو "زمانہ" کی مانندِ خضر عمر دراز

ہر ایک حال میں احسنؔ یہ فرض ہے تیرا
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

اِلتجائے بیداری

حضرت وصلؔ بلگرامی

خواب سے اے مادرِ ہندوستاں بیدار ہو
تیرے بچے، التجا کرتے ہیں، ہاں بیدار ہو

تیرے بچے ہیں دو زانو، تیری خدمت کے لئے
تیری پُر عظمت پرستش، اور عبادت کیلئے

اُٹھو اور ان کڑیوں کو جو جکڑے ہوئے ہیں توڑ ڈال
ہیں مصیبت کی یہ کڑیاں، باعثِ رنج و ملال

مادرِ محبوب! وارث کیا نہ ہم ہوں گے ترے؟
کیا نہیں حقدار، ہم تیرے غرور و ناز کے؟

جن کے دل تیری سپر ہیں، تیری قرباں گاہ میں
ہچکچائیں گے وہ کیوں؟ جو تیرے عظمت خواہ ہیں

غمِ اُلفت

روشؔ صدیقی

ایک ایک قدم پر جسے مرنا نہیں آتا
اُس کو رہِ اُلفت سے گذرنا نہیں آتا

مردانِ محبت کو نہیں ذوقِ نمائش
ان ڈوبنے والوں کو اُبھرنا نہیں آتا

دشوار سہی لاکھ، رہِ عشق و محبت
کیا جان سے بھی ہم کو گذرنا نہیں آتا

ہر ذرۂ کونین کو نسبت ہے سکوں سے
میرے دلِ مضطر کو ٹھہرنا نہیں آتا

رازِ غمِ اُلفت نہ کھلا ہے نہ کھلے گا
یہ داغ وہ ہے جس کو اُبھرنا نہیں آتا

میری دنیا

جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی

جب نالۂ غمگیں نے تاثیرِ دعا پائی　　جب نغمۂ شیریں نے مستانہ ادا پائی
جب پیکرِ سیمیں نے معصوم حیا پائی　　جب شاعرِ رنگیں نے تخئیلِ رسا پائی
ناکام تمنا کی دنیا ابھی سونی تھی

جب بربطِ ہستی کو چھیڑا ید قدرت نے　　مخلوق کی بستی کو زندہ کیا فطرت نے
میں نے بھی بسا ڈالی دنیائے طرب اپنی

غنچوں سے چٹک لے کر بجلی سے چمک لیکر　　موجوں کے ترنم سے تاروں کے تبسم سے
پھولوں سے نزاکت لی، رنگینی و نکہت لی　　لی حسن سے خود بینی رعنائی و شادابی
عشاق سے مسکینی، بے تابی و بے خوابی　　وارفتۂ الفت کی دنیا نئی بستی تھی
جب تم نے نظر ڈالی برباد ہی کر ڈالی

ارمانوں کی دنیا کو، یعنی دلِ شیدا کو　　برباد کیا تم نے ناشاد کیا تم نے
جس دم تمھیں دیکھا تھا جس دم تمھیں چاہا تھا　　دنیا مری سونی تھی اب بھی وہی حالت ہے
اب آنکھ نہیں ملتی، یہ تازہ مصیبت ہے　　ہر پردہ حائل کو سو بار اٹھا دیکھا
دنیائے تصور کو سو بار بسا دیکھا　　آشفتۂ وحدت کو کب تم سے جدا پایا
پر دید کی حسرت کو حاصل ہے سوا پایا
دنیا مری سونی تھی اب بھی وہی حالت ہے　　اب آنکھ نہیں ملتی یہ تازہ مصیبت ہے

رموز و نکات

ابوالفاضل راز چاندپوری

(۱)

تدبیر وفا شعار ہو جاتی ہے　　تقدیر سے ہمکنار ہو جاتی ہے
آتا ہے جو وقتِ کامیابی اے راز　　فطرت بھی شریک کار ہو جاتی ہے

(۲)

یارانِ وطن کی بے ریائی دیکھی　　اغیار کی شان خود نمائی دیکھی
غربت کے مشاہدات، اللہ اللہ　　نیرنگیٔ حسن آشنائی دیکھی

لختِ جگر

جگر مرادآبادی

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

وہی لطافت وہی نزاکت وہی تبسم، وہی ترنم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے، نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

فضا ہے نشہ برس رہا ہے، دماغ پھولوں سے بس رہا ہے
وہ کون ہے جو ترس رہا ہے سبھی کو بیخود بنا رہے ہیں

خود اپنے نشہ میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں
خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

یہ مست بلبل بہک رہی ہے، قریبِ عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے، وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں وہ موجۂ نسیم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوتِ نغمہ بنا ہوا ہے وہ جیسے خود گنگنا رہے ہیں

بہار رنگ و شباب ہی کیا، ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

تمام رنگینیوں کے منظر تمام رعنائیوں کے مظہر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب اپنے مرکز پہ آ رہے ہیں

خرامِ رنگیں نظامِ رنگیں کلامِ رنگیں پیامِ رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

یہ اشک جو بہہ رہے ہیں پیہم اگرچہ سب ہیں یہ حاصلِ غم
مگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ مسکرا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر رہے گا لیکن یہ نقشِ دل پر
ہم ان کا دامن پکڑ رہے ہیں وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں

ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی، یہ دیکھتا ہوں نئی تجلی
جمالِ معنی دکھا رہے ہیں طلسمِ صورت مٹا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبان پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

تمام ہستی پہ چھا رہے ہیں وہ جیسے خود ہی بنا رہے ہیں
نظر نظر میں سما چکے ہیں نفس نفس میں سما رہے ہیں

ہماری ہستی تمام آفت، تمام کلفت، تمام زحمت
اگر یہ سچ ہے تو فی الحقیقت ہمیں خود ان کو ستا رہے ہیں

کہاں کی دید اور کس کا عرفاں حواس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

یہ حادثاتِ زمانہ کیا ہیں یہی تو ہیں حسنِ طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں

نہ سوز اپنا نہ ساز اپنا نہ درد اپنا، نہ شوق اپنا
وہ خود ہی مطرب وہ خود ہی نغمہ وہ خود ہی ہم کو سنا رہے ہیں

نفس نفس میں صفاتِ تازہ ممات تازہ حیات تازہ
انھیں میسر ہے ذاتِ تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں

یہ موجِ دریا یہ ریگِ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو تو مسکرا دیا ہے یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

گلوں سے مستی جھلک رہی ہے صراحیٔ بلبل ٹپک رہی ہے
جگر کسی گوشۂ چمن میں غزل کوئی اپنی گا رہے ہیں

قیودِ علائق

سنت پرشاد مدہوش

بشر تو ہے بستۂ علائق یہ سہہ رہا ہے کہاں کی قیدیں
کڑی جو ہیں اس زمیں کی قیدیں تو سخت ہیں آسماں کی قیدیں
کہیں جو ثقلِ زمیں سے ہٹتا تو اہلِ حکمت یہ کیا نہ کرتا
یہ اُڑ کے عرشِ بریں پہ جاتا، اگر نہ ہوتیں مکاں کی قیدیں
زمیں کو تا سطحِ مہ اٹھاتا، جو مستقر مہر میں یہ پاتا
کبھی نہ ان پستیوں کا مارا یہ جھیلتا اس جہاں کی قیدیں
نفس نفس میں جو الجھنیں ہیں، قدم قدم پر ہیں سخت پھندے
زمیں کی قیدیں، زماں کی قیدیں مکیں پہ ہیں سو مکاں کی قیدیں
ہوا ہے مجروح آہ کیا کیا، ہمارا ذوقِ نجات ان سے
ارے یہ خود اپنے خوں کے چسکے، ارے یہ خطِ نہاں کی قیدیں
کہاں ہیں مدہوش اہلِ ظلمت عذابِ زنداںیت یہ کیوں ہے
بتاتے کچھ اہلِ راز ہم کو، مگر ہیں اُن پر زباں کی قیدیں

مدّ و جزر

اقبال نرائن جگر دہلوی

جگر شبابِ محبت میں وہ ملاقاتیں وہ انتہائے محبت میں شوق کی باتیں
مے نشاط سے لبریز جامِ کیف اور وہ دن سرور کے وہ لطفِ وصل کی راتیں
مجھے خوشی کے پھر ایام یاد آتے ہیں
جنونِ عشق کے سب کام یاد آتے ہیں
وصالِ یار سے میں شادکام رہتا تھا مے نشاط سے لبریز جام رہتا تھا
نہ انتظار کی گھڑیاں نہ انتظار کے دن عجب سرور مجھے صبح و شام رہتا تھا
مزے وہ دردِ محبت کے یاد آتے ہیں
وہ رنگ خوبیٔ قسمت کے یاد آتے ہیں

توہینِ دوستی

جناب آنند نرائن مُلّا

سمجھ رہا ہوں میں خوب اس کو بھلا کہاں تو کہاں میں مکیں
مجھے کچھ اس کا گلہ نہیں ہے کہ فرق یہ تو نصیب کا ہے
زباں سے مُلّا کو دوست کہکر مگر نہ توہینِ دوستی کر
ذرا خیالوں کا جائزہ لے کہیں گداز بھی غریب کا ہے
نہیں وہ تیرے کرم کے شایاں تو کیوں اسے دے حسین دھوکا
کہ وہ سمجھ بوجھ کر ہے ناداں ہنوز امکاں فریب کا ہے

(۲)

آرزوئیں دل کی ساری بےخبر تھیں محوِ خواب
جانتا تھا کون کہتے ہیں کسے جوشِ شباب
یک بیک تو نے رخِ پُرنور سے الٹی نقاب
اک نظر میں ہاتھ سے جاتی رہی تسکین و تاب
غنچۂ دل اک اشارے سے ترے کھلنے لگا
مجھ کو رازِ آفرینش کا پتہ ملنے لگا

شاعر

شیام موہن لال جگر بریلوی

یہ کیا بتاؤں کسی کو میں کون ہوں کیا ہوں
دکھائی دیتا ہوں لیکن سمجھ سے بالا ہوں
مِلا ہے حسنِ حقیقت خمیر میں میرے
بھرا ہے نورِ تجلّے ضمیر میں میرے
حریمِ قدس کی قندیل ہے دماغ مرا
نشانِ پرتوِ جاوید ہے چراغ مرا
ملی ہے دل کی جگہ برقِ بےقرار مجھے
بنا دیا غمِ عالم کا سوگوار مجھے
جو شب کو اشک مری آنکھ سے ٹپکتا ہے
سحر کو مہرِ فلک بن کے وہ چمکتا ہے
امینِ رازِ محبت ہوں روزِ اول سے
کئے ہوں دہر کو روشن وفا کی مشعل سے
فراق و وصل کا میرے جہاں میں نام نہیں
سوائے سوز مجھے عاشقی سے کام نہیں

دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے

بسمل الہ آبادی

ہندو بھی مسلماں بھی سوچیں اس کشت و خوں سے کیا حاصل
یہ جوش بُرا ہے آپس کا، اس جوشِ جنوں سے کیا حاصل
مسجد توڑی مندر توڑا، اپنے اپنے سر کو پھوڑا
اللہ کے گھر کا یہ نقشہ، افعالِ زبوں سے کیا حاصل
کیوں ہاتھا پائی کرتے ہو کیوں لڑتے ہو کیوں مرتے ہو
کیوں خون بہاتے جاتے ہو اس بارشِ خوں سے کیا حاصل
ہر لاگ بری ہر آگ بری ہر رنگ برا ہر ڈھنگ برا
جو پھونک دے اپنے گھر کو اس سوزِ دروں سے کیا حاصل
بسمل کی نصیحت دل سے سنو، لاج اپنی اپنے ہاتھ رہے
مل جاؤ گلے سنگم کی طرح دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے

پیامِ آزادی

حضرت فراق گورکھپوری

مری صدا ہے گُلِ شمعِ شامِ آزادی　　سُنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی
لہو ہے تیرے شہیدوں کا یا بھڑکتے شرار　　اُچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی
مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں　　مری فنا سے ہے پیدا دوامِ آزادی
اب انقلاب کی ٹھانو کہ کوششِ اصلاح　　خیالِ خام و غمِ ناتمامِ آزادی
معاہدے، سند اور ایں و آں تو باتیں ہیں　　یہ جنگ کیا ہے؟ غلامی بنامِ آزادی
تمھیں کروگے منظّم جہاں کو مزدورو!　　تمھیں سجاؤگے دیوانِ عامِ آزادی
فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے　　ارے یہ صبحِ غلامی! یہ شامِ آزادی
یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بامِ ہفت افلاک　　بہت بلند ہے اِن سے مقامِ آزادی
فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہے　　کہ جام میں ہے مئے لالہ فامِ آزادی
قدم یہ اُٹھتے ہیں پس ماندگانِ منزل کے　　کہ رہروؤں میں یہی ہیں امامِ آزادی
دلوں میں اہلِ زمیں کے ہے نیو اس کی مگر　　قصورِ خلد سے اونچا ہے بامِ آزادی
ترے خیال سے زنجیر تیرگی ٹوٹی　　ترا جمال ہے ماہِ تمامِ آزادی
ترنم سحری دے رہا ہے لو چھپ کر　　حریفِ صبحِ وطن ہے یہ شامِ آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہماری سانس سے روشن ہے نامِ آزادی

جذباتِ منوّر

بشیشور ناتھ منوّر

شورِ تکمیلِ جنوں نالۂ زنجیر میں تھا　　میری شہرت کا بھی پہلو مری تشہیر میں تھا
اب دعا کام جو کرتی ہے تو شرمندہ ہوں　　نقص گویا مرے اندازۂ تاثیر میں تھا
لینے والوں نے لیا جائزۂ دل ہر چند　　فرق پھر بھی مرے جذبات کی تفسیر میں تھا
رکھ دیا مصلحتاً تیری جفا پر الزام　　میں گرفتار تو خود اپنی ہی زنجیر میں تھا

یاد اس وقت کی آتی ہے تو رو دیتا ہوں
جب مرا دخل منوّر مری تقدیر میں تھا

کلامِ سحر

اقبال ورما سحر ہتگامی

دہانِ جلوۂ تغیرِ امتیاز ہوں میں
کبھی ہوں ناز سراپا کبھی نیاز ہوں میں

مُرادِ بندگیِ حق ہے، یہ نہیں معلوم
کہ بُت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں

ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا
فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں

فراق میں ہے عجب وصل کا لطیف احساس
ترا سپاس گزار اے شبِ دراز ہوں میں

بجا سے ہو کہ نہ ہو عشق میں حصولِ کمال
ابھی تو وقفِ اداہائے سوز و ساز ہوں میں

مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل
جو کچھ ہوں سحرؔ! خود اپنا مگر جواز ہوں میں

جذباتِ نظامی

نظامی بدایونی

ادائیں نئی ہیں ترے بانکپن کی
نہ کیوں فرق آجائے رسمِ کہن میں

وفا کا سلیقہ جفا کا طریقہ
ہمارے چلن میں تمھارے چلن میں

محبت کا انجام شاید یہی ہے
کہ شعلے سے اُٹھنے لگے تن بدن میں

نظامیؔ کرو اُن سے کیا عرضِ مطلب
اثر ہی نہیں جب تمھارے سخن میں

کرشن جی کی نذر

منظور الحق کلیم

کیسی ہے دلکشی بھری صورتِ نے نواز میں
حُسن سمٹ کے آگیا جلوہ گرِ مجاز میں

ایک طرف جمالِ کرشن جس نے شکست فاش دی
ایک طرف جلالِ کرشن کنس کے ترکِ ناز میں

پریم کی بدلیاں اٹھیں چھا گئیں سارے ہند پہ
کوندتی برقِ حُسن ہے چشمِ نظارہ ساز میں

قابلِ غور و فکر ہیں ارجن و کرشن کے قصص
بھر گیا ذوقِ غزنوی کیسے دلِ ایاز میں

راز تو ہے کلیمؔ کچھ کرشن کی شکلِ دلفریب
پتلی کی طرح پھرتی ہے آج بھی چشمِ باز میں

تجلیاتِ اُفق

اُفق امروہوی

دل سے غافل تھا ورائے لامکاں سمجھا تھا میں
وائے کج فہمی کہاں تھے وہ کہاں سمجھا تھا میں

خود نمودِ حُسن تھی شورش فزائے کائنات
عشق کو ہنگامہ آرائے جہاں سمجھا تھا میں

تھے حقیقت میں وہ سب ذوقِ نظر کے شعبدے
جن کو حُسن و عشق کی نیرنگیاں سمجھا تھا میں

روشنیٔ طبع من پر من بلا شد اے افقؔ
برقِ گلشن کو چراغِ آشیاں سمجھا تھا میں

اعجازِ کلام

عشق کی کائنات میں کون نہیں ہے کیا نہیں
تجھ پہ دلِ ستم نصیب کون ہے جو فدا نہیں
دہر کے ذرّہ ذرّہ کی حسن تضاد ہے اساس
کُنجِ لحد بھی ہے عجب گوشۂ عافیت نواز
عشق بغیر زندگی خوانِ طعام ہے مگر
واقفِ فالِ فرعِ دل کوئی نہیں ہے باغ میں
کس کو سنائیے کلام قصۂ وارداتِ دل

مولوی محمد یعقوب خاں کلامؔ

دیر نہیں حرم نہیں، بُت نہیں یا خدا نہیں
ناز نہیں ادا نہیں، جور نہیں، جفا نہیں
درد نہیں دوا نہیں موت نہیں بقا نہیں
غل نہیں غلغار نہیں، ڈر نہیں دغدغا نہیں
آب نہیں نمک نہیں لُطف نہیں مزا نہیں
گُل نہیں بُلبُل نہیں، غنچے نہیں صبا نہیں
جوش نہیں جگر نہیں ہوش نہیں وفا نہیں

عظمتِ قرآن

احسان دانشؔ

انسان اور خداوند کے مابین ہے شاعر
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت

آں جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار

جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دلِ فرعون کا انکار

حسرتِ پرواز

جناب شاکرؔ میرٹھی

پابندِ دامِ غم ہوں میں مبتلائے ہستی
اک گوشۂ قفس ہے مجھ کو فضائے ہستی

دم گھونٹتی ہے میرا قیدِ جفائے ہستی
اک تنگ و تار زنداں ہے تنگنائے ہستی

تنگ آ گیا ہوں یارب ہنگامۂ جہاں سے
ہوتا اگر کبوتر اڑ جاتا میں یہاں سے

جذباتِ شوق

جگموہن ناتھ رینہ شوقؔ

بے نیازِ ہوش ہوں حاصل ہے لطفِ بیخودی
لطفِ ہم آغوشیِ امواج بھی کچھ کم نہ تھا
مست رہتا ہوں خود میں اپنی نوائے شوق سے
جلوۂ لیلیٰ کہاں، یہ دیدۂ حیراں کہاں

محوِ حیرت رہنے دے نیرنگیِ محفل مجھے
بے بسی نے کر دیا شرمندۂ ساحل مجھے
چھیڑتی ہے کیوں صدائے نغمۂ محفل مجھے
شوق دھوکا دے رہا ہے پردۂ محمل مجھے

ارادۂ تخلیقِ انسان

حضرت جوش ملیح آبادی

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی
کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی

کون انساں! فاتحِ کونین، امیرِ آب و گِل
سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل

نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن
اک مجسم کج کلاہی، اک سراپا بانکپن

ناصرِ اوجِ نگاراں، ناظمِ ابر و چمن
ناظرِ موجِ بہاراں، ناقدِ سرو و سمن

مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں
مرکزِ آزادِ عالم، محورِ دنیا و دیں

شارحِ آیاتِ ہستی، شارعِ دینِ حیات
قاضیِ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات

مکتبِ نور و حرارت، درس گاہِ خیر و شر
صاحبِ ناز و برودت، راکبِ شمس و قمر

دوربینِ خشک و تر، معیارِ نقدِ حسن و ذم
خوردبینِ آب و گِل، میزانِ جنسِ کیف و کم

شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات
ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات

اک زمیں پرور محقق، ایک فلک پیما حکیم
ایک مقیاسِ تحمل، اک رصدگاہِ عظیم

آسماں کا داور و دارا، زمیں کا دادخواہ
برگ کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ

دہر کی بیدار پنہاں طاقتوں کا شہریار
تیرگی کا کارفرما، نور کا پروردگار

طرفہ بازی گاہِ موجِ ذات کا اسرار باز
اوج کا نباض، پستی کا طبیب و چارہ ساز

برق پیما ابلقِ شام و سحر کا شہسوار
جنبشوں کا میرِ لشکر، گردشوں کا تاجدار

عرصۂ تابش کی ضو، رفتار فوجوں کا نشاں
بحرِ ظلمت کی سبک رو کشتیوں کا بادباں

روشنی کا نغمہ، فطرت کا سخن، حق کا پیام
مہر و مہ کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام

عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ
پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ

چشمِ ہستی کی بصارت، زندگی کا رازداں
خامشی کا زمزمہ، گونگے حقائق کی زباں

خونِ گل دوڑائے گا جو ان خس و خاشاک میں
نفخ کر دوں گا خود اپنی روح جس کی خاک میں

(۲)

تجھے کیا فصلِ گل سے یا زمانِ خار ہے ساقی
تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی

تری خدمت گزاری کا شرف حاصل نہ ہو جب تک
یہ سنتا ہوں کہ بیداری بہت دشوار ہے ساقی

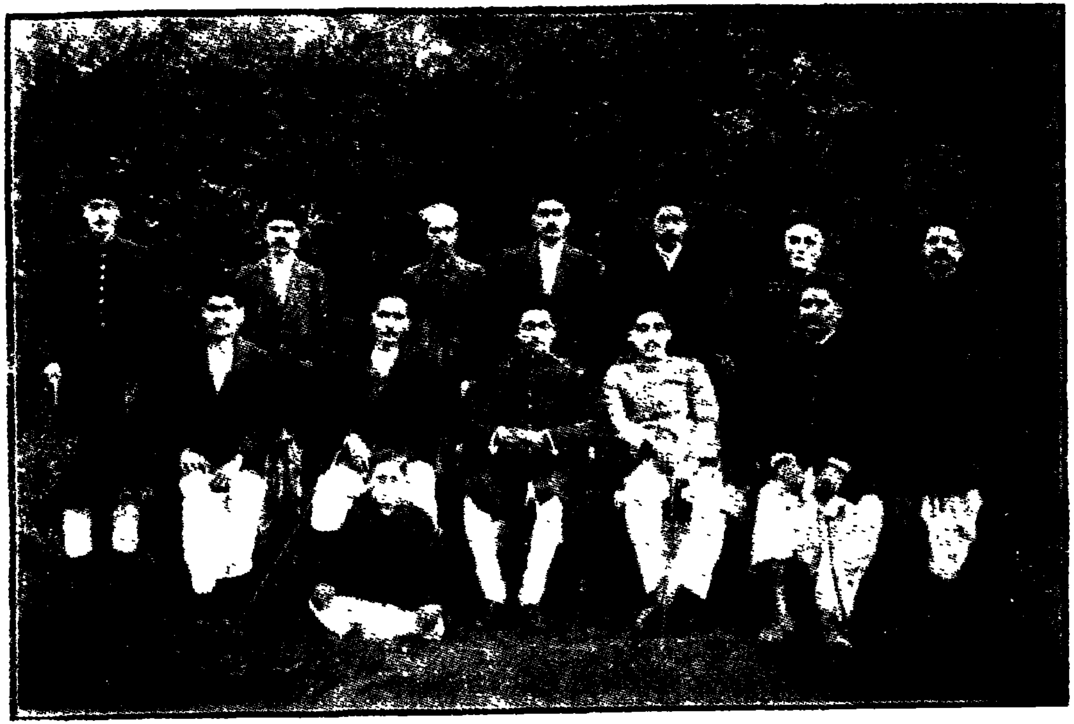
ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

خدارا انتہائی لطف و نرمی سے مدارا کر
کہ عقلِ انساں کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اک لرزۂ براندام بے دینی
مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوش پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لاابالی کس قدر ہوشیار ہے ساقی

Staff of 'Zamana' - 1928



From Left to Right
Sitting : L. Puttu Lal Gupta. B. Ram Krishna, M. Daya Narain Nigam, Kh. Abdul Majid (of Intezami Press). Mr. Shyam Sunder.

Standing : M. Mahbub Hasan, Nanak Prasad, Ahsan Ali, M. Mahmud Hasan, M. Ahmad Ali, M. Shyam Baksh and M. Gur Baksh.

Sons of M. Daya Narain Nigam
(Photo 1948)



Left to Right

Sitting : Mr. Bishan Narain Nigam, Mr. Sri Narain Nigam, Mr. Shyam Narain Nigam.

Standing : Mr. Raman Nigam, Mr. Brij Narain Nigam.

منشی دیا نراین نگم

موجودہ اہلِ قلم کی نگاہ میں

منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ"

جناب طالب چکوالی صاحب

جب میں یہ جاننے کے لئے کہ میری "زمانہ" سے کب اور کیسے شناسائی ہوئی، اپنی یادوں کی کتاب کے پنّے اُلٹنے لگتا ہوں تو اُس صفحہ پر آ کر رک جاتا ہوں جو ۱۹۱۰ء کے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ میں اُن دنوں ڈی۔بی ہائی سکول چکوال کا طالب علم تھا۔ ہمارا خاندان ضلع جہلم کے مشہور متمول خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ روپیہ پیسہ کی افراط تھی۔ ہمارے ہاں اُفق کی رامائن کا پاٹھ ہوتا تھا۔ محلہ والے اور دوسرے لوگ شام کو آتے تھے۔ متعدد اردو اخبارات اور رسائل باقاعدہ آتے تھے جن میں سے کچھ کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ "ہندوستان" لاہور (ہفتہ وار) جس کے اڈیٹر رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی تھے، شو برت ورمن کا "سادھو" لاہور ماہنامہ تھا۔ "زمانہ" کانپور۔ اور آریہ گزٹ لاہور وغیرہ وغیرہ۔ زمانہ سے میری روشناسی ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ آہستہ آہستہ یہ محبت کی شکل اختیار کر گئی۔ پریم چند کی کہانی کے لیے "زمانہ" کا انتظار رہتا۔ پرچہ آنے پر سب سے پہلے پریم چند کی کہانی پڑھی جاتی۔ پھر نظموں اور مضامین میں بھی دلچسپی بڑھنے لگی۔ اور ہوتے ہوتے یہ محبت عشق کی صورت اختیار کر گئی۔ ۱۹۱۷ء میں میں تعلیم کالج کے لیے لاہور پہنچا۔ ۱۹۲۲ء میں واپس چکوال بطور وکیل آ گیا اور وکالت شروع کر دی۔ شعر و شاعری کا مرض تو چھوٹی عمر ہی میں لگ گیا تھا۔ اب یہ بھی شدت پکڑ گیا۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی بار میری غزل "زمانہ" میں شائع ہوئی۔ متعدد مضامین نظم و نثر ۱۹۴۹ء تک "زمانہ" کے لیے برابر لکھتا رہا۔ آخری پرچہ ماہ مئی و جون ۱۹۴۹ء میں بھی میری نظم "خاک و خوں آشام" شائع ہوئی۔ پرچہ بند ہونے تک "زمانہ" والوں نے مجھے اپنے اعزازی خریداروں کی فہرست میں رکھا۔ یہ بھی بڑی بات ہے اور ان کی غیر متزلزل محبت کا ثبوت۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ جن دنوں میں وکالت کرتا تھا۔ ہر سال ماہ ستمبر میں نگم صاحب کا نوازش نامہ بطور یاددہانی آیا کرتا تھا: "اب تعطیلات میں آپ کسی صحت افزا مقام پر جائیں گے۔ 'زمانہ' کے لیے نظم اور مضمون ضرور لکھ کر روانہ کریں۔" میں اُن کے حکم کی تعمیل میں ایسا ہی کرتا۔ ایسا ہی وہ اپنے دوسرے لکھنے والوں کو بھی لکھتے ہوں گے۔ اپنے خود ساختہ فرائض کی تکمیل کا یہ جذبہ اب کہاں دیکھنے کو ملتا ہے!

"زمانہ" کانپور اُردو جرائد میں ایک منفرد اور ارفع مقام کا مالک رہا ہے۔ بجا طور پر اس کی خدمات اُردو ادب کے لیے ایک بیش بہا تحفہ تصور کی جاتی ہیں۔ "رفتار زمانہ" کے عنوان سے نگم صاحب کے مختصر مگر جامع نوٹ جو سیاسی سوجھ بوجھ سے مزین ہوتے تھے ہر شمارے میں خاصے کی چیز مانے جاتے تھے۔

"زمانہ" اور اس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم دو قالب اور یک جان تھے۔ "زمانہ" عمر بھر ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ان کی بے غرض اور خالص ادبی خدمت کا جذبہ بحدِ جنوں پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اور اپنی بے پناہ صلاحیتیں اس کے ارپن کر دیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ "زمانہ" کا چاہنے والا نگم صاحب کا گرویدہ نہ ہو۔ یہی حال میرا ہوا۔ اگرچہ منشی جی موصوف سے مجھے شرف ملاقات حاصل نہ تھا لیکن عرصہ ہوا "زمانہ" میں ان کا ایک فوٹو شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے بند گلے کا اچکن نما گہرے رنگ کا کوٹ جس میں ہلکی سفید دھاریں تھیں زیب تن کئے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، رنگ پکا، نین نقش تیکھے، چہرے پر سنجیدگی اور مستقل مزاجی کی چھاپ۔ اُن کی یہ تصویر آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ ان کی مقناطیسی شخصیت کے جادو سے آنکھ دو چار ہوتے ہوئے بھی میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فی الواقعہ میں نے ایسا بے لوث خدمتِ ادب کا جذبہ اور کہیں نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے انھیں اس کام کے لیے منتخب کیا اور اس کی ساری ذمہ داری ان کو سونپ دی جو انھوں نے آخری دم تک بے مثال، انتھک لگن، کے ساتھ نبھائی۔ "زمانہ" کو معیاری رسالہ بنایا۔ اس میں چھپنے والی چیزوں کے لیے ایک ایسا نایاب معیاری پیمانہ تیار کیا جو بے کم و کاست کھرے کھوٹے کی کسوٹی تھا۔ نہ سفارش، نہ ستائش، نہ گروپ بندی، نہ جماعت بازی، نہ طرفداری نہ ریاکاری — ان تمام لعنتوں سے اپنا ادبی دامن پاک و صاف رکھا۔ اعلیٰ پایہ کے با اصول، معروف و غیر معروف شعرا و ادبا سے رابطہ قائم کرنا اور ان سے بلا معاوضہ بہترین چیزیں لکھوانا۔ نئے لکھنے والوں کو ڈھونڈنا، پہچاننا، اپنے حلقۂ احباب میں لانا کوئی معمولی کام نہ تھا جو نگم صاحب نے اپنے ذمے لیا اور بخوبی نبھایا۔ اسی تگ و دو اور جان سپاری کا نتیجہ تھا کہ اردو کے بڑے سے بڑا شاعر، مضمون نگار اپنی تخلیقات "زمانہ" میں شائع کرانا باعثِ اطمینان و وقار سمجھتے تھے۔ چنانچہ اقبالؔ، فراقؔ گورکھپوری، عزیزؔ لکھنوی، ریاضؔ خیرآبادی، منورؔ لکھنوی، سرورؔ جہان آبادی، پریم چند وغیرہم مقتدر ہستیوں کے ارشاداتِ عالیہ "زمانہ" کے صفحات کو جگمگاتے رہے۔ فکر و نظر اور زبان و بیان کے نادر نمونے تخلیق ہوتے رہے اور اردو کا یہ خاموش اور کسی حد تک گمنام خادم چپ چاپ اپنے کام میں منہمک رہا۔ اس کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ اگرچہ اردو والوں نے اس بے غرض مجنوں کی وہ قدر نہیں کی اور اُسے وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا لیکن بہر حال قدرت نے اُن کو نیک اور

قابل اولاد سے نوازا اور اس طرح بے تو بھی یاراں کی کچھ تلافی کردی۔ نظر بد دور ان کے فرزندانِ ارجمند اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے اور اپنے یگانۂ روزگار باپ کا نام روشن کرنے والے بیشتر کہلائے۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ "زمانہ" کا جو ظاہری اور باطنی ڈھانچہ اس کے بانی ایڈیٹر صاحب نے پسند اور رائج کیا وہی تا دمِ آخر برقرار رہا۔ یہ مستقل مزاجی کی ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنا کتنا آسان، کتنا منفعت بخش ہوتا ہے لیکن اپنی دُھن کے پکے لوگ اپنے ارادہ سے متزلزل نہیں ہوتے۔ "زمانہ" کا وہی سادہ، کھُردرا نیلگوں سرورق، وہی سائز، وہی بلند معیار، اس کے آخری دم تک قائم رہا۔ سستی مقبولیت اور وقتی شہرت کے پیچھے بھاگنے والے اقتصادی فائدہ، اثر و رسوخ اور تعریف و توصیف تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ایوانِ تاریخِ ادب میں کوئی مقام حاصل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

"زمانہ" کے سرورق کی پیشانی پر لکھا رہتا تھا "زمانہ با تو نسازد، تو بہ زمانہ بساز" اور اس مقولہ پر منشی دیا نرائن نگم عمر بھر کاربند رہے۔ اگرچہ زمانے نے ان سے نہ نبھائی لیکن وہ ہمیشہ زمانے سے نبھاتے رہے اور پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ ان کے نام کے وارث اُن کی پیدائش کا جشن صدسالہ منا رہے ہیں۔ یہ اردو ادب کی ایک اور خدمت ہے جو منشی دیا نرائن نگم کے خاندان کی طرف سے ہو رہی ہے یقیناً منشی صاحب کی روح اس سے مطمئن و مسرور ہوگی۔ میں شاید اُن کے مداحوں اور "زمانہ" کے لیے لکھنے والوں میں سب سے پرانا خادم ہوں جو ابھی بہ قیدِ حیات ہے اور ان کی دکھائی ہوئی بے غرض خدمتِ اردو کی راہ پر بدستور چل رہا ہے۔ میں اپنی عقیدت کے پھول اُن کے لیے دعائے خیر کی شکل میں ارپن کرنے کی سعادت حاصل کرنا اُن کی روح اور اپنے من کی شانتی کا سادھن سمجھتا ہوں۔ خدا کرے ان کے پسماندگان اور اردو ادب کے ستاجرانِ عظیم منشی صاحب کی یادگار کی تشکیل کے کام میں دل و جاں سے ممد و معاون ہوں تاکہ آنے والی نسلیں اردو ادب و صحافت کے اس بے مثال خاموش خادم کے کارہائے نمایاں سے کماحقہ واقف ہو سکیں۔ فی الحقیقت ادائے فرض کا بہترین صلہ احساسِ ادائے فرض ہوتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

حسن ہم کو شیریں معلوم ہوتا ہے اسلئے کہ وہ ہماری زندگی کے ساتھ دیر تک قائم رہنے والے سرود پر رقص کرتا ہے، علم گراں بہا ہے اس لئے کہ ہمارے پاس اس کو مکمل کرنے کا وقت نہیں ہے۔　　ٹیگور

منشی دیا نرائن نگم ــــ ایک صحافی

علامہ ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری

آنجہانی منشی دیا نرائن نگم نے زمانہ کے ذریعہ کانپور کو جو شہرت بخشی ہے اسے اہل شہر بھلا نہیں سکتے۔ میں کوئی مفصّل مضمون فن اور شخصیت پر سپرد قلم نہیں کر رہا ہوں۔ یہ کام اور ناشن کا یہ قرض میں نے بہت پہلے چکا دیا ہے "نقوش" کے شخصیات نمبر میں منشی صاحب پر میرا مضمون چھپ چکا ہے۔ منشی صاحب اور "زمانہ" ہماری زیادہ توجہ کے مستحق ہیں اور وہ توجہ ان دونوں کو اب تک نہیں مل سکی ہے۔ سنا ہے کہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں منشی صاحب پر تحقیقی کام کی شروعات ہو چکی ہے۔ خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔ ابھی منشی صاحب کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنے والے بھی موجود ہیں جن لوگوں سے ان کی مشورت تھی وہ بھی مل جائیں گے مگر ڈھونڈنے سے۔ فراق صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے خط وکتابت اور ملاقاتوں پر بڑی پابندی کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔ عبدالقادر بیرسٹر ان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ میرے پاس علامہ اقبال۔ بیرسٹر عبدالقادر اور فراق کے خطوط موجود تھے جو انھوں نے مختلف ملکی، سیاسی اور ادبی مسائل پر منشی صاحب کو لکھے تھے یہ خطوط مجھ سے میرے بیٹے سید ابوالخیر کشفی پاکستان لے گئے تھے۔ کاش ان قیمتی اور تاریخی دستاویزات کا کوئی حصہ عزیزم منشی سری نرائن نگم سلمہ کے پاس محفوظ ہوتا۔ منشی صاحب کی عظمت صرف اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اردو صحافت کو درجۂ اعتبار تک پہنچا دیا۔

منشی صاحب نے اردو کے ادبی ماہناموں کی صحافت کو وہ سمت وجہت عطا کی جس پر آج کے تمام ادبی رسائل چل رہے ہیں۔ ادارت کے فرائض جس طور منشی صاحب نے پورے کئے۔ ان میں ان کا کوئی حریف نہیں یہ بات ضعیفی کی لغزشوں، بے خبری یا ارادت کیشی پر محمول نہ کی جائے۔ اردو کی پوری ادبی صحافت میری نگاہ میں ہے۔ جالب دہلوی، ظفر علی خاں، روزناموں کے میدان میں نامور ہیں۔ الہلال اور البلاغ مولانا ابوالکلام آزاد کی جولاں گاہ تھے۔ یہ اخبارات ان کے افکار اور ادبی شخصیت کا تعین تو کر سکتے ہیں صحافت کا نہیں۔ جالب دہلوی اور ظفر علی خاں صحافی تھے صحافت میں کسی پرچے

کی ترتیب وتہذیب دیکھی جاتی ہے۔ کام لینے کا ڈھنگ بھی خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔ منشی صاحب مدیر تھے۔ انھوں نے ایڈیٹری کی ہے۔ ادارت وصحافت کو ادعا ختم کر دیتا ہے۔ ذاتی فکر ونظر کی گہری چھاپ کھا جاتی ہے صحافی میزبان ہوتا ہے۔ علامہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ۔ نیاز صاحب، جوش صاحب حسرت موہانی اپنے میزبان آپ تھے۔ ان تمام اکابرین نے اپنے افکار ومعتقدات کے اظہار کے لئے اپنے جرائد کو وقف رکھا۔ مگر "زمانہ" کا انداز ہی نرالا تھا۔ یہاں تدوین وترتیب کی وہ شائستگی ہے جس پر صحافت اور ایڈیٹری ختم ہے۔

منشی صاحب ایک سفینہ تھے جو صحافت کے بیکراں کو سنبھالے تھا۔ منشی صاحب نے پرورش کی آزادانہ سوچ اور فکر۔ "زمانہ" کی تہذیب وترتیب اور منشی صاحب کی صحافیانہ سرگرمیاں ایک مستقل عنوان ہیں۔ ایک مفصل مضمون کا خاکہ میرے ذہن میں ہے۔ منشی صاحب نے اپنے مشوروں اور صلاحیتوں سے ادباء وشعراء کی ایک پوری فصل اور نسل تیار کی تھی۔ صحافت پر ان کے احسانات کا شمار مشکل ہے۔

دعا کریں کہ میری صحت اس موضوع پر ایک مستقل مضمون کا بوجھ اٹھا سکے

مُصوّر کا تخیُّل

وہ نہ فانی مسرتوں کا متلاشی ہے۔ نہ ان کے لئے کوشاں
لیکن اپنے آپ کو ان جمیل مجسمات کے بوسوں سے سیراب کرتا ہے
جو اس کے تخیل کی وسعتوں میں آباد ہیں۔
طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک وہ اُس منعکس نہر پر غور
کرتا ہے جس کو سورج کی شعاعوں نے روشن اور درخشاں بنا دیا ہے۔
زرد تتلیاں عشق پیچاں کی بیلوں میں منظر کی کیفیت کو دوبالا کر رہی ہیں۔
لیکن وہ ان چیزوں کو قابل اعتنا تصور نہ کرتے ہوئے،
فطرت کی اس حقیقت مسلّمہ کا انکشاف کرتا ہے ..... جو حیات انسانی
کے مقابلہ میں قطعاً لازوال وغیر فانی ہے۔

(زمانہ مارچ ۱۹۴۲ء) مولوی مقصود علی از شیلے

منشی دیا نرائن نگم ایک نصب العین "زمانہ" ایک تحریک اور سنگِ منزل

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب گوہاٹی

سورگیہ منشی دیا نرائن نگم ایک نصب العین تھے اور ان کی ادارت میں ۱۹۰۳ء سے ان کے وصال ۱۹۴۲ء تک پابندی سے شائع ہونے والا ماہنامہ رسالہ "زمانہ" ایک تحریک بھی تھا اور اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے کے نقطۂ نظر سے ایک سنگ میل بھی تھا۔ مدیر موصوف کا اردو کے لئے عزم و جوش، ایثار و ولولہ اسی بات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اقتصادی اعتبار سے گھاٹے کا سودا پسند کیا ورنہ ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کسی اعلیٰ سرکاری منصب پر بآسانی فائز ہو سکتے تھے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے پہلے دہوں میں گنتی کے طلبہ ہی بی اے تک پہونچ سکتے تھے بلکہ مڈل اور انٹرنس جیسے چھوٹے امتحانات پاس کر لینے پر در ہائے ملازمت وا ہونے لگتے تھے۔ دیا نرائن نگم بی اے تھے اور انھوں نے انگریزی ادبیات کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا اس دور کی اردو کی بے بضاعتی ان کے سامنے تھی۔ رگِ حمیت پھڑکی اور انھوں نے "زمانہ" کے اجراء پر غور کرتے ہوئے نیز اقتصادی پریشانیوں کی ہولناکی سے منھ پھیر کر اردو کے لئے ایک سنگ منزل فراہم کیا۔

زمانہ میں شعری و نثری تخلیقات کے علاوہ سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تاریخی، قومی موضوعات پر بھی مضامیں ہوتے تھے۔ مزید براں انگریزی، اردو، ہندی وغیرہ زبانوں میں چھپی کتابوں پر عالمانہ دیدہ ورانہ تبصرے بھی نکلا کرتے تھے۔ اداریوں اور تبصروں سے ابھرنے والی حقیقت و بصیرت ہر اعتبار سے درخورِ اعتنا ہوتی تھی۔ زمانہ کو منشی جی کے توسط سے مشاہیر کا تعاون حاصل رہا۔ کتنے لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اقبال کا قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے پہلے زمانہ ہی میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ آنولہ کے ایک مشہور و معروف علمیہ کا کشتہ شاعر جو گیا نے بریلی میں مجھے بتایا تھا کہ قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش منشی دیا نرائن نگم صاحب نے

اقبال، چکبست اور درگا سہائے سرور سے کی تھی۔ بلکہ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ ان تینوں شاعروں کو منشی جی نے خطوط ان کے اسامنے ہی لکھے۔ اگر تلاش کی جائے تو اس امر پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔ پیلی بھیت میں سرور صاحب کے ایک رشتہ دار ابھی حیات ہیں، شاید ان کی جانب رجوع کرنے پر خط ہاتھ لگ جائے۔ اقبال کو قومی ترانہ لکھ کر جو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی وہ "زمانہ" ہی کے توسط سے حاصل ہونا شروع ہوئی۔ بہرکیف "زمانہ" میں چوٹی کے شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اکبر الہ آبادی حالی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، یگانہ، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، نوبت رائے نظر، چکبست، موہن روآں، اثر لکھنوی اور دوسرے چوٹی کے شعراء کی شعری تخلیقات "زمانہ" کے شماروں میں چھپتے رہے۔ مشمول نثری تخلیقات بھی وقیع و معیاری ہوا کرتی تھیں۔

بدلتی دنیا اور اس کے ہم عصری میلانات و رجحانات سے قارئین کو روشناس کرانے میں "زمانہ" نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کی بات اکثر و بیشتر سننے میں آتی ہے مگر نہ جانے کیوں "زمانہ" کی کارکردگی پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ اردو علمیت آج تک "زمانہ" کی پرانی فائلوں کی ورق گردانی تو کرتی ہے مگر "زمانہ" نے اردو کو جو پلیٹ فارم فراہم کیا، زبان و ادب کو جو استعداد و توانائی دی اس کا جائزہ نہیں لیا جاتا۔ غالباً بہت کم اشخاص اس حقیقت سے آشنا ہوں کے کہ دھنپت رائے کو پریم چند منشی دیا نرائن نگم ہی نے بنایا۔ زمانہ نے تمام اصناف ادبیات کو پروان چڑھایا۔

بایں ہمہ زمانہ گھاٹے کا سودا رہا اور منشی دیا نرائن نگم نے جملہ تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھا بلکہ ۱۹۱۲ء سے ایک ہفتہ وار "آزاد" کو نکالنا شروع کیا۔ یہ ہفتہ وار خاصا مقبول ہوا بلکہ اس نے بہت بڑی حد تک "زمانہ" سے ہونیوالا مالی خسارے کو دور بھی کیا۔

منشی دیا نرائن نگم ہمہ جہت انسان تھے، بیباک صحافی، آنریری مجسٹریٹ، ممبر میونسپل بورڈ، کرائسٹ چرچ کالج میں اردو ادب کے پروفیسر، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کے نقیب و علمبردار، غرض کہ ان کی زندگی ہمیشہ سماج کے فلاح و بہبود کے لیئے وقف رہی۔ ہندوستان کی سیاسی تحریک کے لیے بھی انھوں نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ ۱۹۰۷ء میں لالہ لاجپت رائے کی جلا وطنی منٹو مارلو اصلاحات سے پیدا شدہ صورت حالات، رولٹ ایکٹ، ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقد آل انڈیا کمیٹی کا اجلاس وغیرہ مسائل پر منشی جی بے باکانہ لکھتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں گنیش شنکر ودیارتھی کی شہادت کے بعد کانپور میں ہندو مسلم فساد نہایت سنگین واقعہ تھا۔ منشی دیا نرائن نگم کے اپنے محلے کے بیشمار مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ سیکولرازم کی ایسی عظیم مثال پیش کی کہ کانپور کے ہندو مسلم حضرات

ابھی تک منشی دیا نرائن نگم کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔
آج کا اردو ادب جواب معیار و وقعت میں کسی زبان کے ادب سے آنکھیں چار کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ منشی جی کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اردو کے لیئے منشی دیا نرائن نگم واقعی ایک ایسے مرد کامل تھے جس کا پر تو درج ذیل شعر سے ابھرتا معلوم ہوتا ہے ؎

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

محبت مادری

کوئی انسان اور کوئی قوم ایسی پیدا نہیں ہوئی جس میں محبت مادری کا ذکر نہ ہو۔ ایسی کوئی قوم نہیں جس کے ادیبوں اور شاعروں نے اس سلسلہ میں خامہ فرسائی نہ کی ہو چنانچہ بزرگوں کے چند اقوال ہم اس جگہ نقل کرتے ہیں :-

۱۔ "صرف ماں سمجھ سکتی ہے کہ دوست رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ خوش رہنا کیا چیز ہے میرا دل ان حضرات کے لیئے افسوس کرتا ہے جو ماں کی خوشی کا احساس نہیں کرتے : رومن رولانڈ

۲۔ "اے مہر مادری تو مقدس ترین محبت ہے تیری ملکوتی عظمت کی توصیف اس آب گل کی زبان سے ممکن نہیں : گوتم بدھ

۳۔ "اگر تمام دنیا ایک بیکس کا ساتھ چھوڑ دے اور کسی ایک کیلیئے بھی اس کے دل میں ہمدردی باقی نہ ہو، پھر بھی اے ماں کی پاک محبت تو ایک مقدس ستارہ کے مانند اس لازوال آسمان پر ہمیشہ ثابت قدمی سے چمکتی رہے گی : افلاطون

۴۔ "ان آنکھوں کو یاد کر جو ہر ساعت تیری جستجو میں رہتی ہیں اور تیری خوشی کا سامان مہیا کرنے میں سرگرداں تھیں۔ ان ہاتھوں کو یاد کر جو راتوں کو اپنی شفقت کی وجہ سے تیرا درد دور کرنے کے لیئے ذرا بھی ساکت نہیں ہوئے۔ اس گھڑی کو یاد کر جب اس نے تیری خاطر زخم پر زخم کھائے اور پھر بھی جاں نثار رہی۔ اور پھر دو زانو ہو جا اور ماں کیلیئے دعائے خیر کر : رابندر ناتھ ٹیگور

۵۔ "صرف ایک محبت ہی ایسی نعمت ہے جو حقیقتاً مکمل اور خدائی ہے اور یہ وہی محبت ہے جو ماں کو اولاد سے ہوتی ہے : موریس دونی

(مشیر احمد انصاری)

منشی دیانرائن نگم اور "زمانہ" کی ادبی خدمات

ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کاشمیری

منشی دیانرائن نگم ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو کانپور میں ایک معزز کالیستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۲۱ برس کی عمر میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے ۱۹۰۳ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال "زمانہ" کی ادارت قبول کی۔ ۱۹۱۲ء میں "آزاد" ہفتہ وار جاری کیا جو کچھ عرصہ تک روزانہ رہا۔ ۱۹۱۵ء میں آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

رام بابو سکسینہ مزید لکھتے ہیں:-

"آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں جس میں معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخباری غرضیکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سوشل ریفارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال، اور سیاسیات میں اعتدال پسند ہیں۔ تعلیمی اور ادبی مشاغل میں خاص کر آپ کو توغل ہے۔ اور بحیثیت ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے نوجوانوں کے لئے خضر طریقت ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کریں۔ آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بہبودی اور ترقی میں صرف کر دی۔ "زمانہ" کا شمار اردو کے ان مخصوص چند پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں بلاتفریق مذہب وملت مضامین لکھتے ہیں۔ اس کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنی اصابت رائے کے واسطے مشہور ہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت جچے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں مگر ہم کو افسوس اور شکایت ہے کہ ان کے مضامین سے پرچہ زیادہ تر فیضیاب نہیں ہوتا۔ منشی صاحب ہندوستانی اکاڈمی کے ایک پرجوش اور سرگرم ممبر بھی ہیں"[1]

سکسینہ صاحب نے نگم صاحب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار آج سے ۵۵ - ۵۰ سال قبل اس وقت کیا تھا جب کہ وہ انگریزی میں "ہسٹری آف اردو لٹریچر" مرتب کر رہے تھے۔ اس زمانے میں "زمانہ" عالم شباب میں تھا۔ اور اس کی چالیس جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔

۱۔ تاریخ ادب اردو، طبع چہارم ۱۹۶۶ء مترجمہ مرزا محمد عسکری

"زمانہ" کی فائلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نگم صاحب ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے دلدادہ تھے۔ ان کا دل مذہبی اور سیاسی تعصب سے آئینے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ زندگی کے نصب العین میں حسن عمل اور اعلیٰ کارکردگی کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اعلیٰ قدروں کے پابند تھے کبھی کسی وقت مصلحت یا سیاسی دباؤ کے تحت دوسرے فرقوں کے بارے میں آشیانۂ دو عملی کو دل میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ کانپور میں ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کی مسجد کا ہنگامہ برپا ہوا۔ مسلمان جوش میں آگئے، مظاہرہ کیا، کئی مسلمان گولی کا نشانہ ہوگئے۔ نگم صاحب نے ایک زبان ہوکر انگریزوں کی اس دہشت گردی اور بربریت کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹۳۱ء میں کانپور میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ اس میں موصوف نے بڑی فراخدلی سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور مہذبانہ برتاؤ کیا اور محلے کے اجڑے ہوئے مسلمانوں کو اپنے مکان میں پناہ دی۔

نگم صاحب نے زمانہ میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے تحریک آزادی کو بڑی تقویت بخشی۔ انھوں نے "آزاد" کے ذریعہ آزادیٔ ہندوستان کی شمع فروزاں کرنے کے لئے عمر بھر جدوجہد کی۔ خود اخبار کا نام "آزاد" اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ غلامی کے خلاف ایک احتجاج اور آزادی کا سمبل تھا۔ انھوں نے نامساعد حالات اور تنگ دستی میں محض ایک خاص جذبے کی بنا پر ۱۹۱۲ء میں اخبار نکالنا چاہا تھا۔ اس سلسلے میں منشی پریم چند سے بھی تعاون کی درخواست کی۔ منشی صاحب اگست ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں نگم صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کا ہفتہ وار "کامریڈ" کے نمونے کا ہونا چاہیے۔ مجھ سے جو مدد ہوسکے گی۔ کرتا رہوں گا۔ فی الحال میری طاقت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ کچھ ایثار کرسکوں ـــــ نام "ہندو" بہت موزوں تھا۔ ـــ میں ہفتہ وار کیا، دو ہفتے بلا ناغہ آپ کی خدمت میں بھیجا کروں گا۔ کچھ نوٹ ہوں گے۔ بن پڑا تو کوئی ایڈیٹوریل، کبھی کسی مضمون کا ترجمہ، کبھی کچھ، مگر اخبار کا نمونہ کامریڈ ہی ہو۔ پالیسی ہندو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتماد نہیں رہا۔"[۲]

نگم صاحب کی دوراندیشی اور تدبر دیکھئے کہ انھوں نے پریم چند کے مجوزہ "ہندو" نام کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ موصوف نے ہندوستان کی قومی یکجہتی اور مختلف فرقوں میں سیاسی ہم آہنگی کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے اخبار کا نام آزاد رکھا۔ اور نومبر ۱۹۴۲ء یعنی ان کی موت تک برابر ہندوستانی عوام کی ترجمانی کرتا رہا۔

جب آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقد ہوا تو نگم صاحب نے اس موقع پر زمانہ کا ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا جس میں مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو اور دوسرے سرکردہ

[۱] "کامریڈ" محمد علی جوہر انگریزی میں کلکتے سے نکالتے تھے۔
[۲] پریم چند کے خطوط صفحہ ۳۲ تا ۳۳ مرتبہ مدن گوپال مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی

رہنماؤں کے پیغامات بھی درج ہیں۔

نگم صاحب بڑے باغ و بہار آدمی اور شریف النفس تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے مستند شاعر حضرت جوشؔ ملیح آبادی جو بڑی سے بڑی شخصیت سے بآسانی متاثر نہیں ہو سکتے ہیں نگم صاحب کے حسنِ کردار اور اعلیٰ اقدار سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے موصوف کے جوہرِ کردار کی اپنی ایک شاہکار نظم "نگاہِ خلوص میں" میں اس اسلوب سے ڈھالا کہ نگم صاحب سراپا پیکرِ خلوص نظر آتے ہیں۔ نظم میں ایک شریف انسان کی شرافت و بزرگی کے تمام خد و خال سامنے آجاتے ہیں۔ "نگاہِ خلوص میں" آج سے پورے چالیس سال قبل نگم صاحب کی زندگی میں پہلی مرتبہ جوشؔ کی مشہور و معروف کتاب "آیات و نغمات" (ص ۲۶ تا ص ۲۸) مطبوعہ مکتبۂ اردو لاہور سنہ ۱۹۴۱ء میں چھپی تھی۔

ہنس راج رہبر نگم صاحب کے اخلاق و کردار کے بارے میں لکھتے ہیں[1]:

"منشی دیا نرائن نگم بہت ہی شریف اور نیک واقع ہوئے ہیں۔ اور نہایت خلوص اور محنت کے ساتھ "زمانہ" کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایڈیٹر کا فرض ادب کو سنوارنے کے لئے وسعت دینا ہے۔ جہاں اُسے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنا ہوتا ہے وہاں نئے اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ وہ اپنے اس فرض کو بدرجۂ اتم نبھا رہے تھے۔ وہ لکھنے والوں کے ساتھ جھٹ دوستانہ تعلقات قائم کر لیتے تھے میں اپنے تجربے سے ان کی حوصلہ افزائی اور انسان دوستی کا قائل ہوں سنہ ۱۹۳۶ء میں میں نے انھیں اپنا ایک افسانہ "پچھتاوا" بھیجا۔ پہلے ان سے مطلق جان پہچان نہیں تھی۔ اور میری افسانہ نگاری کی ابتدا تھی۔ انھوں نے نہ صرف وہ افسانہ "زمانہ" میں شائع کیا بلکہ فوراً ہی ایک خط لکھ کر کامیاب افسانہ لکھنے پر مبارکباد پیش کی اور متواتر لکھتے رہنے کا تقاضا کیا۔ پھر جب تک مرحوم زندہ تھے، ان سے خط و کتابت رہی۔ انھوں نے نہ صرف ہمیشہ حوصلہ افزائی کی بلکہ نیک مشورے بھی دیئے۔"

نگم صاحب کو آخر عمر میں گوناگوں آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا عرصۂ حیات آہستہ آہستہ تنگ ہونے لگا۔ جولائی سنہ ۱۹۳۹ء میں ان کی بیوی مختصر علالت کے بعد غیر متوقع طور پر انتقال کر گئیں۔ دل کو چور چور کرنے کے لئے یہ صدمہ کیا کم تھا کہ ایک اور کوہِ غم ٹوٹ پڑا یعنی بیوی کے انتقال کے صرف پندرہ روز کے بعد ان کی جواں سال صاحبزادی جن کا سن ۲۰ برس کا تھا ماں کے فراق میں باپ کو ایک اور داغِ جدائی دے کر رخصت ہو گئیں۔ ابھی بیوی اور صاحبزادی کی یاد تعزیت اٹھنے نہیں پائی تھی کہ موصوف کو اپنے چھوٹے بھائی رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر کی میت بھی فروری سنہ ۱۹۴۱ء میں اٹھانی پڑی۔ اللہ! اللہ! یہ وہ جانکاہ سانحات تھے کہ جنھوں نے نگم صاحب کے شیشۂ دل پر سنگِ گراں کا کام کیا اور ان کے دل و دماغ کے تار و پود منتشر ہو گئے۔ ان کی نظر میں دنیا ویران ہو گئی اور زندگی کے حسین لمحات سنسان نظر آنے لگے۔ ہجومِ رنج و الم کے باعث شروع ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں دل کی بیماری لاحق ہو گئی۔ ۱۸ ستمبر سے

---

[1] پریم چند ص ۲۷ مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی بار دوم مئی سنہ ۱۹۵۰ء۔

صاحب فراش ہوئے اور گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہیں رہے۔ علاج معالجہ خوب کیا لیکن بے سود، دل پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ اب قویٰ بھی مضمحل ہو گئے اور لگتا تھا کہ تارِ نفس چند ہی دنوں میں ٹوٹنے والا تھا۔ آخر کار پہلی اور دوسری نومبر ۱۹۴۲ء کی درمیانی رات ایک بجے کے قریب دل کا ایسا دورہ پڑا کہ علم و ادب اور آسمانِ صحافت کا یہ مہرِ درخشاں ساٹھ سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ ع

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

نگم اور زمانہ:- "زمانہ" اردو ادب کا شہرۂ آفاق ماہنامہ تھا۔ یہ فروری ۱۹۰۳ء میں پہلی مرتبہ منشی شیو برت لال ورمن ایم۔ اے کی ادارت میں قیصری پریس واقع بریلی سے شائع ہوا تھا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں "زمانہ" منشی دیا نرائن نگم کی ذمہ داری اور ادارت میں پھلنے پھولنے لگا اور جون ۱۹۴۹ء تک یعنی ۴۶ سال کے عرصۂ دراز میں ۹۲ جلدوں میں اردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔ ہر جلد جنوری سے جون تک چھ ماہی ہوتی تھی۔ ابتدا میں اگرچہ زمانہ کا دفتر نئی چوک کانپور میں تھا لیکن یہ بریلی ہی میں چھپتا تھا۔ چند ہی مہینوں کے بعد نگم صاحب نے کانپور میں اپنا ذاتی پریس کھولا۔ یہ رسالہ ابتدا ہی سے شہرت سے ہمکنار ہوا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔ ان میں شبلی، حالی، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، آغا شاعر قزلباش، حسرت موہانی، سرور جہان آبادی، نوبت رائے نظر، چکبست لکھنوی، شاد عظیم آبادی، سورج نرائن مہر، محشر لکھنوی، شاد حیدر آبادی، عزیز لکھنوی، پیارے صاحب رشید، علی محمد عارف، نادر کاکوروی، اثر لکھنوی، صفی لکھنوی، ریاض، آرزو لکھنوی، ظریف لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی، عشرت لکھنوی، منشی جوالا پرشاد، منور لکھنوی، علامہ کیفی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، برق دہلوی، پنڈت کشن نرائن در، ابر، سید سلیمان ندوی، پیارے لال شاکر، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، شیخ عبدالقادر، مولوی عبدالحق، وقار الملک، مرزا سلطان احمد، مولوی ذکاء، اللہ، تیرتھ رام فیروزپوری، اقبال بہادر سکسینہ، منشی پریم چند، ونستہ پرشاد فدا، سر تیج بہادر سپرو، وحید الدین سلیم پانی پتی، مجنوں گورکھپوری، .... فراق گورکھپوری، سید مسعود حسن رضوی، عزیز بلگرامی، بیتاب دہلوی۔ محمد یحییٰ تنہا، ضیاء الدین برنی، حامد حسن قادری، نیاز فتح پوری، نظم طباطبائی، پروفیسر محمد حبیب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

زمانہ اور منشی پریم چند میں چولی دامن کا ساتھ رہا۔ موصوف کے قریب ایک سو افسانے اور ڈرامے زمانہ میں شائع ہوئے۔ ان کا تاریخی ڈرامہ "کربلا" اس میں جولائی ۱۹۲۹ء میں قسط وار چھپنا شروع ہوا جو اب کتابی صورت میں آگیا ہے۔ یہ نگم ہی تھے جنھوں نے پریم چند کو حیاتِ ابدی بخشی۔ ۱۹۰۴ء کے آخر تک پریم چند "زمانہ" کے قلمی معاونین میں شامل ہو چکے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک تنقیدی مضمون ۱۹۰۵ء میں زمانہ میں بغرض اشاعت اور ایک ناول کا مسودہ ایڈیٹر کے مشورے کے لئے بھیجا تھا۔[1] ان کی

[1] پریم چند کے خطوط ص ۳۱۔

پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" سنہ ۱۹۰۷ء میں زمانہ میں چھپی تھی۔ سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک موصوف ادارۂ زمانہ سے کانپور میں منسلک رہے۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے آخر میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور میں چھپا۔ انگریز اس کی اشاعت سے برہم ہوئے اور انھوں نے اس کی کوئی سات سو جلدیں ضبط کیں۔ نگم صاحب کو پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کے پاداش میں پچاس روپیہ کا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اً مذمت لکھنے کے لئے انھوں نے وصنیت رائے اور نواب رائے کے بدلے دنیائے ادب میں پریم چند کے فرضی نام کو ایجاد کرکے ایسا چمکایا کہ لوگ ان کے اصلی نام سے واقف نہیں ہیں۔ یہ فرضی نام پریم چند کو بھی پسند آیا۔

اس بارے میں نگم صاحب پریم چند نمبر میں لکھتے ہیں:-

"پریم چند شروع میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور یہ نام انھیں بہت عزیز تھا کیونکہ ان کے والد پیار سے انھیں "نواب" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور یہ نام ہندو مسلمان کے معاشرتی اتحاد کو بھی تازہ رکھنے والا تھا۔ مگر جب "سوزِ وطن" کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد ان کے افسروں نے انھیں تصنیف وتالیف کی ممانعت کر دی تو ان کو اس نام کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان تنگ خیال افسروں کا بس چلتا تو آج ہندوستانی ادب میں پریم چند کا وجود ہی نہ ہوتا۔۔۔۔ نواب رائے کی روح نے "پریم چند" کے قالب میں جنم لیا۔ یہ نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا۔ اور عرصے تک وہ اس نام سے صرف "زمانہ" میں ہی لکھتے رہے۔ یہ پابندی خود ان کی محبت نے ان پر عاید کی تھی۔ ورنہ اس کا کوئی مطالبہ یا معاہدہ نہ تھا"

اس امر کا اعتراف خود پریم چند نے ۴ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں بھی کیا تھا جو انھوں نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا۔ کہتے ہیں:-

"نواب رائے میں ہی تھا۔ جب سوزِ وطن لکھنے کے بعد مجھے ڈپارٹمنٹ نے مضامین لکھنے سے مجبور کر دیا اور ڈپارٹمنٹل سختیاں شروع کیں تو میں نے بابو دیانرائن کے مشورے سے یہ نام تجویز کیا۔"[1]

نگم صاحب لین دین کے معاملے میں بالکل کھرے تھے۔ وہ پریم چند کو زمانہ میں لکھنے کے لئے ہمیشہ معاوضہ دیا کرتے تھے۔ یہ معاوضہ پانچ سے دس روپے تک کا ہوتا تھا۔ نگم کے نام ایک خط میں پریم چند مورخہ ۲۲ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں:-

"میرے پانچ قصے زمانہ میں نکل چکے ہیں۔ ۱۔ روٹھی رانی ۲۔ حیات، ۳۔ ممتا ۴۔ لال فیتہ، ۴۔ تقدیر ۵۔ موٹھ۔ ان کا جو معاوضہ مناسب سمجھیں دیں۔"

"زمانہ اپنے تمام معاصر رسائل، خدنگِ نظر، لکھنؤ، اردوئے معلی علیگڈھ، مخزن، لاہور۔ ادیب الہ آباد، الناظر لکھنؤ، معارف اعظم گڈھ، عصرِ جدید میرٹھ، دکن ریویو، دلگداز لکھنؤ۔

[1] پریم چند کے خطوط صہ ۲۱۵

شباب اردو لاہور، ہمایوں لاہور، صوفی پنڈی بہاء الدین پنجاب، تہذیب لکھنؤ، معیار لکھنؤ وغیرہ میں غیر معمولی شہرت کا حامل تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ نگم کی ادارت میں تقریباً چالیس سال تک پروان چڑھتا رہا۔ اس عرصۂ دراز میں۔ اردو کے بہترین اور اعلیٰ ترین شاعر، انشاء پرداز افسانہ نگار، ناول نویس، محققین، ناقدین، مورخین اور دیگر ماہر فنون نے اپنی بیش بہا نگارشات سے زمانہ کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کو فروغ دینے میں غیر مسلمین کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مسلمانوں کا ہے۔ اب صرف آبادی کے تناسب کے اعتبار سے اندک و لبسیار والی بات ہے، زمانہ کی بے مثال ادبی خدمات کے پیش نظر ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ نگم صاحب اردو زبان کی ترقی کے لئے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے ایک سنگم تھے۔

زمانہ میں بہت سے شعرا کا وہ کلام بھی ملتا ہے جو ان کے کسی مجموعہ میں آج تک نہیں چھپا ہے اگر یہ کلام یکجا کر کے مرتب کیا جائے تو اردو ادب میں کئی دواوین کا اضافہ ہو سکتا ہے اسی طرح اس کے شماروں میں بہت سے مضامین اور افسانے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہیں۔ ان میں اقبال کی تحریریں اور پریم چند کے افسانے قابل ذکر ہیں۔[1]

زمانہ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس میں اقبال کی شہرۂ آفاق نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ یہ نظم بعد میں مخزن لاہور جلد ۸ نمبر ۱ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۱۲ء میں ادیب الہ آباد میں شائع ہوئی تھی۔

---

[1] چونکہ ادارہ کی طرف سے رسالہ زمانہ سے اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس مضمون سے اقتباساتِ زمانہ حذف کر دیئے گئے ہیں۔

منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ"

جناب ڈاکٹر اہل سمر شیر صاحب

اردو زبان ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب و ثقافت اور تمدن کا ایک قیمتی ورثہ ہے۔ اسکی ترویج و اشاعت میں اگر ایک طرف مسلمانوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے تو دوسری طرف ہندوؤں نے بھی اپنے خونِ جگر سے اسکی آبیاری کی ہے۔ پریم چند کی ادبی خدمات کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ ایک طرف وہ اردو مختصر افسانہ کے بانی ہیں تو دوسری طرف انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستان کے دیہاتوں کی سماجی زندگی کو پیش کر کے اردو ناول کو ایک نئی سمت دکھائی۔ پریم چند، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت دتاتریہ کیفی، سر تیج بہادر سپرو اور منشی دیا نرائن نگم سے لے کر کرشن چندر، کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ اور اوپندر ناتھ اشک تک اور پھر وشوامتر عادل، بلراج مینرا، جوگیندر پال، بلونت سنگھ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بلراج کومل، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ سے لیکر فلمی دنیا کے آنند بخشی اور گلشن نندا تک اردو زبان و ادب نے جو تاریخ کا فاصلہ طے کیا ہے وہ جلوۂ صد رنگ نہیں ہزار رنگ ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ اور بھی کتنے نام ہیں جو ماضی اور حال کے روزن سے اپنی کرنیں پھیلاتے رہے ہیں اور پھیلا رہے ہیں۔ ان لوگوں کی خدمات آج بھی مینارۂ نور بنی ہوئی ہیں۔ اور پھر لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مانا کہ ان دو نوں کی ادبی تخلیقات اب تک دیکھنے میں نہیں آئی ہیں مگر ان کے لبوں سے اردو کی میٹھی اور سریلی آواز کے رس بھرے نغمے جو ہمارے کانوں میں پڑ کر دل کے تاروں کو جھنجھوڑتے رہے ہیں اسے ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔

زبان و ادب ہو یا فلسفۂ و حکمت اس میں جاں سوزی اور جاں سپاری کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے بڑے خلوص، جذبے اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تاریخ کے دھاروں کو موڑنے کے لئے خار دار وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں آبلہ پا بھی چھل جاتے ہیں اور تب سینوں کے

پل چلنا پڑتا ہے۔ منزل انھیں لوگوں کو ملتی ہے۔ ایسے ہی باہمت اور بلند حوصلہ لوگوں میں منشی دیا نرائن نگم بھی تھے۔ نگم صاحب نے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک رسالہ "زمانہ" نکالا جو ادب کے افق پر طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہندوستان کے اہم ترین اردو رسالوں میں اعلیٰ ترین مقام پر پہونچ گیا یہ رسالہ پہلے بریلی سے نکلتا تھا پھر اس کا دفتر کانپور منتقل ہوا۔ اس رسالہ میں اس زمانہ کے تمام نامور شعراء ادیب اور انشاپرداز مثلاً مولانا نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، لالہ لاجپت رائے، رام تیرتھ اور نظم میں حالی، شوق قدوائی، شاد عظیم آبادی، اکبر الٰہ آبادی وغیرہ اس کے قلمی معاونین میں سے تھے۔ "زمانہ" اپنے دوسرے دور میں ایک نئی شان ایک نئی آن بان اور شباب آفرینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس عہد کے لکھنے والوں میں منشی پریم چند، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال اور درال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "زمانہ" ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ پھر زمانہ کا تیسرا دور آیا جب وہ اپنی سنجیدگی اور پختہ کاری کی وجہ سے عوام اور خواص کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔

"زمانہ" جس وقت نکلا تھا اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات آج سے بالکل مختلف تھے صحافت کا معیار بھی کچھ عجیب تھا۔ اس وقت اردو کے اخباروں میں کرزن گزٹ، نیر اعظم، وکٹوریہ پیپر اور دبدبۂ سکندری جیسے اخبار جاری تھے۔ اور رسالوں کے عوض گلدستے نکلا کرتے تھے جن میں طرحی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان گلدستوں میں پیام عشق، گلبن سخن، گلچیں، عطر فطنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "زمانہ" اپنے زمانے اور رنگ کا سب سے نیا اور مختلف رسالہ تھا جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے ہر جگہ بے حد مقبول تھا۔ اس زمانہ میں اردو کے اور بھی رسائل نکلے اور بے شک ان رسالوں نے ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ ان رسالوں میں اردوئے معلیٰ، الناظر اور ادیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر یہ سب رسائل اپنی عارضی چمک دکھا کر بند ہو گئے۔ چونکہ ان میں حادثات کے تھپیڑوں کی تاب لانے کی طاقت نہ تھی۔ ان رسائل میں صرف زمانہ ہی ایسا تھا جس نے ہر مشکل کا جرأت اور بہادری سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اخبار اور رسائل کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ ہمیشہ دولت مند ہاتھوں یا کسی سیاسی تحریک ہی کے سہارے زندہ رہتے ہیں مگر نگم صاحب نہ تو کسی سیاسی جماعت کی مصلحت آمیزی سے متاثر ہوئے اور نہ رسالے کی مالی پریشانی سے گھبرا کر کسی دولت مند کے در کی جبہ سائی کی۔ انھوں نے صرف اپنی محنت، لگن اور ایثار سے "زمانہ" کو صرف ایک ادبی رسالہ بنائے رکھا اس کے لیے انھیں بہت سی قربانیاں دینی پڑیں۔ میر، مومن، غالب اور بیشمار شاعروں اور ادیبوں کو خودداریاں مشہور ہیں۔ ان لوگوں میں بہتوں کو معاشی بحران کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان لوگوں کو سوسائٹی میں جو عزت و آبرو حاصل ہوئی وہ صرف اپنی ادبی اور شاعرانہ عظمت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ بادشاہ، نواب اور امرائے وقت نے سرپرستی بھی کی۔ محض زبان و ادب کی خدمت کی وجہ سے

کسی کو تلخ حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مگر نگم صاحب کی پوزیشن بالکل برعکس تھی۔ اردو والوں نے آزمائش کے وقت ان کی مدد نہ کی۔ دوسری طرف خود ان کے لوگوں نے ان کے راستے میں بے پناہ رکاوٹیں پیدا کیں۔ انھیں گالیاں دی گئیں، دھمکیاں دی گئیں۔ مگر نگم صاحب نے تنہا ڈٹ کر سب کا مقابلہ کیا۔

نگم صاحب کے کام کرنے کا بھی انداز دوسروں سے الگ تھا۔ وہ ایک اڈیٹر کی حیثیت سے اپنے رسالہ میں صرف مضامین کی ترتیب نہ دیتے بلکہ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے بہت سے ایسے شاعروں، ادیبوں، اور دانشوروں کو پیدا کیا اور عوام کے سامنے پیش کیا جو ایک امتیازی شان کے مالک بننے والے تھے۔ جو اپنے منفرد اسلوب، اسٹائل اور ہمہ گیری کی وجہ سے بعد میں صرف زبان و ادب ہی کے نہیں بلکہ ملک کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوئے۔ پریم چند کو شہرت کی بلندی پر نگم صاحب ہی نے پہنچایا۔ سرور جہان آبادی اور چکبست کی نیچرل اور قومی شاعری نگم صاحب ہی کی فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ یہ تو مثال کے لیے صرف چند نام ہیں اور بھی کتنے شاعر اور ادیب ہیں جن کی شاعری، ادب اور صحافت کو نگم صاحب نے سنوارا، سجایا اور چمکایا۔

نگم صاحب اور "زمانہ" لازم اور ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ زمانہ اگرچہ ایک ادبی پرچہ تھا مگر نگم صاحب اپنے قارئین کے اندر سیاسی شعور بھی بیدار کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ آخر میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے سیاستِ عالم کو بھی پیش کرتے۔ واقعات اور حالات پر تبصرہ کرتے۔ حکومت کے طرزِ عمل پر آزادانہ اپنی رائے پیش کرتے۔ یہ زمانہ برطانوی اقتدار کا تھا۔ جہاں بہت سی دشواریاں تھیں۔ مگر نگم صاحب اپنے خیالات کے اظہار میں بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیتے۔

نگم صاحب کانپور میں رہتے تھے اور کانپور اس زمانہ میں ہندو مسلم فساد کا مرکز تھا۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان ان تلخیوں کے اثرات کانپور تک محدود نہ تھے بلکہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مگر نگم صاحب بڑے حوصلے اور جرأت مندی کے ساتھ اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور وہ ایک سیکولر انسان تھے اور اس کے علمبردار بھی۔ وہ ہندو مسلم مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خاص کر وہ مسلمانوں کیلیے ایسا ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے جس کی مثال اس زمانہ میں کسی ہندو یا مسلمان کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔

کتابوں اور رسالوں پر تنقید علمی جرائد کا لازمی جزو ہے۔ نگم صاحب کے رسالہ "زمانہ" میں تمام علمی، سیاسی اور ادبی کتابوں پر تبصرہ ہوتا تھا۔ رسالہ کے پرانے فائلوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کتابوں پر تبصرہ اور تنقید کس گہری نگاہ سے کیا جاتا تھا اور کس طرح کی ادبی موشگافیاں کی جاتی تھیں۔

نگم صاحب صرف ایک اچھے صحافی اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ

اپنے مضمون نگاروں اور قلمی معاونین کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ وقت پڑنے پر مالی تعاون بھی کرتے تھے۔ یہ ان کی بلند اخلاقی ہی تھی کہ "زمانہ" سے بہتر اور بلند پایہ مضمون نگار کسی رسالہ کو اس زمانہ میں حاصل نہ تھے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ نگم صاحب صرف ایک بلند پایہ صحافی ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ خود اچھے مضمون لکھتے دوسروں سے لکھاتے۔ ان کی شخصیت کے رنگارنگ پہلوان کے خطوط سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں ایسی چاشنی، رنگینی اور بے ساختہ پن ہے جس کی مثال غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ پڑھیے اور قدم قدم پر مچلتے جائیے۔ ضرورت ہے کہ ان کے تمام مضامین کو جو رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔

رسالہ "زمانہ" ان کی زندگی کا حاصل تھا جس کے لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی زمانہ کا اپنا پریس تھا۔ زمانہ کے علاوہ نگم صاحب نے ایک ہفت روزہ "آزاد" بھی نکالا تھا جو ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا اور تقسیم ہند کے بعد تک جاری رہا۔ اس کے اجرا کی تحریک مسجد کانپور کی شہادت سے ہوئی۔ نگم صاحب کو مسلمانوں کے حقوق کا خاص خیال تھا جس کے لیے وہ ہمیشہ بے باکی سے اظہار کرتے۔ وہ گاندھی جی کے بڑے معتقد اور کانگریس کی تحریک کے حامی تھے اس لئے "زمانہ" میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے جو سیاست عالم پر تبصرہ ہوتا اس میں نیشنلزم، ہندوستانی زبان، سوراج، مہاتما گاندھی اور ہندوستانی تمدن وغیرہ کے مسائل پر اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔

نگم صاحب محفل میں جان محفل بن جاتے۔ دوستوں کے ساتھ گفتگو میں طنز بڑا شیریں مگر جوشیلا ہوتا تھا۔ الفاظ نرم ہوتے تھے مگر ان میں تلوار کی کاٹ ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں ان کے مضامین میں اور خطوط میں بھی ملتی ہیں۔ نگم صاحب کا ایک مضمون ہندوستانی زبان کے مسئلے پر "زمانہ" کے "قومی نمبر" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے آج بھی ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں نگم صاحب نے پریس، رسم الخط، اصطلاحات، اسلوب اور نظام تعلیم کے تمام پہلوؤں پر گہری بصیرت کا اظہار کیا ہے۔

نگم صاحب کی ذات بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں اردو کے استاد رہے، آنریری مجسٹریٹ ہوئے، میونسپل بورڈ کے لیے منتخب ہوئے۔ نگم صاحب کے والد جو کچہری میں پیشکار تھے وہ اپنے لڑکے کو وکیل بنانا چاہتے تھے مگر نگم صاحب نے وکالت کے پیشے کو کبھی اچھا نہیں سمجھا اور اردو دنیا کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی ذات اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادب کا یہ درخشندہ ستارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ ان کے لائق فرزند سری نگم نے زمانہ کا "یادگار نمبر" ۱۹۴۳ء میں نکالا جو نگم صاحب کی یاد میں نذرانہ عقیدت ہے۔[1]

---

[1] آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے شکریہ کے ساتھ۔

خراج عقیدت

جناب گوپال متل صاحب ایڈیٹر تحریک

یہ امر موجب مسرت ہے کہ ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں منشی دیا نرائن نگم کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے۔ اسی موقع پر ایک یادگار نمبر بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

یوں تو منشی دیا نرائن نگم اور ان کے رسالے "زمانہ" کا پوری اردو دنیا پر احسان ہے لیکن میں نگم صاحب کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کیونکہ "زمانہ" پہلا ادبی جریدہ تھا جس تک میری رسائی ہوئی۔ ہر چند کہ مخزن اس سے پہلے نکل رہا تھا لیکن میری رسائی مخزن تک بعد میں ہوئی اور سر عبد القادر سے تو بعد میں مجھے ذاتی ملاقاتوں کا بھی شرف حاصل ہوا جن کا میرے ادبی ذوق کی نشو و نما میں بڑا دخل ہے۔

"زمانہ" میں اس دور کے بھی ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شائع ہوتی تھیں جن میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، چکبست اور فانی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ 'زمانہ' یوں تو ایک ادبی جریدہ تھا لیکن اس میں دیگر موضوعات پر بھی بہت اچھی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔

سماجی اصلاحات کے نگم صاحب خاص طور پر حامی تھے۔ انھوں نے بیواؤں کی شادی کی حمایت بھی کی اور صغر سنی کی شادی اور جہیز کی مخالفت بھی۔ سیاسی معاملات میں بھی نگم صاحب دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب کانپور میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا تو اس موقع پر انھوں نے "زمانہ" کا خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ ادبی جرنلزم اور اردو زبان کی ترقی میں نگم صاحب نے جو حصہ لیا ہے اس کا سبھی کو اعتراف کرنا پڑے گا اور یہ اعتراف ہوا بھی ہے۔ جن ممتاز شخصیتوں نے ان کی خدمات کو سراہا ان میں مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور اور سر تیج بہادر سپرو کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

فرقہ واریت کے خلاف انھوں نے زبردست قلمی جہاد کیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب کانپور میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے تو انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ ان کے خلاف آواز بلند کریں بلکہ اپنے گھر کے دروازے مقامی مسلمانوں پر کھول دئے

منشی دیا نرائن نگم ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں انھوں نے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ کچھ ہی دن پہلے بریلی سے "زمانہ" جاری ہوا تھا جس کی ادارت کا بار انھوں نے نومبر ۱۹۰۳ء سے اٹھایا اور بریلی سے دفتر کانپور میں منتقل ہو کر آیا "زمانہ" کے علاوہ انھوں نے اپنے سماجی اور سیاسی خیالات کے وسیع تر فروغ کے لیے ایک ہفت روزہ "آزاد" بھی جاری کیا "زمانہ" کی ادارت کے علاوہ منشی جی کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج میں اردو ادب بھی پڑھاتے تھے اور میونسپل بورڈ کے ممبر بھی رہے اور آنریری مجسٹریٹ بھی۔

ان کی شخصیت ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ ان کی یاد کو ہم ہمیشہ اپنے سینوں میں جگہ دیں۔ امید رکھنی چاہیئے کہ ان کا جشن صد سالہ بڑے شان و شوکت سے سال بھر منایا جائے گا۔

منشی دیا نرائن نگم کی خطوط نگاری

جناب محمد ایوب واقف صاحب

ایک سماجی انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے واسطہ رکھنا پڑتا ہے اور اس طرح کا واسطہ رکھنے کے لیے دراصل وہ مجبور بھی ہے۔ ایک طرف اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر اعزا و اقارب و احباب ہیں تو دوسری طرف وہ نا آشنا سماجی افراد بھی جن سے اپنی بعض ضرورتوں کے پیش نظر وہ ربط و ضبط رکھتا ہے۔ ان دونوں طرح کے لوگوں سے اس کے معاملات بہر حال ہوتے ہیں اور ان سے کسی بھی صورت وہ اغماض نہیں برت سکتا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ ان آشنا و نا آشنا افراد میں سب کے سب اس سے قریب ہی رہتے ہوں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو ضرورتاً اپنے اطراف کے لوگوں کے حلقہ سے نکل کر دور دراز کے کسی مقام پر رہائش اختیار کرنی پڑتی ہے یا پھر اپنی ضرورت کے پیش نظر دور کے کسی نا آشنا شخص سے بھی ربط و ضبط اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر کسی انسان کو اس طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے لکھنے پڑھنے کا ہنر بھی آتا ہے تو پھر اپنی تحریروں کے ذریعہ اسے ہم کلامی و ہم نشینی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے اپنی ان تحریروں میں وہ ضرورت کے مطابق اپنے مخاطب سے پوری بات عرض کرتا ہے ایسی تحریروں کو ہی دراصل ہم رقعات یا خطوط کا نام دیتے ہیں۔ خطوط نگاری اب باقاعدہ ایک صنف قرار پا چکی ہے لیکن ابھی تک مشاہیر و اکابر کے خطوط کو ہی جمع کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

خطوط کا کوئی بندھا لگا اصول نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی بنا بنایا سانچہ و ڈھانچہ ہوتا ہے خط لکھنے والا اپنی مرضی و منشا کے مطابق اپنے مخاطب سے ہمکلام ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ نرم، ملائم، سنجیدہ، متین اور متوازن اندازِ تحریر سے کام لیتا ہے اور کبھی تند خوئی، چرب زبانی اور غم و غصہ کا انداز اختیار کرنے والے جملوں سے اپنے خطوط کی دوکان سجاتا ہے غرضیکہ خطوط میں لکھنے والے کی طبیعت کے انشراح و انقباض دونوں پہلوؤں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ مکتوب نگار کبھی تو القاب و آداب کے ساتھ اپنی بات شروع کرتا ہے اور کبھی کبھی براہ راست مدعا بیان کرتا ہے لیکن ان تمام طرح کی تحریروں کو ہم خطوط کے زمرے میں ہی شامل کرتے ہیں۔

اردو زبان سے الگ اگر دوسری زبانوں کی خطوط نویسی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی

تاریخ بہت پرانی ہے۔ انگریزی، عربی اور فارسی وغیرہ زبانوں کی تحریر و نگارش کے سرمائے میں خاصی تعداد ایسے خطوط کی ہے جو سیکڑوں سال قبل لکھے گئے ہیں۔ ہمارے بزرگانِ دین، اکابر علم و حکمت اور علمبردارانِ فکر و دانش کے رقعات و خطوط سیکڑوں سال کے نشیب و فراز اور موڑ تر زمانہ کے باوجود گنج گراں مایہ کی صورت اب بھی موجود ہیں اور اب تو ان خطوط و رقعات کو اس طرح محفوظ کر لیا گیا ہے کہ ان کے تلف ہونے کے امکانات کم سے کم ہو گئے ہیں۔ جہاں تک اردو خطوط نویسی کا تعلق ہے اس کی تاریخ کچھ بہت پرانی نہیں ہے یا کچھ بہت زیادہ تحقیق طلب نہیں ہے۔ اس لیے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال تک اردو زبان کے ادیب و شاعر بھی عام روش کے مطابق فارسی زبان میں خطوط لکھنے کے عادی تھے۔ کیونکہ فارسی اس وقت کی مروجہ زبان تھی۔ عدالتوں سے لے کر پرائیویٹ نشستوں تک اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا جاتا تھا۔ خود مرزا اسد اللہ غالب غالب جن کی سراپا ادب ذات سے خطوط نویسی کی باقاعدہ تاریخ وابستہ ہے اور اس کا بھرم بھی قائم و دائم ہے۔ اپنی عمر کے آخری دو دہوں سے قبل تک فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے۔ غالب کے بارے میں اردو زبان و ادب کے ناقدین و محققین اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد ہی اردو زبان میں خطوط لکھنے کی ابتدا کی۔ غالب نے فارسی سے ہٹ کر اردو زبان میں خطوط لکھنے کی جو رسم ڈالی تو اس کے بھی کچھ خاص اسباب تھے۔ مولانا الطاف حسین اپنی یادگار اور مشہور زمانہ تصنیف "یادگار غالب" میں رقم طراز ہیں کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکورہ میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمات پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن "مہر نیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس وقت بضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط میں جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب وے "مہر نیمروز" کی ترتیب اور انشا میں مصروف تھے ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی طرز خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے۔"

مولانا حالی کے علاوہ حامد حسن قادری، شیخ محمد اکرام، رام بابو سکسینہ اور مولانا غلام رسول مہر وغیرہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مرزا نے ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہی اردو میں خط و کتابت شروع کی۔ اردو خطوط نویسی کے سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ابتدا میں اس پر فارسی کے اثرات غالب ہوا کرتے تھے۔ وہی طول طویل لمبے لمبے القاب وہی تصنع اور بناوٹ کا انداز لیے ہوئے آداب

وہی تکلفات اور حشو زائد جو فارسی خطوط میں مروج تھے اردو خطوط کے رنگ و ڈھنگ ٹھہرے لیکن اردو خطوط نویسی میں فارسی خطوط کے ان اثرات کا عمل دخل زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اردو شاعروں اور ادیبوں کے خطوط میں سادہ و سلیس اور عام فہم زبان رواج پا تی گئی القاب و آداب میں سادگی بڑھتی گئی اور ہمارے عہد تک آتے آتے مقفیٰ و مسجع عبارت کے سارے نقوش ایک ایک کر کے مٹ گئے اور اب تو خطوط میں عہد گزشتہ کا وہ انداز تخاطب اور تحریر کا وہ بھاری پن خطوط نگاری کا عیب سمجھا جانے لگا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم کے خطوط سہل، شیریں اور حد درجہ سادگی اور صفائی کے طرز کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے یہاں نہ افکار و خیالات کی صلابت ہے اور نہ تحریر میں الجھاؤ۔ ۱۹۰۳ء میں "زمانہ" کی ادارت انھوں نے اپنے ذمہ لی تو باقاعدہ طور پر خطوط لکھنے کی ابتدا کی۔ اور ان کی خطوط کا یہ سلسلہ ان کی عمر کے اخیر دنوں تک جاری رہا۔ "زمانہ" کے ابتدائی شماروں کو ہی دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ شروع سے ہی اس ماہنامہ میں وقت کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں نے لکھنا شروع کر دیا تھا "زمانہ" کی بزم تحریر میں مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، مولانا حسرت موہانی، سر عبدالقادر، مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، برج نرائن چکبست اور منشی پریم چند جیسے منفرد فکر و فن کے ادیب شاعر اور دانشور شامل تھے۔ ان سب کے ساتھ منشی دیا نرائن نگم کے خصوصی تعلقات تھے۔ سب سے ان کی خط و کتابت تھی۔ منشی جی نے "زمانہ" کی ادارت تقریباً چالیس سال تک کی۔ اتنی طویل مدت میں انھوں نے یقیناً ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کے خطوط جمع کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش کی جائے تو ان کے خطوط ابھی بھی کافی تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ تین سال کی مدت گزری جب مجھے اس کا احساس ہوا میں نے اپنے دو چار بزرگوں کو جو فن تحقیق و تنقید میں درک رکھتے تھے لکھا اور ان کی توجہ کو اس طرف مبذول کرایا مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ آخر میں نے ہی یہ کام اپنے ذمہ لیا جن جن حضرات کے یہاں ان کے خطوط مل سکتے تھے خطوط لکھے۔ میرے خطوط پر کچھ حضرات نے اس طرف توجہ دی اور انھوں نے جس قدر خطوط انھیں مل سکے روانہ کر دیے۔ بعضوں نے تو سبز باغ دکھایا ایفائے وعدہ کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ بہر حال اس تگ و دو کے بعد میرے پاس منشی دیا نرائن نگم کے سو سے زائد خطوط جمع ہو گئے۔ میں ان خطوط کو اردو ادب کے لیے بیش قیمت سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ان خطوط سے ایک ایسے انسان کی پہلو دار شخصیت جھانکتی ہے جس نے اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ تہذیب، تمدن، مذہب، موسیقی، مصوری، معاشیات، لسانیات، سنگتراشی، نفسیات، سیاسیات، اخلاقیات، روحانیات، طنزیات اور اس طرح کے زندگی کے دیگر گوشوں اور شعبوں پر بے پناہ مواد فراہم کیا اور ان تمام اشیائے گراں مایہ کو زمانہ کی جھولی میں اس قرینے اور سلیقے سے بھر دیا کہ ماہنامہ

"زمانۂ برصغیر کے چالیس سال کی ادبی سیاسی اور جمالیاتی تاریخ کی مکمل اور بھرپور دستاویز بن گیا اور یہ سب کچھ فردِ واحد کی محنت شاقہ کا کرشمہ تھا۔"

منشی دیا نرائن نگم کے ان خطوط کو جو میرے پاس محفوظ ہیں اگر میں خانوں میں تقسیم کروں تو ان کی تقسیم اس طرح ہوگی۔ ادبی خطوط، کاروباری خطوط اور ذاتی خطوط۔ ان تینوں طرح کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے منشی دیا نرائن نگم کے ذہن وفکر، طرزِ اسلوب اور عادات واطوار وغیرہ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اردو خطوط نویسی کی تاریخ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا اسداللہ خاں غالب اور مہدی افادی کے خطوط کی بڑی ہلچل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط میں ان کی طرفہ عالمانہ نشان وطمطراق، غالب کے خطوط میں ان کی طبیعت کا انوکھا پن اور فکر وخیال کی شستگی وبرجستگی اور مہدی افادی کے خطوط میں ان کے قلم کی رنگینی اور الفاظ کی لالہ کاری وسحر طرازی ہے۔ اگر آپ منشی دیا نرائن نگم کے خطوط میں مذکورہ بالا تینوں شخصیتوں میں سے کسی ایک کے یہاں کے بھی اوصاف وکمالات تلاش کریں گے تو میں کہوں گا کہ آپ کو بڑی مایوسی وبے اطمینانی ہوگی۔ منشی جی بڑے سادہ لوح بندۂ خدا تھے جتنے سادہ وہ اپنے روزانہ کے معمولات میں تھے اتنے ہی سادہ وہ اپنی تحریروں میں بھی تھے۔ اب یہ تحریریں چاہے ان کے مکتوبات پر مشتمل ہوں یا ان کے مقالات پر۔ وہ ادیبوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے یہاں تحریر کی سادگی اپنی تمام تر پرکاری کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحق اور پریم چند کا طرزِ نگارش منشی دیا نرائن نگم کے طرزِ نگارش سے میل کھاتا ہے۔ اگر میں سادہ، سلیس اور عام فہم نگارشات اور عربی وفارسی کی ادق تراکیب اور مشکل الفاظ کے تانے بانے پر مشتمل تحریروں کے الگ الگ خانے بناؤں تو ان دو الگ الگ خانوں میں منشی دیا نرائن نگم قسمِ اول کے خانہ میں جگہ پائیں گے۔ جہاں تک ان کی خطوط نویسی کا تعلق ہے یہاں بھی وہ تحریر کی بے پناہ سادگی اور برجستگی کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

منشی دیا نرائن نگم کے خطوط کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کے خطوط کی زبان میں کہیں بھی پیچیدگی، ابہام، ناہمواری اور نامطبوع اور گنجلک طرزِ تحریر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ جس سے پڑھنے والے کا ذہن خواہ مخواہ کے لیے الجھے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں ان گنت معاملات ومسائل پر روشنی ڈالی ہے انھوں نے اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو بھی خطوط لکھے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جن سے ان کی برائے نام رسم وراہ تھی یا پھر ان لوگوں کو جن سے ان کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں تھا لیکن ان کے تمام خطوط ان کی مستقل مزاجی، ان کی اعلیٰ سوجھ بوجھ، ان کے مناسب اندازِ فکر اور خوشگوار توجیہہ واستدلال کا ہی عکس وپرتو ہیں۔ بسا اوقات وہ بعض غیر ذمہ دار اور کج اندیش لوگوں کے ناروا طرزِ عمل وطرزِ سلوک سے منقبض اور بددل ہو جاتے تھے لیکن ایسی صورت میں بھی پارائے ضبط ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا تھا۔ وہ دوسروں کے دلوں کا میلا پن دیکھ کر بھی دوسروں کے لیے

حسن ظن اور نیک گمان ہی پالے رکھتے تھے۔ ان کے طرز استدلال میں بڑی معقولیت، موزونیت، سنجیدگی اور وقار پوشیدہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی کسر نفسی، مودت اور خوش خلقی و خوش طبعی سے اپنے مکتوب علیہ کو اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیتے تھے کہ اس کے دل میں بس وہی وہ رہتے تھے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ چھپتا ہوا طنز بھی کرتے تھے چٹکی لیتے تھے لیکن ان کے اس نوع کے خطوط سے بھی لوگ سرگرانی و ناراضگی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے طنزیہ فقروں کا اثر یہ ہوتا تھا کہ لوگ انھیں ٹوٹ کر چاہنے لگتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ثاقب کانپوری کے نام ان کے خط کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، خط کی عبارت پر نظر ڈالنے سے قبل آپ خط کا پس منظر جان لیں تو ان کے طنزیہ فقروں کی چبھن کا زیادہ احساس ہوگا۔ ثاقب کانپوری ایک بڑے بزرگ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی بڑے پرہیزگار اور صوفی منش ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے یہاں تشریف لائے۔ ذاکر صاحب کی آمد کے موقع پر ثاقب صاحب نے کچھ اور احباب کو مدعو کیا اس موقع پر نہ جانے کیوں ثاقب صاحب نے منشی دیا نرائن نگم کو دعوت نہیں دی۔ انھیں اس کی اطلاع ہوئی۔ ایسے مواقع پر نہ وہ چپ بیٹھتے تھے اور نہ ہی معاف کرتے تھے۔ قلم اٹھایا اور حضرت ثاقب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہاں جو چیز دیکھنے اور سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اگرچہ یہاں طنز کا نشتر بہت تیز ہے لیکن اس کا اثر بڑا دلفریب۔ اب آپ خط کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

عزیزی ثاقب صاحب!

آپ سید زادے ہیں اور میں آپ کا حلقہ بگوش۔ آپ کا نہیں آپ کے بزرگوں کا۔ کاشی کے ساتھ کعبہ بھی میرا ہے۔ میں اب لکھوں تو کیا لکھوں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین آئے اور آپ نے مجھے ہی نہ بلایا۔ اچھا شکایت کم کروں گا پہلے ظہیری کا ایک شعر سنا دوں، ع

دیدہ ام دفتر ہیچاں و فا صرف بہ صرف
نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

آپ خانقاہ میں رہتے ہیں اور خانقاہوں کے دروازے کبھی فقیروں پر بند نہیں ہوتے۔ شاید اب رسم و رہ خانقاہی بدل گئی ہو اگر ایسا ہو تو مجھے اطلاع دیں ممنون ہوں گا۔

دعا گو

دیا نرائن نگم

آپ نے مندرجہ بالا خط کی عبارت ملاحظہ فرمائی اور خط میں اعلیٰ طنز کی جو کیفیت ہے اس کا بھی اندازہ کیا۔ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ انھوں نے جہاں کہیں بھی طنز کا کوئی داؤ پیچ استعمال کیا ہے وہاں کسی طرح کا عناد، کرختگی اور بدلحاظی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت ان کا مندرجہ بالا خط اور

اس طرح کے دوسرے خطوط ہیں۔ ان کے طنزیہ جملوں میں محبت اور خلوص کی ایک پیاری و نیاری قسم کی خوشبو ہے جو نظر افروز بھی ہے اور طرب اندوز بھی۔ در اصل وہ اس طرح کی اپنی تحریروں میں بڑی احتیاط و انضباط سے کام لیتے تھے ورنہ طنز نگاری تو ایسی چیز ہے کہ اگر سلیقہ نہ ہو تو اس سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔

منشی دیا نرائن نگم نے "زمانہ" کے ذریعہ بہت سے نوخیز ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی پرورش کر کے انھیں شہرت و مقبولیت بخشی۔ بے شمار شعری دواوین اور نثری تصانیف پر تبصرے اور مضامین شائع کیے۔ کسی دوست یا شناسا ادیب و شاعر کو کوئی کتاب پیسوں کی قلت کی بنا پر چھپنے سے رہ جاتی تو اسے چھاپنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالتے۔ غرضیکہ جس طرح بھی ممکن ہوتا وہ دوستوں اور ساتھیوں کی امداد اور دستگیری سے پہلو تہی نہ کرتے۔ کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے کو مصیبتوں اور دشواریوں میں ڈال لیتے تھے۔ ایسا وہ محض اس لیے کرتے تھے کہ وہ دوسروں کے کام آ جائیں۔ اپنے اس عمل سے انھیں یک گونہ سکون اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھی بعض لوگوں کا رویہ ان کے ساتھ مخلصانہ نہیں ہوتا تھا کچھ ناقص خیال اور خود غرضانہ ذہن کے لوگ انھیں جلی کٹی سنانے میں ہی اپنی شان سمجھتے تھے۔ برق صاحب[1] کا دیوان شائع کیا گیا تو زمانہ بک ایجنسی کو بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے یہ لکھا کہ اس کی کچھ جلدیں وہ نقد قیمت پر خرید لے۔ زمانہ بک ایجنسی کے منیجر ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ نے نقد قیمت ادا کرنے سے گریز کیا۔ اس پر منور لکھنوی نے منشی دیا نرائن نگم کو لکھا کہ

"......... اگر برق صاحب کے کلام کے سکول میں اتنی قیمت نہیں ہو سکتی تو غالباً اسے ملک کی انتہائی بد مذاقی اور اردو مصنفوں اور شاعروں کی بدقسمتی پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔"

منور لکھنوی کے خط کا لہجہ سخت تھا۔ اس کا اثر منشی دیا نرائن نگم کے دل و دماغ پر کچھ اچھا نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے۔ وہ کوئی فرشتہ تو تھے نہیں۔ دنیا دار انسان تھے اور دنیا دار انسان کی حیثیت سے وہ بھی محسوسات رکھتے تھے۔ چنانچہ منور لکھنوی کی جلی کٹی باتوں کا جواب دینے کے لیے وہ کربستہ ہوئے۔ انھوں نے ایک طویل خط لکھا۔ اپنے خط میں انھوں نے اپنے اضطراب اور رنجیدہ خاطری کا اظہار کیا لیکن یہاں بھی وہ شرافت اور اخلاق مندی کے دائرہ سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ ایسا غالباً اس لیے تھا کہ ان کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ تھا جو انھیں اذیت ناک لمحوں میں بھی متوازن رکھتا تھا۔ اب ذرا اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے خط کے جواب کی شکل میں لکھا تھا اور اس کی روشنی میں منشی جی کی معاملہ فہم طبیعت اور ان کی دوراندیشی کا اندازہ لگائیے۔

---

[1] جوالا پرشاد برق۔

وہ لکھتے ہیں کہ

" میں نہیں جانتا کہ میرے کون سے الفاظ سے حوصلہ شکنی کا اظہار ہوا اور قصور کی نوعیت اور اہمیت معلوم کیے بغیر خواہ مخواہ عذر خواہی میرا شیوہ نہیں ہے۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ بعض احباب موقع بے موقع مورد الزام بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ حال ہی میں قادری[1] صاحب کی تازہ تصنیف "داستان اردو" کے متعلق ان کے پبلشر نے نقد قیمت پر کتابیں خرید کر بک ایجنسی میں رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر میرے منیجر صاحب اس تجویز کو منظور نہ کر سکے۔ قادری صاحب کو اس سے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ بالکل تجارتی معاملہ تھا۔ اگر میرے کارکنوں کو روپیہ کمانے کا حوصلہ اور خاص کوشش کرنے کی لیاقت ہوتی تو وہ دس بیس روپے لگا دیتے۔ بصورت موجودہ جب بک ایجنسی کا کام معطل پڑا ہوا ہے کوئی رقم اٹھا دینا کہاں کا دستور اور کہاں کی عقلمندی ہے۔ شاید آپ بھول گئے کہ چالیس سال سے "زمانہ" کی مسلسل اشاعت قائم رکھنے میں مجھ کو کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیا میں نے اب تک کسی اہل قلم دوست سے اس کے لیے مالی امداد طلب کی۔ البتہ قلمی امداد کے لیے میں نے اپنے سب احباب قدیم و جدید مرحوم و موجود سب کا ہمیشہ کے لیے زیر بار احسان ہوں ۔۔۔ "

دیکھا آپ نے منشی دیا نرائن کی جمعیت خاطر کا کرشمہ، بددلی اور بدمزگی کے موقع پر بھی ان کے انداز فکر اور ان کے احساسات میں کتنی تنظیم اور کتنا توازن ہے۔ دراصل ان کے یہاں ایک پختہ اور محکم قسم کا ساجی خلوص تھا جو ان کے ذہن و فکر کو ہمیشہ پیکر حسن و لذت میں ڈھالتا رہتا تھا۔

ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ ماہنامہ "زمانہ" ۱۹۰۳ء میں کانپور سے نکلنا شروع ہوا۔ ۱۹۲۶ء تک پہنچتے پہنچتے یہ برصغیر کا انتہائی اہم اور موقر جریدہ بن گیا اور اس کے مدیر منشی دیانرائن نگم ایک قد آور اور اعلا درجہ کے مدیر کی حیثیت سے قابل لحاظ اور قابل عزت سمجھے جانے لگے۔ مگر اس کے باوجود منشی دیانرائن نگم کے دل میں کبھی احساس برتری، غرور اور خود پسندی کا جذبہ جگہ نہ پا سکا۔ تاحیات ان کی علمی انکساری و بردباری قائم رہی۔ وہ اپنے ہمعصروں کی قدر و منزلت میں پوری طرح سرگرم رہے وہ اپنے سے بہت کمتر درجہ کے لوگوں کے ساتھ بھی انتہائی شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ وہ آج کل کے مدیروں کی طــــرح نہیں تھے۔ جب کوئی ادیب یا شاعر ان کی فرمائش پر کوئی تخلیق انھیں روانہ کرتا تھا تو وہ انتہائی مخلصانہ ڈھنگ سے اس کے ممنون ہوتے تھے۔ اسے فوراً شکریہ کا خط لکھتے تھے اور اگر کبھی کسی باعث خط لکھنے میں تاخیر ہو جاتی تو ندامت کا اظہار کرتے۔ یہاں ایک خط کا اقتباس

---

[1] مولانا حامد حسن قادری

ہم پیش کرتے ہیں۔ یہ خط مولانا احسن مارہروی کے نام ہے۔ مولانا نے زمانہ کے لیے اپنی تازہ تخلیق روانہ کی تھی منشی جی حالات کی ناخوشگواری کے سبب جواب فوراً نہ لکھ سکے۔ اب جب انھوں نے بعد کو خط لکھا تو خط میں اپنی ندامت و شرمساری کا اظہار بھی کیا اور معذرت بھی پیش کی۔ خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے

جناب مخدوم و محترم بندہ،

تسلیمات عرض ہے

آپ نے باوجود علالتِ طبع کے ۲۹ جولائی کے عریضہ کا جواب باصواب ۹ اگست کو عنایت فرمایا۔ مگر میری بے بسی دیکھیے کہ معمولی صحت قائم ہونے کے باوجود آج پندرہ سولہ دن کے بعد جواب لکھنے کی توفیق ہوئی۔ حالانکہ بلا مبالغہ اور تصنع عرض کرتا ہوں کہ قریب قریب روزانہ عریضہ لکھنے کا خیال آتا رہا۔

آپ نے اس علالت کے باوجود "زمانہ" کے لیے غیر مطبوعہ غزل بھیج کر جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ میرے امکان سے باہر ہے۔ یوں تو پوری غزل مرصع ہے مگر غزل سے بھی زیادہ قابل قدر یہ خیال ہے کہ آپ نے میرے تقاضا کا خشک جواب دینا گوارا نہ فرمایا۔ یہ مروت اور یہ وضع داری آج کل کی نئی پود سے مفقود ہوتی جا رہی ہو۔ خداوند کریم عرصۂ دراز تک آپ کا سایہ برقرار رکھے ......۔"

مکتوب علیہ کی جس مروت اور وضع داری پر منشی دیا نرائن نگم دل و جان سے فریفتہ نظر آتے ہیں دراصل اس مروت و وضع داری کو انھوں نے اپنی زندگی کا شیوہ بنایا تھا انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کی مسرتوں سے ہمیشہ اپنے دل کو تر و تازہ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے سماج کے بیشتر لوگ انھیں ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ منشی دیا نرائن نگم نے اپنے پیچھے دولت کا انبار تو نہیں لگایا لیکن شرافت اور محبت کی جو گراں بہا دولت وہ چھوڑ گئے ہیں وہ ہر آنے والی نسل کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہے۔

منشی دیا نرائن نگم کے خطوط سے اور بھی کچھ اقتباسات پیش کر کے ان کی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کو جی چاہتا ہے لیکن مضمون کی طوالت کا خوف قلم کو روکتا ہے۔ آئندہ پھر کبھی ان کے مکاتیب پر اظہار خیال کی صورت پیدا ہوئی تو یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔ مگر اس مقالے میں ہم نے خطوط کے جتنے بھی اقتباسات پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ان کے خطوط ان کے حالات زندگی کی پوری شرح کرتے ہیں۔ انھوں نے جتنے بھی خطوط لکھے ہیں قلم برداشتہ لکھے ہیں اس لیے ان میں صداقت اور برجستگی کے جوہر تمام تر شد و مد کے ساتھ موجود ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم کے خطوط رنگ رنگ کے تاثرات سے آراستہ و پیراستہ ہیں اور ان رنگ رنگ کے تاثرات کو موثر

اور معتبر بنانے کے لیے انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ روزمرہ کی زبان ہے اس میں شیرینی ہے شگفتگی ہے روانی اور سادگی ہے۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے بھی بہت سے الفاظ اپنے خطوط میں استعمال کیے ہیں لیکن ان الفاظ کو ان کے قلم نے اس ہوشیاری سے استعمال کیا ہے کہ وہ بھدے نہیں بلکہ ہار کے موتی کی طرح لگتے ہیں کہ انھیں نکال دیا جائے تو خط کا حسن جاتا رہے۔ مکتوب نگار کو اگر الفاظ کے برمحل استعمال پر دسترس ہو تو مکتوب نگاری کا کمال اس کے بس میں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ منشی دیا نرائن نگم کے یہاں یہ شعور موجود ہے۔ ان کے خطوط کو پڑھنے والا ایک اور بات سے بھی لطف اندوز ہوگا کہ ان کا انداز تخاطب حد درجہ خوبصورت، پاکیزہ اور پر اثر ہے۔

ہم یہ پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ خطوط نویسی اب ایک مستقل صنف قرار پا چکی ہے۔ اس صنف کے ذخیرے میں بہت سے منفرد ادیبوں اور شاعروں کے خطوط جمع ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ منشی دیا نرائن نگم کے خطوط، خطوط کے اس سرمائے میں بیش بہا اضافہ کا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط کی علمی وادبی حیثیت تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ یہ ایک عہد کی سیاسی، ادبی، تہذیبی اور سماجی حالات کی بھرپور نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم منشی دیا نرائن نگم کے خطوط کا پورا مطالعہ کریں۔

٭ ٭ ٭

ستارے کی خودکشی

ایک ستارہ آغوش فلک سے تڑپ کر سمندر کے نیلگوں پانی میں کود پڑا ۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالم دیوانگی میں ہے لاتعداد ستاروں نے خوف و اضطراب کی نظروں سے دیکھا کہ کس طرح آسمان کی ایک روشن قندیل جو اللہ کے ساتھ صدیوں سے جگمگا رہی تھی، چند لمحات کے اندر تاریکی میں غائب ہو گئی۔

میں گہرے سمندر میں اترا ۔ اس کی تہہ میں متعدد ستارے بکھرے ہوئے تھے، جن کی روشنی ہمیشہ کے لیے فنا ہو چکی تھی۔ آخر اس گم شدہ ستارے پر کیا مصیبت نازل ہوئی؟ اس سوال کا جواب صرف میں جانتا تھا۔ صرف مجھی کو معلوم تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ یہ گم شدہ ستارہ آسمان کی آغوش میں جلوہ طراز تھا۔ کون سی چیز اس کو دعوت مرگ دے رہی تھی۔ یہ خندۂ پیہم کا عذاب تھا۔ کوئلے کا ایک ٹکڑا اپنی سیاہی کو چھپانے کے لیے ہنستا ہے۔ جس قدر یہ ہنستا ہے اسی قدر جلتا ہے۔ اسی طرح یہ ستارہ بھی ہنسا اور روشن ہو گیا۔ جب جلنے کی مصیبت زیادہ برداشت نہ کر سکا تو روشنی کی ہلاکت سے ٹھنڈے سیاہ پانی میں کود پڑا۔

ہزاروں لاکھوں چمکدار ستاروں نے اس گرے ہوئے ستارے کو دیکھا اور مایوسی کا قہقہہ لگا کر زبان حال سے کہا کہ۔

"اس ستارے کی موت سے ہمارا کچھ نقصان نہیں، آسمان اسی طرح ابدالآباد تک جگمگاتا رہے گا"

"زمانہ" جنوری ۱۹۴۰ء۔

رسالہ زمانہ

(ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی)

رسالہ 'زمانہ' کا پہلا پرچہ فروری ۱۹۰۳ء[1] میں منشی شیو برت لال صاحب ورمن کی ادارت میں قیصری پریس بریلی سے شایع ہوا تھا لیکن عبدالرزاق صاحب قریشی نے اپنے ایک مضمون میں اس کے اجرا کے بارے میں سہواً لکھا ہے کہ رسالہ 'زمانہ' ۱۹۰۱ء سے نکلنا شروع ہوا[2]۔ ابتدائی نو مہینے (یعنی فروری سے اکتوبر ۱۹۰۳ء) تک یہ رسالہ 'زمانہ' منشی شیو برت لال صاحب ورمن کی خور و پرداخت میں پرورش پاتا رہا۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۰۳ء سے اس کی زندگی کی کفالت منشی دیا نرائن صاحب نگم کی تفویض میں آئی۔ منشی جی نے چالیس سال تک بڑی جانکاہی سے اس کی پرورش کی اور اس چھوٹے سے پودے کو اس قدر تناور بنا دیا کہ اردو صحافت میں نہ معلوم کتنے اقتصادی بحران آئے مگر اس کی جڑوں کو جنبش نہ ہوئی۔

۱۹۰۳ء میں جب رسالہ 'زمانہ' نے جنم لیا اس وقت اردو کی حالت کچھ متزلزل سی تھی۔ وہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ تھی، محض اس لیے معتوب ہو رہی تھی کہ اس کے حروف فارسی حروف ہیں یا مسلمان۔ اس سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ ایسے دور میں رسالہ 'زمانہ' کا قائم رہنا ایک معجزہ سے کم نہیں۔

'زمانہ' ابتدا سے جس معیار ادب کا حامی تھا، اسے آخر تک برقرار رکھا۔ اس کے صفحات ابتدا ہی سے ایک صالح ادبی کوشش اور پرخلوص علمی سعی و عمل کے لیے مخصوص رہے۔ اس نے اس دور کے جدید خیالات کی ترجمانی کر کے زندگی کے اعلیٰ معیار پیش کیے۔ اس کی تحریریں ہمیشہ سنجیدہ اور متین رہی ہیں اور ان کا لہجہ ایسا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی ناگوار نہ ہو جو لکھنے والوں کے ہم خیال نہ ہوں۔ اس نے ہمیشہ اردو لٹریچر کی اشاعت سے ہندو مسلم اتحاد کا عملی ثبوت دیا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو محض مسلمانوں ہی کی زبان نہیں بلکہ ہندو قوم بھی اس کو اپنے ملک کی زبان کی طرح عزیز رکھتی ہے۔ ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایسا کوئی بھی رسالہ نظر نہیں آتا جس کے ہر نمبر میں مشترکہ طور پر ہندو مسلمان مضمون نگاروں نے سالہا سال لگاتار مضمون لکھے ہوں۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ گورنمنٹ کی پالیسی کو عوام پر اعلان کرے اور عوام الناس کی آواز کو سرکار تک پہونچائے۔

'زمانہ' کے صفحات میں اردو زبان کی بیسویں صدی کے نصف اول کی مکمل تاریخ ملتی ہے۔ اس نصف صدی میں اردو زبان نے جتنی ترقی کی ہے، اس کے صفحات اس کی پوری کہانی کے حامل ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا

---

[1] 'زمانہ' فروری ۱۹۲۸ء (جوبلی نمبر): ۵۰ ۲ ص ۱۹۰۸ء بحوالہ دیا نرائن نگم)

[2] رسالہ 'آجکل' (اردو)، دسمبر ۱۹۵۹ء

نہ ہوگا جس پر نہایت پُر مغز مضامین نہ موجود ہوں۔ ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب و تمدن، مصوری و موسیقی، سنگ تراشی، معاشیات، طبیعیات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، فلسفہ، اخلاقیات اور روحانیت وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایک ایک موضوع پر یہ تمام مضامین یکجا کئے جائیں تو اردو میں متعدد علوم و فنون پر بہترین تصانیف کا اضافہ ہو جائے۔

رسالہ' زمانہ' نے ۴۶ سال تک اردو ادب کی خدمت کی۔ اس مدت میں اس کی ۹۲ جلدیں شائع ہوئیں جس میں مجموعی طور پر ۳۴۲۳ مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہوئے ہیں۔ مضامین کی تفصیل بقید عنوانات ذیل ہے:۔

ادبیات ۷۰۸، تاریخ اور سفرنامے ۶۴۳، سوانح عمریاں ۹۳۸، سماجی علوم [illegible]، لسانیات ۱۴۲، مذہبیات ۱۵۴، فلسفہ ۱۱۸، سائنس ۹۴، اطلاقی سائنس ۷۹، فنون اور تفریحات ۸۴، عمومیات (عام مضامین) ۸۲ ــ کل میزان:۔ ۳۴۲۳

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ مضامین سوانح حیات پر شائع ہوئے ہیں۔ اس کے ۹۳۸ مضامین میں ۶۵۱ سوانح عمریاں صرف ادیبوں اور شاعروں کی ہیں۔ یہ تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر ان کی تدوین کر کے علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے تو ایک نایاب تذکرہ تیار ہو سکتا ہے۔ سوانح حیات کے بعد دوسرا نمبر ادبیات کا ہے۔ اس کے ۷۰۸ مضامین میں ۹۴ مضامین اردو شاعری پر ہیں جن کی تدوین سے اردو شاعری کے قدیم و جدید رجحانات پر سیر حاصل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لسانیات کے تحت جو مضامین اردو ہندی قضیہ پر شائع ہوئے ہیں وہ بہت ہی بصیرت افروز ہیں۔ اردو ہندی قضیہ اس وقت بھی کم نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں پہلے سے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ ان مضامین کی تدوین اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں معاون ثابت ہو سکتی ہے

مضامین نثر کے علاوہ اس میں مجموعی طور پر ۳۹۹۶ قصاید، غزلیات، نظمیں، مراثی، رباعیات، قطعات سہرے اور گیت بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ تعداد مضامین نثر سے بھی زیادہ ہے۔ ان کی ترتیب سے مختلف رنگا رنگ گلدستے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ یہ غزلیں اور نظمیں اس دور کے چوٹی کے شعرا کی ہیں۔

مضامین نگار ــــ کسی رسالہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کو قلمی معاونین کس طرح کے ملے۔ رسالہ' زمانہ' کو اس بات پر ناز ہے کہ اس دور کا کوئی اہل قلم ایسا نہیں گزرا جس نے' زمانہ' کی قلمی معاونت سے دریغ کیا ہو۔ اس میں ۸۰۸ مضمون نگاروں نے اس کی قلمی معاونت کی مضمون نگاروں کی اتنی کثیر تعداد شاید ہی کسی دوسرے رسالہ کو نصیب ہوئی ہو۔ اس میں مختلف اقوام و مذہب کے مشہور اہل قلم شامل ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے' زمانہ' کا سہارا لے کر لکھنا سیکھا اور آگے چل کر شہرت و مقبولیت حاصل کی اور آج دنیائے ادب میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ جعفر علیخاں اثر لکھتے ہیں:۔

"پچھلے ۲۵ سال کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو یقیناً ۵۰ فی صدی ایسے نکلیں گے جن کو 'زمانہ' نے چمکایا" [۵۰]

اس کے مضمون نگاروں اور انشا پردازوں کی تعداد بہت کثیر ہے اور اس مختصر مضمون میں ان کی تخلیقات کا جائزہ لینا ناممکن ہے۔ اسلئے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف چند شاہیر ادب کے اسمائے گرامی دئے جا رہے ہیں تاکہ رسالۂ زمانہ کی افادیت کا اندازہ ہو سکے شلاً۔ بابو گنگا پرشاد ورما، شمس العلما مولوی ذکا اللہ، برج نرائن چکبست، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی، لالہ بال مکند گپتا، جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، منشی پریم چند، اقبال ورما سحر ہتگامی، محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی، تصدق حسین حق پرست، شیام موہن لال جگر بریلوی، سلیم جعفر، محمد یحییٰ تنہا، سید محمد حفیظ، جے آر رائے، سوامی رام تیرتھ، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، منظور الحق کلیم اعظم گڑھی، اقبال بہادر سکسینہ، مرزا سلطان احمد، شیو نرائن شمیم، ضیاء الدین احمد برنی، حسرت موہانی، عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، شیخ عبدالقادر، محمد ہادی عزیز لکھنوی، محمد عزیز مرزا، فراق گورکھپوری، حامد حسین قادری، کشن پرشاد کول، لاجپت رائے، بالک رام، آنند نرائن ملا، مہیش پرشاد، علی حید رنظم طباطبائی، نیاز فتح پوری، پریا پورنا نند، برج نرائن دتاتریہ کیفی اور پروفیسر محمد حبیب (علیگ) جیسے عظیم المرتبت ادیبوں نے اپنے مضامین سے اس رسالہ کی وقعت کو بڑھایا۔

منشی دیا نرائن نگم نے خود 'زمانہ' کے لیے اتنے مضامین لکھے جو شاید آج تک کسی مضمون نگار نے نہ لکھے ہوں گے۔ ان کے مضامین کی تعداد ۳۶۲ ہے۔ ان کے مضامین زیادہ تر 'رفتار زمانہ' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، جن میں اس دور کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تاریخی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا۔ آپ نے ایک دوسرا سلسلہ 'یادرفتگان' کے عنوان سے بھی شروع کیا تھا جس میں وہ کسی شاہیر ادب یا شاعر کے حالات قلمبند کرتے تھے۔

شعراء — یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ رسالۂ زمانہ کے قلمی معاونین میں مضمون نگاروں اور شعراء کی تعداد کم و بیش برابر ہے۔ تقریباً ۷۰۰ شعراء نے اپنی فکر بلند سے اس رسالہ کے اوراق کو گل و گلزار بنایا ہے۔ اس میں اس دور کے چوٹی کے تمام شعراء بلا امتیاز مذہب و ملت شامل ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا ذکر مضمون نگاروں کے ذیل میں اوپر آچکا ہے۔ مضمون کی کم وسعتی کی وجہ سے یہاں پر بھی صرف چند ان شعراء کے اسمائے گرامی دئے جا رہے ہیں جو آسمان شاعری کے درخشندہ آفتاب اور درخشندہ مہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً حالی، شبلی، اقبال، اکبر الہ آبادی، چکبست، شاد عظیم آبادی، اثر لکھنوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، سرور جہاں آبادی، نوبت رائے نظر لکھنوی، بشن نرائن ابر لکھنوی، نادر کاکوروی، احسان دانش، آرزو لکھنوی، جگن ناتھ آزاد، اصغر گونڈوی، افسر میرٹھی، برق دہلوی، بیتاب بریلوی، ثاقب کانپوری، جگر بریلوی، حسرت موہانی، راز چاندپوری، جگت موہن لال رواں، روش صدیقی، ریاض خیرآبادی، اقبال ورما سحر ہتگامی، شرر سہارنپوری، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم، محشر لکھنوی، سنت پرشاد مدہوش، آنند نرائن ملا، منور لکھنوی، سورج نرائن مہر دہلوی، رام پرشاد ناشاد، شفو مداحدی اور علی حید رنظم طباطبائی وغیرہ۔

۵۰ 'زمانہ' جوبلی نمبر، فروری ۱۹۲۸ء، جلد ۵۰ عدد ۲ صفحہ ۲۰۰

زمانہ — منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں

(جناب غافل انصاری صاحب سنار پوری)

اب سے سو برس پہلے اردو آسمان صحافت پر ایک درخشندہ ستارہ طلوع ہوا جسے زمانہ نے منشی دیا نرائن نگم کے نام سے پہچانا۔ نگم صاحب آنجہانی نے اپنی عمر کا دو تہائی حصہ اردو صحافت کی نذر کر دیا۔ اوائل کا ایک تہائی ان کے علوم سے بہرہ مند ہونے کا زمانہ رہا تھا۔ گویا اس طرح وہ ساری زندگی بحر علم سے دُرِ بے بہا چنتے رہے۔ کوئی بھی صحافی پہلے ادیب ہوتا ہے صحافی بعد میں۔ اسلئے کہ ادب کے رموز و نکات سے نا آشنا ہونے کی صورت میں کوئی صحافی صحت مند صحافت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا صحافی کا دائرہ کار اور ذمہ داریاں بھی مصنف سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہیں۔ مصنف کسی خاص صنف سے دلچسپی رکھ سکتا ہے اور چاہے وہ اپنی متعینہ روش سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہو لیکن صحافی کسی تنگ اور محدود دائرے میں رہ کر صحافت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے مختلف اصناف سخن، مختلف مضامین نثری و شعری، مختلف رجحانات و روایات قدیم و جدید سے معلومات رکھنا از بس کہ ضروری ہوتا ہے۔ اس فیصلے کے وقت کہ کس تخلیق کو شامل اشاعت کرے، کس کو مسترد کر دے، کون سی تخلیق تھوڑی سی ترمیم و اضافہ کے بعد مفید اور کار آمد بنائی جا سکتی ہے، قاری کے ذوق سلیم و ذوق طبع کا پورا پورا خیال رکھنا صحافی کا فرض ہے۔ اگر کوئی صحافی ان اور ان جیسی دوسری ضروری خوبیوں سے متصف نہیں ہے تو وہ اپنے انتخاب میں مضحکہ انگیز حد تک سہو کر سکتا ہے۔

زمانہ کے اوراق شاہد ہیں کہ منشی دیا نرائن نگم ان تمام خوبیوں کے مالک تھے جو ایک صحافی کے لیے لازمی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تقریباً چالیس برس تک بلا ناغہ ایک معیاری جریدہ کا اجرا برقرار رکھا۔ ادبی ذوق سلیم رکھنے والے قاریوں کی تعداد سماج میں یوں بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر ہر قاری اپنا ایک الگ ذوق رکھتا ہے اور رسالہ میں وہ اپنے ذوق کا سامان تلاش کرتا ہے۔ منشی دیا نرائن نگم نے جب اس میدان خارزار میں قدم رکھا تھا اس وقت تک ذرائع ترسیل و صحافت کے اصول و ضوابط بھی متعین نہ ہو سکے تھے لیکن ان کے فطری میلان طبیعت نے انہیں اس میں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ زمانہ نگم صاحب کی علمی و ادبی استعداد ہی کا مظہر نہیں بلکہ زمانہ نے اپنے دور کے صحافتی کردار کو چار چاند لگائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج تک غیر سرکاری جریدے زمانہ کے معیار و میزان کے شائع نہیں ہو سکے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ سطور ذیل میں زمانہ کا مختصر تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ زمانہ کی خوبیوں کا تعارف کرانا بالواسطہ منشی دیا نرائن نگم کی خوبیوں کا اعتراف ہے۔

ماہنامہ زمانہ کا اجرا فروری سنہ ۱۹۰۳ء منشی رائج بہادر صاحب کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ پہلے یہ پرچہ بریلی سے نکلا لیکن دو ہی برس بعد منتقل ہو کر کانپور سے نکلنے لگا۔ نومبر سنہ ۱۹۰۳ء سے زمانہ منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا جس کو نگم صاحب نے تا دم حیات قائم رکھا۔ زمانہ کا عام شمارہ اوسطاً ۷۲ سے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور صفحہ نمبر جلد میں سلسلہ وار چلا کرتے

تھے۔ ایک جلد میں چھ شمارے ہوتے تھے۔ "زمانہ" کا کاغذ گلیز، کتابت عمدہ، طباعت نفیس اور ہر ورق حاشیہ سے مزین رہتا تھا۔ اوائل میں زمانہ عام کتابی سائز میں چھپتا تھا لیکن بعد میں سائز میں اضافہ کر دیا گیا۔ زمانہ میں ادبی صفحات کے بعد آٹھ سے بارہ تک رف کاغذ پر اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ زمانہ کے مشترکہ شمارے بہت کم شائع ہوئے کیونکہ زیادہ تر زمانہ پابندی وقت سے اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ جن مہینوں میں مشترکہ شمارے شائع ہوئے ان میں حجم کو تقریباً دوگنا کر دیا گیا تاکہ ناظرین کی طبع علمی کو آسودگی میسر ہو سکے۔ دراصل نگم صاحب زمانہ کو مالی منفعت کی غرض سے شائع نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کا مطمع نظر علم و ادب کی ترویج و ترقی تھا۔ وہ برسہا برس مالی خسارہ اٹھاتے رہے لیکن افسوس نے رسالہ کو بند کرنا پسند نہ کیا۔

زمانہ کے مضامین نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ زمانہ کے قلمی معاونین ہر مذہب، ملت، طبقہ اور جداگانہ خیالات کے حامل ہوتے تھے اسی لیے زمانہ کے مضامین کے موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ مذہبی، معاشرتی، اصلاحی، سیاسی، ادبی، معلوماتی گویا کہ ہر رنگ کے موضوعات پر مشتمل مضامین زمانہ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ زمانہ کے زیادہ تر صفحات ادبی و تنقیدی مضامین سے مملو رہتے تھے تاہم رفتار زمانہ کے عنوان سے جو اداریہ قلمبند کیا جاتا تھا اس میں ممالک غیر و معاملات ہند پر تبصرہ شائع ہوتا رہا ہے۔ رہنمایان قوم و ملت اور مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کے سوانحی خاکے زمانہ کی جان ہوتے تھے۔ حالی، مومن، غالب، سوامی رام تیرتھ، مدھوسودن دت، محمد حسین آزاد، بابر، کونٹ ٹالسٹائی، سرور جہان آبادی اور نیپولین کے کارناموں پر مشتمل سوانحی خاکے خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو نظم و نثر کی شکل میں زمانہ کی زینت بنے ہیں۔

زمانہ کے زیادہ تر قلمی معاونین اپنے زمانہ کے مشہور اہل قلم تھے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی علمی صلاحیت کو ناقابل تسخیر ثابت کیا۔ تاریخ ادب اردو میں جن کے نام سنہرے حرفوں میں لکھے گئے اور ایسے بھی تھے جن کو زمانہ کی بدولت شہرت دوام حاصل ہوئی۔ زمانہ کے علاوہ نگم صاحب نے اردو ادب کو جو بیش قیمت شے عطا کی وہ دھنپت رائے کا قلمی نام پریم چند ہے۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ پریم چند سرکھیے کتنے ہی ادیب و شاعر زمانہ ہی کی بدولت شہرت کی بلندیوں کو چھو سکے سرور جہان آبادی، منشی پریم چند، سید علی سجاد عظیم آبادی، محمد حسین آزاد، منشی نوبت رائے نظر، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی، منشی تلوک چند محروم، ضامن کشوری، منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب، مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی، علی عباس حسینی وسیم خیرآبادی، جعفر علی خاں اثر، حامد حسن قادری، پیارے صاحب رشید لکھنوی، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، پنڈت برج نرائن چکبست، لالہ لاجپت رائے، پنڈت منوہر لال زتشی، پنڈت کشن پرشاد کول، پروفیسر سری رام، عبدالقادر سروری مقبول حسین وصل بلگرامی، سدرشن، مسٹر سری نرائن نگم، خواجہ حسن نظامی، ریاض خیرآبادی، صفی لکھنوی، منشی سورج نرائن مہر دہلوی، محشر لکھنوی، حسرت موہانی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا عبدالحلیم شرر، منشی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، لالہ نہال چند، وقار الملک، طالب بنارسی، جگت موہن لال رواں، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، منشی مہاراج بہادر برق، اصغر گونڈوی، پنڈت آنند نرائن ملا، منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، ابو الاثر حفیظ جالندھری، پروفیسر فراق گورکھپوری

وغیرہ وغیرہ کتنے ہی مایہ ناز ادیب و شاعر دامن زمانہ سے وابستہ رہے۔ آج اردو ادب کو جن پر فخر ہے۔

زمانہ کا تصاویر کا حصہ بھی اپنی جگہ پر خوب تھا۔ ہر ماہ کسی نہ کسی مشاہیر ادب، فدائے ملت، رہنمائے قوم یا سیاسی لیڈر کی تصویر زمانہ میں شامل رہتی تھی۔ امیر افغانستان، مولانا حالی، سوامی رام تیرتھ، رنجیت سنگھ، ڈاکٹر ایم اے انصاری، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، سر رابندر ناتھ ٹیگور، لارڈ بشپ کلکتہ، بشپ آف لکھنؤ، لالہ لاجپت رائے، مسٹر چنتامنی، مہاراجہ گیکواڑ، گنیش واسدیو جوشی وغیرہ کتنے ہی اکابرین ملت کی تصاویر زمانہ کے توسط سے ہدیہ ناظرین ہوئیں۔ جوبلی نمبر میں چھپن تصاویر شامل کی گئیں جن میں بیشتر وابستگان زمانہ اور زمانہ کے قلمی معاونین کی تصویریں ہیں جو آج اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

زمانہ کی تصویروں میں صرف رہنمائے قوم یا شعرا، و ادبا ہی کے لیے جگہ مخصوص نہ تھی بلکہ زمانہ کی نثری یا شعری تخلیق کی مناسبت سے بھی تصویریں شامل اشاعت کی جاتی تھیں۔ نثری یا شعری تخلیق کے پیکر تصویروں میں ڈھال کر پیش کیے جاتے تھے۔ شکنتلا، زمانہ، شوق، شراب، ساغر، ہولی، خواب اوشا، موسم سرما، بسنت رت، لیلیٰ مجنوں، گنجینہ، رموکش، عروس نو، اکبر اور شکار چیتا، فلسفہ خیام، تصویر متعلق قصہ منتر وغیرہ وغیرہ تخیلاتی تصاویر سے زمانہ کے صفحات مزین رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بیشتر تصاویر تاریخی اہمیت کی حامل ہیں جن میں الہ آباد نمائش کی تصاویر، گروکل کے طلبا، یگیہ شالہ، صدر دروازہ اور گروکل کی دوسری بہت سی تصاویر زمانہ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ولکم کلب، انگردت کے مندر کی نایاب تصاویر بھی زمانہ میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زمانہ کشیدہ کاری، دستکاری کے نمونے لیڈیز کورٹ، طبقہ ڈاک خانہ، تار گھر، طبقہ زراعت، طبقہ جواہرات، زمانہ دستکاریوں کی عمارت کی تصویریں ٹکلی کلر اور بلیک اینڈ وہائٹ میں زمانہ میں شائع ہوئیں۔ زمانہ کا تصاویری حصہ نہایت دیدہ زیب اور نظروں کو خیرہ کرنے والا ہے۔

زمانہ کے کاتبین بھی اپنے دور کے مشہور اہل فن میں شمار کیے جاتے تھے جن پر فن کتابت کو ناز تھا۔ کاظم حسین سلطان خاں، سجاد، منے خاں، تصدق حسین، میرٹھی، رمضان خاں، منشی گوروبخش، منشی شیام بخش وغیرہ ایک طرف فن کتابت کے روشن ستارے تھے اور دوسری طرف دامن زمانہ سے وابستہ تھے۔

مختصر یہ کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین، مصور، ادیب و شاعر، ناقد، لیڈر، رہنمایان قوم، مصلحین، مبلغین، مدیران اخبار و رسائل، مختلف نظریات اور مکتب فکر کے نمائندگان زمانہ کی مجلس میں شامل رہے ہیں۔ ملک کے ان علمائے ادب اور ماہرین علم و فن کو زمانہ کے پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا سہرا منشی دیا نرائن نگم کے سر ہے جن کی مساعی جمیلہ نے اردو کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

منشی دیا نرائن نگم :- اب ایسے انسان کہاں

جناب سید اختر الاسلام صاحب ایڈیٹر میرٹھ میلہ

ٹھیکے دار جگدیش سرن اگروال سے میری ملاقات پی سی لاہنری ایس کے چترجی صاحب نے کرائی۔ چترجی صاحب میرے مخلص دوست اور اخبار میرٹھ میلہ کے سرپرستوں میں سے ایک ہیں۔ وہ اگروال صاحب کے کرایہ دار ہیں۔

اگروال صاحب نے بتایا کہ وہ پہلے کانپور میں رہتے تھے۔ اس لفظ سے فوراً میرا ذہن منشی دیا نرائن نگم صاحب کی طرف مڑ گیا۔ ان کے صاحبزادے برج نرائن نگم صاحب اپنے والد کا صد سالہ جشن منانے کی اسکیم بنا رہے تھے۔

منشی جی ماہنامہ زمانہ کے مدیر تھے اور زمانہ کی پرانی فائلیں اس مبارک موقع کے لیے ضروری تھیں جن کی حصولی کے لیے بی این نگم صاحب نے مختلف اخباروں میں اپنا مقصد بیان کیا تھا۔

میں نے اگروال صاحب سے کہا "آپ کان پور میں رہتے تھے۔ آپ کے پاس زمانہ کی کچھ فائلیں تو ہوں گی ہی۔"

"کان پور میں رہنے کے دوران ہم منشی جی کے ہی کرایہ دار تھے۔ وہ صرف زمانہ ہی کے اڈیٹر نہیں تھے بلکہ ایک اردو ہفت روزہ 'آزاد' بھی شائع کرتے تھے۔ بہت اردو نواز انسان اور بلند پایہ صحافی تھے۔ ان دنوں میری عمر ۸ برس تھی وہ مجھے اپنے لڑکوں کی طرح سمجھتے تھے۔ برج نرائن کے بڑے بھائی بشن نرائن نگم ان دنوں مجھ سے ایک دو کلاس آگے تھے بعد میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آئی سی ایس کر لیا۔ سروس میں آئے تو ڈسٹرکٹ جج بنا دیے گئے۔ میرٹھ میں قریب دو سال رہے۔ ڈسپلن کے سخت پابند تھے۔ کیا مجال کہ کوئی وکیل بغیر کالا کوٹ اور بو پہنے اجلاس میں آ جائے اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو وہ بات ہی نہ سنتے تھے۔ پھر وہ الہ آباد چلے گئے شاید رجسٹرار ہو کر۔" اگروال صاحب نے ذہن پر زور دے کر دھیرے دھیرے بتایا۔

"اور منشی جی؟" میں نے انھیں کریدا۔

اگروال صاحب کی آنکھوں میں تیز چمک آ گئی۔ فرط عقیدت سے انھوں نے کہنا شروع کیا "وہ بہت شریف النفس نیک سیرت مہمان نواز غریبوں کے ہمدرد تھے۔ تعصب اور تنگ نظری ان کو چھو کر ہی نہیں گئی تھی جب میرے پتا جی لالہ بشمبھر سہائے اگروال صاحب کا دیہانت ہوا تو منشی جی نے بہت اصرار کیا کہ میں میرٹھ نہ جاؤں وہیں رہوں لیکن وطن کی محبت نے مجھے ایسا وارفتہ کر دیا کہ میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر کانپور میں ہی رہتا تو ترقی کے راستے دگنے چوگنے ہوتے۔"

"منشی جی سے متعلق کوئی خاص واقعہ بتائیے" میں نے اگروال صاحب سے کہا "تاکہ آپ کی طرف سے منشی جی کو میں خراج عقیدت پیش کر سکوں۔"

"ایک بات ہو تو بتاؤں بھی"۔ وہ بولے "عوام تو عوام انگریز سرکار بھی ان کی عزت کرتی تھی۔ انھیں رائے صاحب کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ آنریری مجسٹریٹ بنا دیے گئے تھے۔ بہت انصاف پرور انسان تھے۔ کبھی کسی کو بچگانہ دی غلطی کرنے والے کو اخلاقی طور پر سمجھا بجھا دیتے تھے اور اس طرح بڑے بڑے جھگڑے امن و سکون سے طے کر دیتے تھے"۔

اگروال صاحب ذرا رک کے پھر کہنے لگے "۱۹۳۱ء میں شہید بھگت سنگھ کی لاش جیل سے غائب کر دینے پر عوام انگریزوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ انگریز نے یہ صورت حال دیکھی تو اس جھگڑے کو فرقہ وارانہ نوعیت دے دی۔ تین دن اور تین رات تک پورا کانپور بغیر پولیس انتظام کے رہا۔ منشی جی نے اس دوران فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بہت عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ان کی شرن میں تقریب ڈھائی سو ہندو مسلمان آ گئے جن کی نہ صرف انھوں نے حفاظت کی بلکہ اپنے خرچ پر ان کی خوراک کا انتظام کیا۔ وہ دن رات لوگوں کو سمجھاتے بجھاتے رہتے۔ راتوں میں ہم نوجوان چھتوں پر چڑھ کر شرپسندوں سے مدافعت کرتے۔ اب ایسے لوگ کہاں ہو سکتے ہیں۔ وہ بہت عظیم انسان تھے"۔

کہتے کہتے اگروال صاحب کی آواز میں کچھ رقت آ گئی تھی۔

رونا کس بات کا؟

تم کیوں افسردہ ہوتے ہو؟ اس لیے کہ تم غریب ہو اور تمھارے پاس روپیہ نہیں ہے مگر کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ گلاب کا پھول کیونکر مسکرا رہا ہے حالانکہ اس کے پاس مال و زر نہیں ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ باغ میں بلبل کیسے چہچہا رہا ہے حالانکہ اس کے پاس ایک کوڑی تک نہیں ہے۔ تم کیوں روتے ہو؟ اسلئے کہ تم دنیا میں بے یار و مددگار ہو۔ مگر کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ گھاس کا سرسبز تنکا صحرا میں تنہا کھڑا ہے لیکن وہ کوئی سرد آہ نہیں بھرتا بلکہ جس مقصد کو پورا کرنے کے لیے پرماتما نے اُس کو پیدا کیا ہے وہ اسی کو پورا کر رہا ہے۔ تم اس لیے روتے ہو کہ تمھارا عزیز بیٹا یا تمھاری پیاری بیوی تم سے جدا ہو گئی مگر کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ تمھاری زندگی کا بہترین زمانہ وہ تھا جبکہ نہ تم بچہ رکھتے تھے نہ بیوی بلکہ تم ایک بے غم بادشاہ تھے کیا تم نے نہیں پڑھا کہ گوتم بدھ کے جب بچہ پیدا ہوا تو اس نے سرد آہ بھری اور کہا "آج ایک بندھن اور بڑھ گیا" چنانچہ اسی رات اپنی بیوی اور نوزائیدہ بچہ کو چھوڑ کر روشنی کی تلاش میں راج بھون سے جنگل کو چل دیا۔ نوٹ کر لو جس چیز کی آمد سے تم خوشی حاصل کرتے ہو اس کے چلے جانے پر تم ضرور صدمہ اٹھاؤ گے۔ اگر تم اپنی ایسی زندگی بنا لو کہ نہ تم کو کسی کی آمد پر خوشی ہو نہ برآمد پر رنج تو تمھارے آنسو یکلخت خشک ہو جائیں گے۔ اپ نشد میں لکھا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو سب میں اور سب کو اپنے آپ میں دیکھتا ہے اس کو نہ آنے کی خوشی نہ گئے کا رنج۔ یہ ایک صداقت ہے تم اپنے فرض کو پورا کرو گھاس کے تنکے کی طرح پورا کرو جو کہ ہوا کو صاف کر رہا ہے پھر تم نہیں روؤ گے بلکہ دوسرے اشخاص تم پر شبنم کی طرح آنسو بہائیں گے جبکہ تم دنیا میں نہیں ہو گے۔ احمق ہے وہ انسان جو دنیا اور دنیا کی چیزوں کے لیے روتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ جن کے لیے وہ روتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کا ساتھ نہیں دے گی۔

زمانہ۔ اگست ۱۹۱۰ء

منشی دیانرائن نگم — مجاہدِ قلم

(جناب رام پرکاش راہی صاحب)

رگوں میں اس کی
رچی ہوئی تھی، بسی ہوئی تھی
وطن کی الفت ....
وطن کی الفت جو بے محابا
وطن کی خدمت کے کارزارِ وفا طلب کی
اسیم وسعت میں کود پڑنے کی منتظر تھی
غلام، مجبور، موک جنتا کے گاندھی بابا ....
نہتے نیتا کی چھتر چھایا میں
نورِ ہستی کی جگمگاہٹ
شعورِ ہستی کی تلملاہٹ
متاع کا ہست اور کیا تھی ....!
قلم اٹھایا
بساطِ قرطاس کو سنبھالا
سموئے اس میں مچلتی سوچوں کے تیز دھارے
جو بہتے بہتے ملائے رکھتے تھے
ایک دوجے سے
پیارے پیارے
وطن کی ندیا کے دو کنارے ....
وہ دو کنارے، جنھیں برابر، بس ایک پانی ہی پاٹتا تھا
ملا جلا سا، وہ ایک گنگ و جمن کا پانی
جسے تمدن کی نزہتوں نے .... زبانِ اردو کا نام بخشا
شعورِ نثری، شعارِ شعری نے پُر فصاحت .... بیانِ اردو کا نام بخشا

زبانِ اردو، بیانِ اردو کی وسعتوں میں
ادب، صحافت کا چولی دامن سمان رشتہ
وہ کچا رشتہ، اٹوٹ رشتہ
خلوصِ منشی دیا ترائن نگم کے ہاتھوں میں اک کرامات بن کے لہکا
پرو لیے اس نے اپنے معصوم پیچ وخم میں ....
انیک ہیرے، انیک موتی
کہ جیسے حالی، نذیر، شبلی
سرور، اکبر، شرر، عزیز و رواں کہ حسرت
علامہ اقبال اور چکبست
وہ پریم چند اور عظیم فانی
یہ ہیرے موتی، امول گوہر، تمام مل کر
نگم کی مالا میں جگمگائے
تو اک زمانے نے "اس زمانہ" کے گیت گائے
جسے نگم نے بڑے تردد، بڑے تدبر سے
ملک وملت کی ایکتا کی علامتِ جاوداں بنایا
تسلسلِ خدمتِ وطن کو ادب کی روحِ رواں بنایا
قلم کے حربے کو احتجاجِ عدم تشدد کا پُراثر ترجماں بنایا
زماں مکاں کے بدلتے تیور سجا ہیں لیکن
جہاں یہ اردو ادب کے گوہر
زماں مکاں کے اُن تقاضوں سے ماورا ہیں
کوئی زمانہ
عمیق یادوں کے آئینے میں
رچا ہوا پرتو "زمانہ"
مٹائے کیوں کر، مٹائے گا کیوں؟
وفا کی رسمِ کہن جو بنیاد استواری پہ منحصر ہے
اُسے زمانہ مٹائے کیوں کر
اُسے زمانہ مٹائے گا کیوں؟

بابو جی

(جناب ٹھاکر چند ربھوشن سنگھ)

اپنے آقائے نامدار منشی دیا نرائن نگم صاحب کو ان کے دفتر کے ملازمین فرطِ محبت سے بابو جی کہا کرتے تھے۔ یوں تو زمانہ سے راقم الحروف کے تعلقات ۱۹۳۳ء سے ہی شروع ہو چکے تھے مگر جولائی ۱۹۳۵ء سے ان پر ایک گہرا رنگ چڑھنا شروع ہوا جو بابو جی کی وفات کے بعد آج بھی قائم ہے۔

مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ بابو جی سے دیانتداری، صاف گوئی اور خودداری کی جو تعلیم مجھے ملی وہ میری سب سے بڑی دولت ہے۔ میرے نام ان کے لکھے ہوئے خطوط سری دیریندر پرشاد سکسینہ کی معرفت رسالہ ہماری زبان میں چھپ چکے ہیں۔ کچھ اہم خطوط جناب محشر بدایونی کے پاس بھیج دئے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ شائع ہوئے یا ضائع ہو گئے۔

بابو جی کے پاس اساتذہ اردو کے خطوط کا ایک بیش بہا خزانہ الگ الگ فائلوں میں تاریخ وار لگا ہوا موجود تھا۔ ان میں ڈاکٹر نظیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، سرور جہاں آبادی، نوبت رائے نظر، عزیز، صفی، چکبست، ڈاکٹر اقبال، اصغر، جگر، حسرت موہانی، فانی بدایونی، محروم، رواں، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عبد الحق سر شیخ عبد القادر، پریم چند اور لالہ لاجپت رائے نیز سوامی رام تیرتھ کے خطوط موجود تھے۔ افسوس کہ یہ علمی دولت بجز خطوط پریم چند اور قومی ترانہ ڈاکٹر اقبال (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) تلف ہو گیا جس کی تلافی ناممکن ہے۔

بابو جی کو ناموں کے انتخاب میں بھی کمال حاصل تھا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ پریم چند کا نام انھیں کے حسن انتخاب کا گواہ ہے۔ دوسری مثال جو میرے سامنے کی بات ہے وہ حضرت جوش ملیح آبادی کے ادبی رسالہ کی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت جوش نے اپنے نئے مجوزہ رسالہ کا نام "کاخ بلند" رکھ کر بابو جی کو خط لکھا۔ یہ ثقیل نام جو فردوسی کے شعر ...... کاخ بلند ...... کہ از بادو باراں نہ آید گزند کی رعایت سے رکھا گیا تھا۔ بابو جی کو پسند نہیں آیا اور اس کے بعد جوش صاحب نے کلیم نام سے اپنا رسالہ نکالا۔

بابو جی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ادیب یا شاعر رسالہ یا اخبار نکالنے کے چکر میں پھنسے۔ رسالہ نکالنا ادیب کے بس کی بات نہیں ہے۔ منشی پریم چند نے اس کا خمیازہ اٹھایا تھا۔ حضرت جوش بھی اپنا بار دوسروں پر ڈال کر الگ ہو گئے خود بابو جی بھی عمر بھر اس کا خمیازہ اٹھاتے رہے۔ مالی نقصانات تو اٹھاتے ہی تھے، اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت کے باوجود وہ بہت کم لکھ سکے کیونکہ اڈیٹری کے فرائض ایک خاص قسم کا لٹریچر پیش کرنے کے علاوہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی کہاں دیتے ہیں۔ انھوں نے ادیب اور شاعر ضرور پیدا کئے ہیں۔ کتنے مبتدیوں کو اعلیٰ درجہ کا

ادیب بنا دیا گر خود کچھ زیادہ نہ لکھ سکے۔ وہ ۱۹۰۳ء کے بی۔ اے تھے۔ چاہتے تو اپنے چھوٹے بھائی سری رام سرن نگم مرحوم کی طرح ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے شروع کرکے کمشنر کے اعلیٰ عہدہ تک پہونچ سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کچھ لوگ یہ بھی چاہتے تھے کہ زمانہ دیوناگری حروف میں ہندی زبان میں شائع کیا جائے۔ آئندہ خسارے کی ضمانت لیتے ہوئے دھنی اور کچھ پونجی والے لوگ پچھلا نقصان ادا کرنے کی بات بھی کہتے تھے مگر دھندار بابوجی اس کے لیے کبھی رضامند نہیں ہوئے اور یہ انھوں نے بہت اچھا کیا۔

راقم الحروف بھی اسی قسم کی دولت سے مالامال ہے اور یہ بابوجی کی دین ہے۔ ادیبوں سے ملنا، ان کی تصنیفوں کو پڑھنا یہی اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ بغرض بابوجی سے جو کچھ اسے ملا وہ اس کو ہر طرح سے مطمئن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ خوشی کسی دولت سے کم نہیں کیونکہ اطمینان نہیں تو کچھ نہیں اور اگر اطمینان ہے تو پھر اور کیا چاہیئے۔

صد سالہ جشن ولادت کی اس یادگار اشاعت کے موقع پر یہ شعر پڑھتا ہوا میں بابوجی کی خدمت میں سرنیاز خم کرتا ہوں ؎

شعور سجدہ نہیں ہے مجھ کو' تو میرے سجدے کی لاج رکھ لے
یہ سر ترے آستاں سے پہلے کسی کے آگے جھکا نہیں ہے

مسافر

اس کا چہرہ گرد آلود تھا
سفر کی کوفت سے اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
اس کا لباس غلیظ اور بوسیدہ تھا
اس نے مجھے جھک کر سلام کیا
میں نے جذبات تفاخر کے ماتحت کہا: "کیا چاہتے ہو؟"
"میں مسافر ہوں"
"برسوں سے یونہی راستہ طے کیے جاتا ہوں"
"راہ میں ملنے والے آدمی کو سلام کرنا میری عادت ثانیہ بن چکی ہے"
"مجھے کچھ نہیں چاہیئے"
یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا
میں متحیر خاموش کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔
یہ مسافر مجھ سے زیادہ شریف ہے۔
جو اپنی منزل کی طرف بڑھے جاتا ہے
جو اپنی راہ کی صعوبات اور آفات سے نہیں گھبراتا اور
جو لوگوں کو بے لوث سلام کرتا ہے۔
آہ نمائش اور نمود نے
ہمیں حقیقت سے کس قدر بعید کر دیا ہے۔
ہم سب سفر حیات میں مصروف ہیں
مگر منزل سے غافل' شرافت سے عاری اور انسانیت سے محروم
دور افق مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا
مگر مسافر کا سایہ آگے ہی آگے بڑھتا نظر آتا تھا
خدا جانے وہ اپنی منزل پر پہونچا یا نہیں۔
مگر اس نے میرے غرور کو شکست ضرور دی۔

(زمانہ۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

دادا صاحب

برج نرائن نگم

ہم اپنے والد صاحب کو دادا صاحب کہتے تھے۔ وجہ بہت معمولی، وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اور وے سب انھیں دادا یا دادا کہتے تھے۔ جب میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا اس وقت تک ابتدائی منازل طے ہو چکے تھے اور عمر اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ خاندانی پیشہ وکالت بالائے طاق رکھا جا چکا تھا۔ خسارہ کے ڈر سے جائداد کا بٹوارہ کر کے دادا صاحب کو خاندانی جائداد سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بزرگانِ خاندان کی مرضی و رائے کے خلاف اٹھایا گیا تھا۔ ان سب با مخالفت کے باوجود اپنے ارادہ پر مستحکم رہے کتنی زیادہ ہمت تھی۔ کتنا زیادہ مصمم ارادہ۔ کتنا زیادہ ذوقِ ادب!

ساتھ ہی بے لوث لوگوں کا شروع ہی سے ہوا تھا۔ جناب منشی راج بہادر صاحب دیوان رامپور اسٹیٹ جو 'زمانہ' کے بانی تھے انھوں نے کبھی اپنا نام ظاہر نہیں ہونے دیا حالانکہ ہر طرح کی مالی امداد کرتے رہے تاکہ 'زمانہ' زیست سے محروم نہ ہو جائے۔ جناب منشی شیو برت لال ورمن صاحب جو اپنی قربانیوں اور خدمات کی وجہ سے مہرشی کے درجہ کو پہنچے اور رودیال باغ آگرہ کے بہت ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہوئے اس کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ لیکن ذاتی حوادث کی وجہ سے ان کو چھٹی کی سخت ضرورت پڑ گئی۔ نگاہ منتخب نے دادا صاحب کو چنا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال ہی کی تھی۔ بی۔ اے پاس کر کے قانون کی پڑھائی کر رہے تھے لیکن اس عمر میں بھی اردو ادب میں ستارہ بن کر چمکنے لگے تھے۔ ان کا پہلا مضمون اس وقت کے نامور رسالہ 'مخزن' لاہور میں ۱۹۰۱ء ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ دادا صاحب اور بھی رسائل میں لکھتے تھے جس میں پٹنہ سے جاری ہونے والا 'کایستھ سماچار' بھی تھا۔ چنانچہ جناب سچدانند سنہا صاحب جو پٹنہ سے دہلی جا رہے تھے دادا صاحب سے کانپور اسٹیشن پر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ کانپور اسٹیشن پر جب ایک نوعمر طالب علم ملاقات کے لیے سامنے آیا تو حیرت میں رہ گئے۔ بے ساختہ کہا 'برخوردار۔ یہ عمر اور یہ زورِ قلم'، اس کے بعد ہمیشہ

کے لیے ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے اور یہ رشتہ تا زیست قائم رہا۔

'زمانہ' فروری ۱۹۰۳ء میں بریلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں پرچہ دادا صاحب کا پہلا مرتبہ پرچہ ہے۔ اس کے سرورق پر تحریر ہے "حسب فرمائش لالہ شیو برت لال ورمن ایڈیٹر" اور اپنے نام کے پہلے "مرتبہ" لکھا۔ شروع سے لے کر ۱۹۴۲ء کے آخری پرچہ تک انھوں نے "مرتبہ" کے لقب کو اپنایا۔

جنوری ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں جو نوٹ تحریر ہے اس میں دادا صاحب نے لکھا ہے کہ شوق اکتساب و خدمت ملکی نے بالآخر فتح پائی اور 'زمانہ' کی ترتیب اپنے سر لی گئی۔ جوش خدمت ملک ایسا جوش ہے کہ جس کے آگے اپنی ہستی، اپنا مستقبل کچھ بھی معنی نہیں رکھتا یا یوں کہیے کہ یہ وہ دماغی سیلاب ہے کہ جو اس سے لطف اندوز ہو وہی اس کے بہاؤ کی رفتار کو سمجھ سکتا ہے۔

جولائی ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں دادا صاحب نے اپنا ذہنی معیار اور نصب العین 'زمانہ' کے بارے میں مفصل طور پر تحریر کر دیا (ملاحظہ ہو عرض حال صفحہ ۱۳) ظاہر ہے کہ دادا صاحب کی نگاہ میں خدمت ملک کا ایک مکمل نقشہ کھنچا ہوا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنا نصب العین کو اس طرح سادی زبان میں بیان کر دیا۔ نہ صرف بیان ہی کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے اور اپنی ۲۱ سال کی عمر سے لے کر حیات کے آخر تک اپنی قریب چالیس سال کی ادبی زندگی میں ہر طرح سے نبھایا۔ کسی قسم کی لغزش نہ ہوئی۔ باہمی میل جول و قومی یک جہتی کے زبردست علم بردار رہے اور ضمیر اور خدا سے ہی واسطہ رکھا۔ ملک کی پولیٹیکل جد و جہد میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے اور سوشل ریفارم کے بانی دحامی رہے۔

اس ذہنی معیار اور نصب العین پر عمل درآمد کرنا آسان نہ تھا۔ دو مرحلے سامنے تھے ایک تو مضامین نگار کا دوسرے اقتصادی۔ مضامین اور مضامین نگاروں کی دشواری حائل نہیں ہوئی۔ دادا صاحب کی خط نگاری اور طرز تحریر شاید کچھ اس قدر دلکش تھا کہ جس کو بھی لکھا اس نے کھلے دل سے آگے بڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے سیدھے اور سچے طرز تحریر سے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے منکسر اور ملنسار مزاج نے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بیان پالیسی سے لوگ متاثر ہو گئے ہوں یا ان سب ہی خوبیوں کا میل جول رہا ہو۔ غرضکہ ابتدا ہی سے چوٹی کے ادیبوں اور شعرا کے مضامین اور نظمیں زیب 'زمانہ' ہوتی رہیں۔ بفضلہ قلمی معاونین کی کمی کبھی دادا صاحب نے محسوس نہیں کی۔ ان کو جستجو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھی اور خط کتابت کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شاید دادا صاحب کی ہر دلعزیزی یا 'زمانہ' کا معیاری رسالہ ہونے کی وجہ سے بہترین انشا پردازوں اور شعرا نے 'زمانہ' کو اور رسائل کے اوپر ترجیح دی۔ یہاں پر کم سے کم چند ہستیوں کا ذکر بے موقع نہ ہوگا جیسے اکبر الہ آبادی، سوامی رام تیرتھ، لالہ لاجپت رائے،

نواب محسن الملک، پریم چند، مولانا شبلی، حالی، نذیراحمد، سرور، چکبست، مہاراجہ کشن پرشاد، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی۔ فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی۔ یوں تو شاید ہی کوئی اعلا پیمانہ کے ادیب یا شاعر۔ باہو جس کا تعلق زمانہ اور اس کے ایڈیٹر سے نہ رہا ہو۔

اکبر الہ آبادی نے تو از سرِ نو دوبارہ قلم اٹھا کر 'زمانہ' میں جنوری ۱۹۰۴ء سے مستقل لکھنا شروع کیا۔ داداصاحب کے اصرار پر علامہ اقبال نے قومی ترانہ لکھا جو کہ ستمبر ۱۹۰۴ء کے 'زمانہ' میں پہلی بار 'ہمارا وطن' کے عنوان سے طبع ہوا۔ اکبر الہ آبادی کی اولین نظم و قومی ترانہ اس رسالہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ پریم چند کے ابھرنے میں بھی داداصاحب کا کافی ہاتھ رہا۔ کچھ ضرور خصوصیت داداصاحب میں ہوگی۔ حالانکہ اخیر تک وہ اپنے آپ کو "مرتب" ہی کہتے رہے جیسے کہ سوائے ترتیب دینے کے اور کچھ زیادہ کام نہیں کیا۔

زمانہ اولاً قیصری پریس بریلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ جب داداصاحب نے یہ کام اپنے کندھوں پر لے ہی لیا تو ضروری ہوگیا کہ اس کا دفتر اور طباعت کا کام کانپور میں منتقل کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی اخیر ۱۹۰۴ء تک ہوگیا اور چند ہی سال کے عرصہ میں 'زمانہ' پریس بھی کانپور میں قائم ہوگیا۔ یہ ایک مختصر سا پریس تھا جو 'زمانہ' کی اشاعت کے لیے کافی سمجھا گیا۔

جب میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا اور ہوش سنبھالا تو اسی چھاپہ خانہ کی کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ کے شور میں پلا۔ یہ میرے لیے شور نہیں تھا اور نہ ہے، یہ نغمہ تھا جو آج بھی میرے دل کے لیے کشش رکھتا ہے۔ طبیعت ہوتی ہے کہ اس مشین کے نغمہ کو زندگی بھر سنتا رہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسے لوگ کریہہ سمجھیں دوسرے کے لیے نغمہ ہو۔ انگریزی کہاوت ہے "ایک آدمی کی غذا دوسرے کے لیے زہر ہوسکتی ہے"۔

۱۹۱۲ء میں اخبار آزاد کا اجرا ہوا۔ شاید وجہ یہی تھی کہ 'زمانہ' کی آمدنی گھر کے مصارف کے لیے ناکافی تھی۔ چھاپہ خانہ میں بھی کام کافی نہ تھا اس لیے تھوڑے ہی اسٹاف سے آزاد کا جاری کرنا ممکن ہوگیا۔ ہفتہ وار کی صورت میں نمودار ہوا اور شروع میں بہت کچھ توقع پوری کی۔

ادھر ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی اور کچھ عرصہ کے لیے 'آزاد' روزانہ اخبار ہوگیا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہوتے بڑھتی گرانی اور روپیہ کی قیمت میں گراوٹ کی وجہ سے مالی مشکلات بڑھتی ہی گئی۔ چنانچہ 'زمانہ' پریس کو فروخت کرنا پڑا۔

اردو زبان اتنے زیادہ عرصہ سے ملک کی زبان ہونے پر بھی خاطر خواہ ترقی نہ کرسکی تھی۔ نہ ہی اپنی جڑیں مستحکم کرسکی۔ کم سے کم یہ تو ظاہر ہی ہے کہ 'زمانہ' ایسے معیاری اور پایہ کے رسالے کو بھی کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہ کسی سربراقتدار ادارہ یا قدردانان اردو سے ملی۔ نہ دائرہ

خریداران ہی خاطر خواہ ہوا کہ کبھی فراغ البالی سے سانس لی جاسکتی۔ جو زبان ایسے رسالے کے لیے کم از کم چار ہزار خریدار صرف پانچ روپیہ سالانہ بطور چندہ خریداری کے بھی نہ پیدا کر سکے تو اس کے مستقبل کا خدا ہی حافظ۔ بہت پرانی مثل ہے زبان نیچے سے اٹھتی ہے نہ کہ اوپر سے تھوپی جائے۔ اگر آپ ان سب امورات کا صحیح اندازہ لگا سکیں تو آپ دادا صاحب کی زندگی کی روزمرہ رسّہ کشی کو سمجھ سکیں گے اور ان کے پایہ استقلال کی داد دے سکیں گے۔ ان کے سامنے ایسے حل بھی پیش ہوئے جب کہ کہا گیا کہ اسے ہندی میں نکالا جائے۔ اس کے معیار کو بدل ڈالا جائے لیکن دادا صاحب کی خود داری نے اسے کبھی منظور نہیں کیا اور اپنے ذہنی معیار جو انھوں نے خود ہی قائم کیا تھا اُسے تبدیل کرنا گوارا نہ کیا۔ نہ ہی کسی قسم کی لغزش آنے دی اور نہ ہی اردو کو خیرباد کہا۔ خانہ داری کے بڑھتے ہوئے اخراجات، یونیورسٹی و کالج کی پڑھائی کا بڑھتا ہوا خرچ ان سب حوصلہ شکن منازل کو طے کرنے کے لیے کس قدر ہمت اور زبردست استقلال لازمی رہا ہوگا۔

یہاں پر اپنی والدہ یعنی دادا صاحب کی رفیقہ حیات کا تذکرہ لازمی ہے کیونکہ انھیں کی ذات صفات کی وجہ دادا صاحب اپنی روش اور معیار پر قایم رہ سکے۔ بہتر ہے کہ میں دادا صاحب ہی کے الفاظ میں ان کا ذکر کروں جو انھوں نے میری والدہ کی وفات کے بعد قلمبند کیے تھے (ملاحظہ ہو آپ بیتی زمانہ اگست ۱۹۳۹ء)

"مسز دیا نرائن کے حسن انتظام، سلیقہ مندی، معاملہ فہمی اور گھریلو دوراندیشی کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی انتہائی ناشکری ہوگی۔ انھیں کے سلیقہ شعاری اور جفاکشی کی بدولت راقم اتنے دنوں گھر گرہستی کے تمام بکھیڑوں سے آزاد رہ کر ملک کی بری بھلی جو ادبی خدمت ممکن ہوئی اطمینان اور سہولت سے انجام دے سکا۔ مرحومہ کی حسن لیاقت اور تندہی کی بدولت میری زندگی بے فکری و آسودہ حالی میں بسر ہوئی۔ انھیں کے ایثار و جفاکشی کی وجہ سے مجھے اپنے محدود ذرایع کے باوجود وہ اطمینان قلب رہا جس سے زیادہ وسیع ذرایع والے شخص کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا اور اگر مصائب و مشکلات میں بھی میری ہمت قائم رہی تو اس کا کریڈیٹ اسی نیک بخت خاتون کو ملنا چاہیے جس نے میرے کنبے کی پرورش و تربیت کا بار اس قابلیت و جفاکشی کے ساتھ اپنے ذمہ لے رکھا تھا جس نے شروع سے آخر تک اپنی زندگی کے پچاس سال فرض شناسی خدمت گزاری اور دوسروں کی دلجوئی میں بحسن و خوبی بسر کر دیے جو جیتے جی دوسروں کے لیے مرتی رہی۔"

انھیں وجوہات سے وقت کٹتا گیا اور 'زمانہ' زمانے کے ساتھ عمر پاتا گیا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ 'زمانہ' یا 'آزاد' کا کوئی نمبر نہ نکلا ہو۔ اتنی مستحکم زندگی یا طولانی عمر شاید ہی کسی اردو رسالہ یا اخبار کو ملی ہو۔

دادا صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہی جا چکا ہے جو کہ 'زمانہ' کے یادگار نمبر کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں ناظرین کی توجہ حضرت جوش ملیح آبادی

کی نظم "نگاہ خلوص بیتی" اور اس کے جواب میں جو خط دادا صاحب نے لکھا ہے، کی طرف مبذول کروں گا۔ دادا صاحب کے کیریکٹر کا ایک خصوصی پہلو جس سے کہ ظاہر ہے کہ وہ خود ستائی کو پسند نہیں کرتے، نمایاں ہے۔ خیال رہے کہ یہ نظم ان کی زندگی کے بعد ہی 'زمانہ' کے یادگار نمبر میں پہلی بار شایع کی گئی تھی۔

ایک اور خصوصی پہلو مارچ ۱۹۳۱ء میں نمایاں ہوا جبکہ سردار بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد کانپور میں سخت احتجاج کی صورت اختیار کی۔ ہم لوگ ایک ہندو مسلم ملی جلی آبادی والے محلہ میں رہتے تھے۔ محلہ کھنیا بازار، مچھلی بازار، مصری بازار، نزدیک میں، چوبے گولہ، قصائی باڑہ، نئی سڑک بھی دور نہیں تھا مگر خوش حال طبقہ زیادہ ہے۔ مندر اور مسجد بھی کافی ہیں۔ شری گنیش شنکر ودیارتھی دادا صاحب سے ۷۔۸ سال عمر میں چھوٹے تھے۔ ان کے نزدیکی دوست اور ہم پیشہ تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب ودیارتھی جی نے ہندی کا ہفتہ واری 'پرتاپ' کا اجرا کیا اس وقت دادا صاحب اردو صحافت کی زندگی میں دس سال گزار چکے تھے۔ کافی صلاح مشورے ہوتے تھے اور اکثر ملاقات اور گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔

مارچ ۱۹۳۱ء کا فساد کچھ زیادہ ہی فتنہ انگیز تھا۔ ہم دو بھائی اس وقت الہ آباد میں طالب علم تھے۔ دادا صاحب اور والدہ کی زبانی بعد میں معلوم ہوا کہ محلہ کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ فساد نے ہیبت ناک صورت اختیار کر لی تھی۔ ہندو مسلم اپنے اپنے مکان چھوڑ چھوڑ کر حفاظت کی جگہ چلے گئے تھے۔ دن کو کم لیکن رات کو بیشتر ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کی دہشت اور بھی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی اہمیت آپ تب ہی سمجھ سکیں گے اگر آپ شہر کے قتل و خون کے بیچ تاریک رات میں چاروں طرف سے اٹھتے ہوئے نعروں کی گونج کا تصور کر سکیں ساتھ ہی اپنے کو اکیلا بے یار و مددگار محسوس کر سکیں۔ سب ہی خواہاں نے صلاح دی کہ مکان چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اس مسئلہ پر بہت غور ہوا لیکن یہ خیال کر کے کہ جانے کے بعد محلہ میں خون خرابہ کی انتہا نہ رہے گی ترک مکان کا خیال چھوڑ دیا گیا۔

ودیارتھی جی شہادت سے دو گھنٹہ پہلے دادا صاحب سے ملنے مکان پر آئے تھے۔ بہت دیر تک صلاح و مشورہ ہوتا رہا۔ فساد کو فرو کرنے کی ترکیبیں سوچی گئیں۔ گشت کے مشورے ہوئے، دونوں اصحاب باہر نکلے۔ ودیارتھی جی چوبے گولہ ہوتے ہوئے نئی سڑک کی طرف جانے لگے منع کرنے پر بھی نہ مانے اسی کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کی شہادت ہو گئی۔ تب تو فساد نے بہت ہی خوفناک صورت اختیار کر لی۔ محلہ والے سخت پریشان ہو گئے لیکن دادا صاحب نے اپنے پلے استقلال کو نہ ڈگنے دیا بلکہ محلہ کے جو ہندو و مسلمان خوف زدہ تھے ان سب کو بلا کر بلا امتیاز اپنے گھر میں جگہ دی۔ یہ دلو اصاحب

کا ذاتی رسوخ و ہر دلعزیزی ہی تھی کہ کسی بھی محلہ والے ہندو یا مسلم کا بال بانکا نہیں ہوا۔ اس طرح ایک اور ذہنی معیار وقت آزمائش پر میدان عمل میں بھی پورا اترا۔

ایک اور خصوصی پہلو دادا صاحب اور میرے بیچ گفتگو میں ابھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا۔ میں ایم۔ ایس سی پاس کر چکا تھا۔ مقابلہ کے امتحانات کی تیاری میں ہمہ تن مشغول تھا۔ ملک میں کچھ اقتصادی گراوٹ کی وجہ سے سرکاری ملازمت میں داخلہ بہت محدود و کم ہو گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی صاحبان مقابلہ سے ملازمت میں داخلہ حاصل کر چکے تھے۔ مجھے اپنے اوپر اطمینان تھا پھر بھی یہ وقت بہت مشکل و دشوار ہوتا ہے۔

اس وقت دادا صاحب کے ایک عزیز دوست انکم ٹیکس محکمہ میں برسر اقتدار تھے۔ انسپکٹروں کی بیسیوں جگہ کا اعلان ہوا۔ داخلہ محض انتخاب سے تھا۔ تنخواہ ضرور کم تھی، دادا صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں یہ ملازمت پسند کروں گا میں نے انکار کر دیا سوچا کہ اگر اتنی ہی تنخواہ کی ملازمت کرتا ہے تو گھر کا اخباری کام کیا برا ہے۔ دس ہی پندرہ روز میں طبیعت نے پلٹا کھایا سوچا کہ گھر کی ملازمت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جو ملتا ہے وہی سہی۔ اس کے پہلے گھریلو باتوں میں دادا صاحب کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ برخوردار شکر ادا کرو تم لوگوں کو میں نے کاتب یا دفتری نہیں بنا دیا۔ جو کہ بہت حد تک سچ تھا۔ جن مراحل سے دادا صاحب گزرے تھے وہ سب ہم لوگوں کو معلوم تھے۔ چنانچہ میں نے دادا صاحب سے ذکر کیا کہ مجھے وہ ملازمت منظور ہے کوشش کر دیجیے۔ کسب معاش کے بلند خیالات عملی صورت کی کشمکش کس کو پریشان نہیں کرتی۔ کس کے پیر نہیں لڑکھڑاتے۔ کس کا دماغ لغزش نہیں کھاتا۔ یہ بات سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہے پھر جو جواب دیا اس سے میں حیرت میں پڑ گیا۔ فرمایا برخوردار میں نے تمھیں پہلے ہی موقع دیا تھا۔ تم نے انکار کر دیا اب میں اپنے ایک دوست کے لڑکے کی سفارش کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اب میں پہلے ان کی سفارش کروں گا اور اگر گنجائش سمجھی تو تمھارے لیے دوسرے نمبر پر کہنے کی کوشش کروں گا۔ سفارش کیجیے یا مقدر وہ دوست کا لڑکا منتخب ہو گیا اور بالآخر پاکستان بننے پر تبادلہ ملازمت پر جا کر انکم ٹیکس کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ اس وقت تو مجھے بہت تکلیف محسوس ہوئی لیکن آج میں اس کی وجہ سے دادا صاحب کی دوگنی عزت کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ایسا کیریکٹر مجھے بھی عطا فرمائے۔ یہ انسانی خوبی نہ تھی یہ خصلت فرشتہ تھی۔ جو معیار ذہنی اپنے لیے قائم کیا اس پر عمل بھی کیا۔ اصول کے لیے ہر قسم کی قربانی انھیں بہر صورت منظور تھی۔

اب اور کچھ لکھنے کو باقی نہیں ہے البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دادا صاحب نے اپنی ساری زندگی، اپنی ساری خدمات، اپنا سارا اثاثہ اپنا حال اور مستقبل سبھی کچھ اردو کے نذر کر دیا۔ کسی صلہ کی [illegible] کی کسی ستائش کی تمنا نہیں کی، کسی صلہ کے خواستگار نہیں [illegible]

رہے لیکن اردو زبان اور قدر دانان اردو نے انھیں کیا کچھ دیا۔ ان کی وفات سے چالیس سال کے عرصہ میں ایک دفعہ بھی انھیں یاد نہ کیا گیا۔ افسوس تو یہی ہے کہ ان سب کے باوجود اردو بولنے والے اصحاب (جن میں میں بھی شامل ہوں) کیا کچھ نہیں چاہتے لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آپ کیا کریں گے۔ یہ کبھی خیال بھی نہ آیا کہ میں کیا کروں گا اگر سوال ہے تو صرف اتنا کہ مجھے جو چاہیے وہ کیوں نہیں ملتا۔

پیڑ وہی سرسبز ہوتا ہے جس کی خدمت کی جائے۔ جڑیں مضبوط بنائی جائیں لیکن کیا اردو کی جڑیں مضبوط ہیں۔ کیا جڑیں خاطر خواہ ہیں۔

❖　❖　❖

نذرِ حقیر

صبح کا وقت تھا، پہاڑی کے سرو پہلو سے ٹکراتا ہوا دریائے جمنا خاموشی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایک چٹان پہ بیٹھے ہوئے گرو جی اپنے بھگتوں کو دھرم اپدیش دے رہے تھے، فضا امرت برسا رہی تھی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ دریا بھی اسی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ گرو جی بھی اسی طرح اپدیش دے رہے تھے

گرو جی کا چیلا رگھو ناتھ بھی آیا، اس نے گرو جی کو پرنام کرتے ہوئے کہا "میں شری مہاراج کی سیوا میں یہ نذرِ حقیر لایا ہوں، قبول فرمائیں۔ یہ کہہ کر اس نے گرو جی کے نزدیک دو بیش بہا طلائی کڑے رکھ دیے۔ سورج کی کرنیں پڑتے ہی کڑے جگمگا اٹھے۔ رگھو ناتھ کے چہرے سے غرور جھلکنے لگا

گرو جی نے اپدیش دیتے دیتے ایک کڑے کو انگلی میں ڈال کر گھمانا شروع کیا۔ کڑا انگلی سے نکل کر دریا میں جا پڑا گرنے کی ذرا سی آواز ہوئی، پھر فضا ساکن ہو گئی۔

رگھو ناتھ دریا میں گھس کر کڑا تلاش کرنے لگا۔ صبح سے شام ہو گئی مگر کڑا نہ ملا۔ رگھو ناتھ واپس آیا۔ اس کے تمام کپڑے پانی میں تر بتر ہو گئے تھے، بدن تھکان سے چور اور چہرہ اترا ہوا تھا۔

اس نے گرو جی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر عاجزی سے دریافت کیا "اگر مہاراج مجھے یہ بتلانے کی کرپا کریں کہ کڑا کس طرف اور کہاں گرا تو میں اسے پھر تلاش کروں ممکن ہے مل جائے۔"

گرو جی نے دوسرے کڑے کو پانی میں پھینکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "وہاں"

دریا میں پھر ذرا سی آواز ہوئی اور تمام فضا اسی طرح پھر خاموش ہو گئی۔

ترجمہ ۱۳ اپریل ۱۹۷۰ء　　　ٹیگور

بھولی بسری یادیں

سری نرائن نگم

بچپن میں میں نے جب آنکھیں کھولیں اور کچھ شعور آیا تو میں نے دیکھا کہ والد کے پاس آنے والوں کا سلسلہ تقریباً صبح سے شام تک جاری رہتا تھا اور علمی ادبی چرچوں، شعر و شاعری کے تذکرے اور سوشل پولٹیکل مسئلوں پر پُرلطف مباحثوں سے محفل گرم رہتی تھی۔ بہت دنوں تک رسالہ کا دفتر ہمارے سکونتی مکان سے علٰحدہ کہیں قریب تھا۔ والد کا سارا وقت قریب قریب وہیں کٹتا تھا اور میں و میرے بھائی دن کا کافی وقت وہیں صرف کرتے تھے۔ آنے والوں میں نہ فقط مقامی و بیرون جات کے اردو کے ادیب و شاعر و نثر نگار ہوتے تھے بلکہ باہر سے آنے والے ہندی ادیب و شاعر بھی والد سے ملنے آتے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ والد کو قومی تحریک و سوشل ریفارم سے کافی دلچسپی تھی اس لیے مقامی پولٹیکل لیڈر بھی تبادلہ خیال یا رسمی طور پر آیا کرتے تھے۔ اس طرح اگر ایک طرف ایسی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں جہاں علم و ادب کے چرچے ہوتے تھے تو دوسری طرف بے غرض سچے وطن پرستوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ جہاں لوکمانیہ تلک کے ہوم رول و گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون و لبرل (Liberal) پارٹی کی پالیسی پر بحث مباحثے و تنقیدیں ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جو میں نے گھر بیٹھے دیکھا ویسا موقع کسی دوسرے کو کم نصیب ہوا ہوگا۔ آج بھی وہ منظر و وہ صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں۔ ان چند سطروں میں نہ فقط آپ کو ان سے روشناس کرانا ہے بلکہ ان کو خراجِ عقیدت بھی پیش کرنا ہے۔

پہلی ہستی جن سے میں روشناس ہوا سرور جہاں آبادی تھے۔ سرور کا زمانہ و اس کے ایڈیٹر سے دلی تعلق تھا۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ 'زمانہ' میں ہی شائع ہوا۔ یہ ہمارے سکونتی مکان میں مہینوں مقیم رہے۔ دبلے پتلے چھوٹا قد گندمی رنگ، بال کچھ گھونگھرالے، آنکھیں چمکیلی، مونچھیں گھنی پان کے شوقین اور شراب کے دلدادہ تھے جو بالآخر قاتل ثابت ہوئی اور وہ صرف سینتیس سال کی عمر میں جبکہ ان کا کلام اپنے انتہائی عروج تک بھی نہ پہنچ پایا تھا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پھر بھی اس قلیل عرصہ میں انھوں نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ کسی شاعر کے لیے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ ان کی آمد سخن بے پناہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے جو امنڈا چلا آرہا ہے ایک بحر بیکراں ہے کہ موجیں لے رہا ہے۔ ان کی اچھوتی تشبیہیں اور نئے استعارے سننے والے کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے وقت کے اردو نظم کے بادشاہ تھے۔ لطف یہ کہ ان کا کلام رنگارنگ کے موضوع سے لبریز تھا۔ انھوں نے قدرتی مناظر، انسانی جذبات، حب وطن اور کائنات کی چھوٹی بڑی تخلیق پر طبع آزمائی کی اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا۔ اگر زندگی اجازت دیتی تو وہ اردو نظم کو بڑی بلندی تک پہنچا دیتے لیکن افسوس کہ افق اردو پر یہ ستارہ پوری طور سے ابھر بھی نہ پایا تھا کہ ڈوب گیا۔ رنج کا مقام ہے کہ آج کی اردو جاننے والی پبلک ان کے کلام سے پوری طرح آشنا بھی نہیں ہے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ 'خمخانہ سرور' کے نام سے عرصہ دراز ہوا زمانہ پریس سے شائع ہوا تھا اور دوسرا انڈین پریس الہ آباد سے غالباً 'جام سرور' کے نام سے نکلا تھا لیکن اب دونوں نایاب ہیں۔ اس کے بعد کسی نے ان کے کلام کو یکجا کر کے شائع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

منشی نوبت رائے نظر لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور 'زمانہ' کے ادارہ میں مہینوں بلکہ برسوں کام کیا۔ کچھ دنوں اودھ اخبار لکھنؤ کے ایڈیٹر اور اور غالباً انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہونے والے اردو رسالہ 'ادیب' کی ادارت بھی کی۔ نظر صاحب نہایت متین و سنجیدہ طبیعت کے تھے۔ ان کے کلام میں صفائی، ستھراپن اور لکھنؤ کی زبان کا نکھار تھا۔ بذات خود بھی نہایت وضعدار تھے۔ گندمی رنگ، قد کچھ لمبا، چھریرا جسم۔ اچکن، پاجامہ اور ٹوپی پہنتے تھے۔ لباس ہمیشہ صاف ستھرا ہوتا تھا۔ افسوس کہ ان کے کلام کا زیادہ حصہ اب ناپید ہے۔

پریم چند جی کے بارے میں اتنا لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اس میں کسی معتد اضافہ کا امکان نہیں ہے۔ 'زمانہ' سے ان کو کافی لگاؤ تھا بلکہ ان کی تحریری زندگی کا آغاز غالباً 'زمانہ' سے ہی ہوا۔ پیشتر وہ نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے۔ 'زمانہ' میں کئی مضامین جن میں روٹھی رانی کا بھی طویل تاریخی افسانہ شامل ہے اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ بعد میں مصلحتاً ان کو یہ نام ترک کرنا پڑا۔ پریم چند کا نام والدہی کا تجویز کیا ہوا تھا جس کو انھوں نے پسند کر کے اختیار کر لیا۔ ابتداءً ان کی کہانیاں صرف 'زمانہ' میں شائع ہوتی تھیں لیکن حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے دوسرے رسالوں میں بھی لکھنا شروع کیا اور بالآخر ہندی کا آسرا لینا پڑا اور یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ اس سے ان کی شہرت بہت جلد سارے ملک میں پھیل گئی لیکن اس کے باوجود ان کو 'زمانہ' کا ہمیشہ خیال رہا اور اس کے ایڈیٹر کو وہ اپنا قریب ترین دوست اور بھائی سمجھتے رہے۔

پریم چند جی نہ صرف ہمارے مکان اکثر آتے تھے بلکہ ہفتوں و مہینوں ہمارے یہاں مقیم رہتے تھے۔ ہمارا گھر ان کے لیے خانہ بے تکلف تھا اور ہر چھوٹا بڑا ان سے بخوبی واقف تھا اور ان کو ماسٹر صاحب کے نام سے پکارتا تھا۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، چھوٹا قد، دبلا پتلا جسم، غضب کے ہنسوڑ اور بامذاق تھے۔ ہنستے تھے تو اس قدر دل کھول کر کہ مکان کے مردانہ حصے میں ہنستے تو ان کے قہقہہ کی آواز زنانہ حصہ تک جو کافی دور تھا جاتی تھی۔ بے تکلف اور ہر چھوٹے بڑے حتیٰ کہ بچوں میں گھل مل جاتے تھے اور ان کے کھیلوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ ایک بار گھر کے لڑکے لاٹری کا کھیل کھیل رہے تھے وہ بھی شریک ہو گئے اور ایک ٹکٹ اپنے نام سے اور اپنے ڈنڈے کے نام سے لیا۔ ہم لوگوں کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جبکہ پہلا انعام ان کے نام اور دوسرا ان کے ڈنڈے کے نام نکل آیا۔ اس پر جو انھوں نے ہنسنا شروع کیا تو کئی منٹ تک ہنستے ہی رہے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کرسی پر بیٹھتے تھے تو زیادہ تر ایک پیر دوسرے پر رکھ لیتے تھے اور اس کو ہلایا کرتے تھے۔

پریم چند جی اپنے وقت کے ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نویس تو تھے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت ایماندار اپنے اصولوں کے پکے اور خالص محب وطن تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران جب بھی وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے دورہ پر جاتے تھے تو ایک پیسہ بھی نذرانے کے نام سے لینے کے روادار نہیں تھے۔ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی تحریک میں انھوں نے سرکاری ملازمت ترک کر دی۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں آپ کا سب سے اچھا افسانہ کون ہے یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ غالباً میرا سوال ہی بے تکا تھا۔

افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ پیچش کے پرانے شکار تھے اور آخر کار اس موذی مرض نے مہلک صورت اختیار کر لی اور وہ ایک لمبی بیماری کے بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ ان میں اور میرے والد میں جو محبت، دوستی و برادرانہ تعلقات تھے وہ تمام عمر قائم رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کی نازک حالت کا تار آیا تھا اس کے دوسرے ہی دن والد کے ایک اہم خاندانی مقدمہ کی سنوائی کی تاریخ تھی لیکن اس کے باوجود والد فوراً دوسری گاڑی سے بنارس چل دیے اور اس عظیم افسانہ نویس، محب وطن اور ایک شریف انسان کے دنیا کو خیر آباد کہنے کے پہلے پہنچ گئے۔ "زمانہ" نے اپنا خراج عقیدت پریم چند نمبر شائع کر کے ادا کیا۔

گنیش شنکر ودیارتھی کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی ہستی پر کسی طرح کلام نہیں ہو سکتا۔ وہ آزادی کے سچے سپاہی اور انسانیت کے علم بردار تھے۔ ان کا مشہور روزنامہ اخبار

'پرتاپ' ہندی میں کانپور سے شائع ہوتا تھا اور کانگریس کی پالیسی اور ملک کی آزادی کی بےخوفی سے حمایت کرتا تھا جس کا خمیازہ کئی بار ان کو حکومت وقت کے ہاتھوں اٹھانا پڑا۔ گنیش جی اکثر ہمارے یہاں آتے تھے بلکہ جب بھی 'پرتاپ' حکومت کے عتاب کا شکار ہوتا تھا تو اس کے مدافعت کے لیے اکثر ہمارے گھر میں باہمی مشورہ ہوتے تھے۔ گنیش جی کی وضع قطع نہایت سادہ تھی۔ کھدر کی دھوتی اور اسی کا کرتا پہنتے تھے۔ افسوس کہ ۱۹۳۱ء کے مقامی فرقہ دارانہ فساد فرو کرنے کی کوشش میں یہ انمول رتن کھو گیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۲۵ / مارچ ۱۹۳۱ء کو وہ سہ پہر کے وقت .... ہمارے یہاں آئے اور بہت دیر تک فسادات پر اظہار غم کرتے رہے۔ اس وقت وہ بنگالی محال کا جہاں ہندو آبادی کی اکثریت تھی، دورہ کر کے آئے تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہندو بھی اتنے بے رحم ہو سکتے ہیں۔ شام کو قریب پانچ بجے وہ نئی سڑک جو مسلم محلہ تھا جانے پر تیار ہو گئے تاکہ کوشش کر کے فرقہ وارانہ فساد فرو کرا سکیں۔ والد نے ہر چند ان کو منع کیا لیکن وہ نہ مانے۔ آخر کار مجبوراً والد وہیں ان کو چوبے گولہ کی گلی ہو کر نئی سڑک کے ناکہ تک پہونچا آئے۔ اس وقت بھی والد نے ان کو آگے جانے سے منع کیا لیکن وہ نہ مانے۔ اس کے بعد وہ زندہ نہیں لوٹے۔ اس وقت ان کے ہمراہ فقط دو والنٹیر تھے۔

گنیش جی ان چند ہستیوں میں تھے جو خلوص و ایمانداری سے ہر ممکن قربانی کر کے دیش کی سیوا کرتے تھے اس پاداش میں وہ کئی مرتبہ جیل بھی گئے اگر وہ جیتے رہتے تو وہ لال بہادر شاستری کی طرح سچے اور ایماندار دیش بھکت ثابت ہوتے۔

کبھی کبھی آنے والوں میں مولانا حسرت تھے۔ اگر ان کو کوئی دیکھتا تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ یہ شخص جو اپنی ظاہری شکل صورت سے بے نیاز ہے، اقلیم غزل کا بادشاہ اور ایک سچا وطن پرست ہے۔ چہرہ پر چیچک کے داغ، ڈھیلی دہری کا پاجامہ صاف کم میلا زیادہ، معمولی سی اچکن زیب تن جس کے بٹن اکثر کھلے ہوئے۔ وہ ملک کی آزادی کے خواہاں اور لوکمانیہ تلک کے پولیٹکل اصولوں سے قریب تھے۔ اسی وجہ سے گاندھی جی کے زیر اثر کانگریس سے ان کی پٹری نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ وطن کے خاطر اس وقت جیل گئے تھے جبکہ جیل میں اے۔ بی کلاس کا امتیاز نہ تھا اور پولیٹکل قیدیوں سے معمولی قیدیوں کی نسبت زیادہ سختی برتی جاتی تھی۔ ان کا یہ شعر واقعات کی سچی تصویر تھی

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
یک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کو کرشن جی سے عقیدت تھی اور وہ ہر سال ایک نظم ان کی نذر کرتے تھے ان کا

ایک شعر ہے

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پر لطف وکرم ہے خاص

جگر مرادآبادی صاحب جب کبھی بھی کانپور آتے تھے تو ہمارے یہاں بغیر آئے واپس نہیں جاتے تھے بلکہ اگر ان کا قیام کانپور میں زیادہ عرصہ تک ہوتا تو کئی بار آتے تھے اور دیر تک رہتے تھے۔ جگر اور جوش کے کلام کو خود ان کی زبان سے سننے والا اس کی لذت کو نہیں بھول سکتا۔ دونوں کے پڑھنے کا انداز اتنا دل نشین تھا کہ سننے والے کا جی نہیں بھرتا تھا اور ان کے اشعار کی خوبیوں کو اور بھی نکھار دیتا تھا تاہم دونوں کا انداز جداگانہ تھا۔ جگر کے ترنم میں درد کی کسک تھی۔ جوش کے پڑھنے میں ترنم تو ہوتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک شکوہ بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بحر بیکراں ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے۔

جگر پہلے رندلاابالی تھے۔ داڑھی اور سر کے بال پریشان، آنکھیں مست تھیں ان سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ لباس کی طرف سے بے اعتنائی اگر اچکن کے بٹن کھلے ہیں تو پروا نہیں اگر اچکن کچھ کم صاف ہے تو بلا سے۔ بعد کو وہ زاہد پارسا ہو گئے اور طور طریقوں میں متانت اور سنجیدگی آ گئی لیکن صاف باطن وہ پہلے بھی تھے اور آخر تک رہے۔ جوش کا یہ مصرع غالباً ان ہی کے ایسے انسانوں کے لیے کہا گیا ہے ع بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں۔

جہاں کہیں اردو شاعری کی محفل سجے گی آپ جگر کو صف اول میں پائیں گے۔

میں ان خوش نصیب لوگوں میں ہوں جن کو جوش کے قریب گھنٹوں بیٹھنے اور ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا موقع ملا ہے اور میں ان چند گھنٹوں کو اپنی زندگی کی بیش قیمت گھڑیوں میں شمار کرتا ہوں۔

جوش کو قدرت نے جیسی صورت دی ہے ویسی ہی سیرت عطا کی ہے۔ وہ ایک خالص اور باوضع انسان ہیں۔ حافظہ ان کا بلا کا ہے۔ ایک ہی نشست میں وہ اپنی طویل نظمیں گھنٹوں سناتے چلے جاتے ہیں۔ پیتے وہ ضرور ہیں لیکن اس کا اثر ان کے طرز عمل یا گفتگو پر نہیں ہوتا ہے۔ والد تو جوش کو شاعر انقلاب کہتے تھے اور دونوں کے تعلقات برادرانہ تھے۔

ہندی شاعروں وادیبوں میں جو ہمارے یہاں آتے تھے ان میں پنڈت سری نرائن چترویدی، میتھلی شرن گپت اور پنڈت بنارسی لال چترویدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ پنڈت سری نرائن چترویدی، میتھلی شرن جی گپت جب آتے تھے تو دیر تک اپنی کویتائیں سناتے تھے اور یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ شاعری میں زبان کی کوئی قید نہیں ہے اور ہر زبان کا شاعر اپنے جذبات واحساسات کے اظہار میں دوسری زبان کے شاعروں سے قریب ہے۔

جگہ کی کوتاہی اس کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ میں اس تذکرہ کو طول دوں ورنہ آنے والے اصحاب میں روش صدیقی، ساغر نظامی، جگت موہن لال رواں، مرزا جعفر علی اثر، منور، سحر ہنگامی، سعفت پرشا و مدہوش، جگر بریلوی، ڈاکٹر ایم حفیظ، سلیم جعفر کا ذکر باقی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بیکنٹھ سو دیہ پرتاپ کے بارے میں کچھ لکھنا ضروری ہے۔ ان کے متعدد مضامین حق پرست کے نام سے 'زمانہ' میں شائع ہوئے۔ وہ جو صحیح و درست سمجھتے تھے اس کو بے خوفی سے سپردِ قلم کرنے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔ ان کے لکھے ہوئے مباحثے پڑھ کر اگر کوئی یہ رائے قائم کرے کہ وہ کٹر اور تنگ خیال تھے تو وہ غلطی پر ہوگا۔ ان کے سینے میں محبت بھرا دل تھا اور وہ اچھے دوست و نیک انسان تھے البتہ جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کو کہنے میں ان کو دریغ نہیں تھا۔

اب مناسب ہے کہ میں اس بزرگ ہستی کے بارے میں کچھ کہوں جس کی کشش لوگوں کو یہاں کھینچ لاتی تھی اور جس شمع کے گرد اردو کے ادیب و عالم جمع ہوتے تھے اور خود محظوظ ہوتے تھے اور ان کو بھی محظوظ کرتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے کانپور کے ایک معزز کایستھ گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے دادا منشی شیو سہائے اور ان کے چھوٹے بھائی منشی گور سہائے کانپور کے سربرآوردہ وکیلوں میں تھے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری اسکول میں پائی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانہ میں اس کالج کا شمار صوبہ کے چوٹی کے کالجوں میں ہوتا تھا۔ اس کے اسٹاف میں متعدد انگریز پروفیسر تھے اور تعلیم کا معیار بہت بلند تھا اور پڑھنے اور پڑھانے والوں کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد گھر والوں کی توقع تھی کہ وکالت کا پیشہ اختیار کریں گے لیکن یہاں دوسری ہی لگن لگی تھی اور ۱۹۰۳ء ہی میں انھوں نے 'زمانہ' کی ادارت قبول کر لی اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ زمانہ کے ہو گئے اور زمانہ ان کا ہو گیا اور یہ تعلق نومبر ۱۹۴۲ء میں ان کے سفرِ آخرت اختیار کرنے پر ہی ختم ہوا۔ ایک اردو ادبی رسالہ کا انتالیس سال تک زندہ رہنا ایک معجزہ تھا جو فقط ان کی ان تھک کوششوں و قربانیوں سے ظہور میں آیا۔ اس طویل عرصہ میں جن مالی مشکلات و پریشانیوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑا اس کا اندازہ کسی دوسرے کے لیے لگانا مشکل ہے لیکن جس آئیڈیل کو لے کر وہ چلے تھے اس کو انھوں نے زندگی بھر نبھا دیا اور رسالہ کے معیار کو کبھی نہیں گرنے دیا اور نہ اس کی پالیسی میں کوئی فرق آیا۔

ان کی گھریلو زندگی نہایت سادہ تھی۔ گوشت و شراب سے پرہیز تھا لیکن تنگ دلی سے کام نہیں لیتے تھے۔ دوسروں کے گوشت کھانے اور اعتدال سے پینے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے زندگی بھر ایک وضع کی پوشاک پہنی۔ گھر میں دھوتی کرتا قمیص یا پاجامہ و باہر چوڑی دار پاجامہ

اچکن و گول ٹوپی۔ مذہبی تعصب چھو بھی نہیں گیا تھا۔ ان کے قریب تر لوگوں میں ہر مذہب کے لوگ تھے ۱۹۲۷ء و ۱۹۳۱ء میں کانپور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ جس محلہ میں ہمارا گھر تھا وہاں ملی جلی آبادی تھی لیکن نقطان کی ذات سے ہمارے محلہ میں امن وامان رہا بلکہ راستے باہر سے آنے والوں کے لیے بھی محفوظ رہے۔

جسمانی صفائی کے سختی سے پابند تھے۔ بلحاظ موسم دن میں دو بار غسل کرتے تھے۔ پان کا شوق تھا خود کھاتے تھے اور آنے والوں کو کھلاتے تھے۔ اگر کھانے یا ناشتہ کے وقت کوئی ملنے والا آگیا تو اس کو باصرار کھانا یا ناشتہ میں شریک کرتے۔

دن کا معمول یہ تھا کہ صبح چھ، سات بجے اٹھتے اور ناشتہ کے بعد کام میں مصروف ہو جاتے انگریزی و اردو اخبارات کا مطالعہ کرتے، انگریزی کے روزنامہ کے علاوہ انگریزی کا ہفتہ وار سوشل ریفارمر اور سرونٹ آف انڈیا کے انگریزی ہفتہ وار و گاندھی جی کے ینگ انڈیا پڑھتے تھے انگریزی کے ماڈرن ریویو و انڈین ریویو بلاناغہ پڑھتے۔ انگریزی کے مشہور مقالے، ڈرامے و ناول بھی نظر سے گزرتے تھے۔ کتابوں کا شوق تھا اور ان کے کتب خانہ میں اردو و انگریزی کتابوں کا اچھا خاصہ مجموعہ رہتا تھا۔

ناشتہ کے تھوڑی دیر بعد رسالہ کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ آنے والے مضامین غور سے دیکھتے ان میں ضروری اصلاح و کانٹ چھانٹ کرتے اور بعض میں صفحہ کے صفحہ لکھ کر پیوند لگاتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ زیادہ تر ان سے بات بھی کرتے جاتے تھے اپنا کام بھی کرتے جاتے تھے۔ اگر مضمون اشاعت کے بالکل ناقابل ہوا تو اس کو رد کر دیتے۔ نامہ نگار اصحاب سے برابر خط و کتابت جاری رہتی اور ان کو لکھنے پر آمادہ کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی کوششوں سے اردو نثر و نظم لکھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

گفتگو کا انداز بہت دلکش تھا۔ دوہی چار منٹ میں سننے والا خواہ وہ عمر میں بڑا ہو یا چھوٹا تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ ان سے بے تکلف ہو جاتا تھا۔ پہلو میں دردمند دل تھا اور اگر ممکن ہوتا تو دوسروں کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتے لیکن اصول کے پکے تھے اور اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

سوشل ریفارم و سدھار کے اوائل عمر سے حامی تھے۔ ازدواج بیوگان کے طرفدار تھے جہیز کے خلاف انھوں نے ۱۹۱۴ء میں آواز اٹھائی تھی اور کایستھوں میں سدھار کے لیے زوردار قدم اٹھائے تھے آج کل یہ بات اتنی اہم نہیں معلوم ہوتی ہے لیکن اب سے ساٹھ پینسٹھ سال

پہلے کا نقشہ ہی اور تھا۔

رسالہ کی ادارت کے فرائض یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ خود زیادہ لکھتے پھر بھی جو مضامین انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں ان کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو صفحات سے زائد ہے۔ ان میں 'زمانہ' کا وہ حصہ شامل نہیں ہے جس کو وہ تقریباً ہر ماہ رفتارِ زمانہ کے نام سے لکھتے تھے۔ اس میں ملک و بیرونجات کے واقعات پر ایک بے لاگ تبصرہ ہوتا تھا۔ ان سب کے علاوہ مشہور کتابوں پر تنقیدیں و علمی خبریں بھی 'زمانہ' میں شائع ہوتی تھیں۔ مشہور اہلِ قلم کی تصنیفوں و شعرا کے کلام کی جو تنقیدیں 'زمانہ' میں شائع ہوئی ہیں وہ ایک غیر جانب دار نقاد کے لیے مشعلِ راہ ہو سکتی ہیں۔

عزم و استقلال مزاج میں تھا باوجود مالی مشکلات کے انھوں نے اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کے بچے ہمیشہ صاف و ستھرے رہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات کھلے دل سے تا حدِ امکان کرتے تھے اور ان کے لیے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا وہ ایک شفیق باپ تھے لیکن اصولوں کے سختی سے پابند تھے۔

ملک کی آزادی کی بڑی آرزو تھی۔ اپنے سفرِ آخرت کے چند دن پہلے بولے کہ دیش کی آزادی کی خواہش باقی رہ گئی لیکن اگر وہ جیتے رہے تو ان کو تقسیمِ ملک سے بڑا صدمہ پہونچتا ان کا خیال تھا کہ مذہب ہر شخص کا اپنا نجی معاملہ ہے اور ہندو و مسلمانوں و نیز دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں یک جہتی کے کافی سامان موجود ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قدم سے قدم ملا کر ترقی کی طرف چل سکتے ہیں۔

اردو سے ان کو جو لگاؤ تھا وہ ظاہر ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہندی کے مخالف نہیں تھے ان کی رائے میں شمالی ہندوستان میں دونوں ہی زبانوں کی گنجائش تھی البتہ عام فہم الفاظ کا استعمال پسند کرتے تھے۔

صوبہ میں ہندوستانی اکاڈمی کا قیام ان کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھی اور یہ پودا ان ہی کی آبیاری سے سرسبز ہوا تھا۔

مزاج میں نفاست پسندی اور سلیقہ (orderliness) بدرجہ اتم تھا۔ رسالہ کا دفتر بہت صاف ستھرا رہتا تھا۔ آمدنی و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ ضروری کاغذات و مراسلات حتیٰ کہ باہر سے آنے والے خطوط کی سلسلہ وار باقاعدہ فائل رکھتے تھے۔ ان خطوط میں پریم چند جی کے بھی وہ خطوط تھے جن کو امرت رائے جی نے چٹھی پتری جلد ایک میں شائع کیا ہے۔ جس باقاعدگی سے یہ خطوط و نیز دیگر خطوط رکھے جاتے تھے اس سے ان کا حسنِ مذاق و سلیقہ ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر خطوں کا جواب دینے کے بعد لوگ ان کو ردی کی ٹوکری کے حوالہ کر دیتے ہیں

۲ر نومبر ۱۹۴۳ء کو ایک طویل بیماری کے بعد علم و ادب کا یہ چراغ بجھ گیا اور حقیقی معنوں

میں ایک انسان دنیا سے رخصت ہوگیا۔

کہتے ہیں کہ جب تک کسی کے جاننے والے اس کی یاد کرنے والے دنیا میں موجود رہتے ہیں وہ شخص دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کی یادوں میں باقی رہتا ہے۔

گرم اشکوں میں نہاں ہے کوئی — سرد آہوں میں نہاں ہے کوئی
میں نے گھبرا کے جو اک روز جگر — دی یہ آواز کہاں ہے کوئی
درد چیخا کہ مجھی میں ہے وہ شوخ — غم پکارا کہ یہاں ہے کوئی

چنانچہ اب بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں لیکن اب ان کو رخصت ہوئے قریب چالیس سال ہو گئے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے جاننے والوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ ان کا نام فقط اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک

❖ ❖ ❖